نوائے وفا



ایک الہ آبادی شاہزادی کے لئے

اُس کے غریب الدیار رفیق کی یادگار



ما نہ مانیم و بہ گیتی سخن از ما ماند



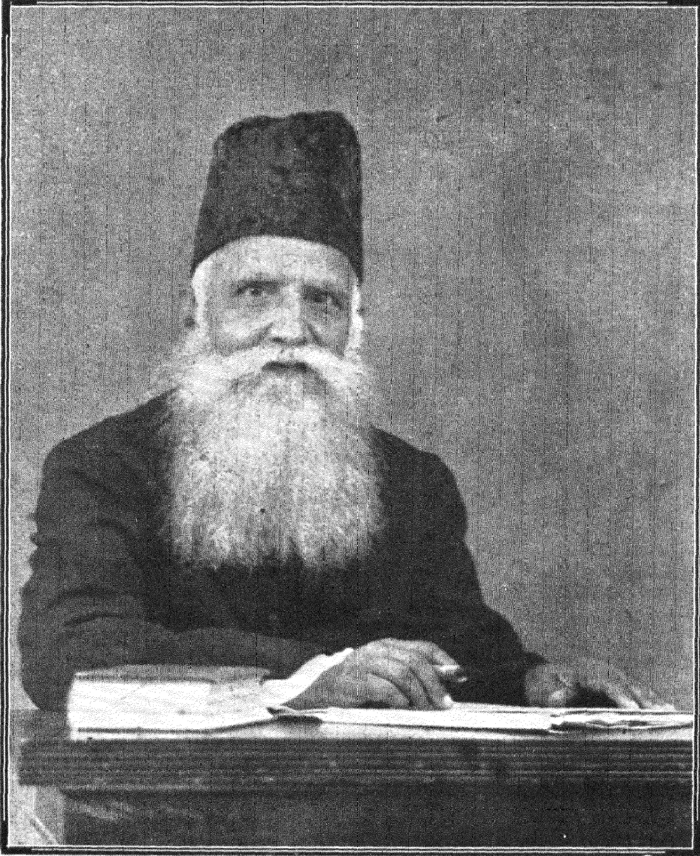
مقبول

جمعہ۔ ۱۵ جمادی الاخریٰ سنہ ۱۳۵۷ھ

فہرستِ اوّل

مضامین و مطالب۔ مقالات۔ نقشہ جات

(۱)



مقبول احمد

بڑے ہیں ہم۔ مگر ایسے بڑے بھي کم ہوں گے
کسي زمانہ کے اچھے ہمیں کریں گے یاد

الہ آباد

ہمنے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

یاد باد الہ آباد، پاینده باد الہ آباد۔

انجام بہ خیر، مقبولِ نامہ سیاہ نے سب سے پہلے ۱۸۸۶ء میں پریاگ کی مقدس سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ میں ایک نو عمر طالب علم تھا، اور وہی ضرورت یا امتحان میں کامیابی کی سعی و آرزو شرقِ ادنیٰ سے مجھے کشاں کشاں لائی تھی۔ کامیابی و ناکامی تو ایک غیر اختیاری بات تھی، جس کی خوشی یا رنج اپنے اپنے وقت پر منحصر ہے۔ مگر میں اپنی ناکامی ہی کا احسان مند ہوں، جس کی بدولت مجھے ایک سال اور پڑھنے اور رفقائے قدیم و جدید کے ساتھ چندے اور بسر کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اور آج بھی

چو ہم عمرے بہ ہم عمرے زمکتب شاد می آید　　مرا بے اختیار ایامِ طفلی یاد می آید

بتیس برس بعد، الہ آباد کا آب و خور اس بے نوا کو پھر یہاں کھینچ لایا۔ یہ مارچ ۱۹۱۸ء کا تیسرا ہفتہ تھا۔ موسم معتدل۔ بہار کی آمد۔ اسی ۱۸۵۷ء کے بنے ہوئے، بلند و وسیع اسٹیشن نے اپنے نئے آنے والے مہمان کے لئے دامنِ کرم پھیلایا۔ مرتفع سنگین پلیٹ فارم نے قدم چومے۔ اور بالآخر اس کو اس کی منزلِ مقصود یا مستقر ہنگامی تک پہنچا دیا۔ یاد ہے کہ دو تین دن بعد،

اجنبیت و تنہائی اور اپنے توحش سے متاثر ہو کر میں نے جب ایک درد مند دوست کو اپنی حالت کی اطلاع دی تھی، تو بہ تصرف مصرعِ اوّل اقبال کا یہ شعر لکھا تھا۔

کوئی مقبول کو پوچھے تو یہ کہنا ناطق[1] ۔۔۔ نو گرفتار پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

آباد باد الٰہ آباد۔ شاد باد الٰہ آباد۔

تو نے اُسی نو وارد اجنبی کی مُواسا و مُدارا کی۔ بیگانہ کو یگانہ بنا لیا۔ وُہ، جو کبھی مسافرانہ وارد ہوا تھا آج تیرا مہمان ہے اور عزیز۔ سولہ سترہ برس گذر جانے کی وجہ سے نہیں، بلکہ محض تیری عنایت و الفت کے اقتضا سے۔ وہ تیری آغوشِ شفقت کو اپنا موطنِ ثانی سمجھتا ہے۔

انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ جب رُخصت و جدائی کی گھڑی قریب آتی ہے تو جذباتِ انس و اُلفت اور بھی بھڑک اُٹھتے ہیں۔ زبان تفسیدہ ہو جاتی ہے اور آنکھیں نمدیدہ۔ کہنے والا جو کچھ کہنا چاہتا ہے، پورا نہیں کہہ سکتا۔ اور جو کچھ کہہ جاتا ہے، سرگرمِ وَداع سننے والا اُتنا بھی سننا اور سمجھنا گوارا نہیں کرتا۔

الٰہ آباد کے ایک قرنِ مسرت کے قیام میں میں نے بہت کچھ دیکھا بلکہ سب کچھ دیکھا تھا۔ بھول جانے کی باتیں تھیں، طاقِ نسیاں پر رکھ دیں۔ حافظہ مدد کرے گا اور یاد آ جائیں گی، تو کبھی حوالہ قلم کر دوں گا، ورنہ، اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

اعتراف ہے کہ الٰہ آباد کی خاکِ پاک اس ازلی کوتاہ بیں کے لئے سرمۂ چشمِ بصیرت و عبرت ثابت ہوئی۔ دائروں کا مقدس دامن سجّادۂ عزت و امتیاز بنا۔ جزائے احسان ہو گی اگر الٰہ آباد کے (غیر فانی نہ سہی، لیکن) دیرپا صنادید کی کیفیت قلمبند کر جاؤں۔ عزیزانِ محترم مقبول نامقبول کا سلام لیں اور اپنے عقیدت کیش و فا کوش کی محقر نذر یا مختصر تاریخِ شہر قبول فرمائیں۔ مل لیجئے پھر ہم سے ملاقات نہ ہو گی۔

---

[1] منشی محمد عبد الغفار خانِ مرحوم، ناطق تخلص، رئیس قائم گنج۔

انگلستان کا فاضل زباندانِ مشرق، ڈبلیو رائٹ: William Wright ایک کمیاب کتاب[1] کی تصحیح وتحشیہ کے بعد، جب ہولانڈ[2] اور جرمنی سے رُخصت ہوا ہے، تو رمز شناسِ فطرت عرب کا ایک شعر اُس کی زبان پر تھا۔ تاریخ الٰہ آباد لکھنے کے بعد آج میں بھی خلوص وُوداد کی اُس پرستش گاہ سے جُدا ہو رہا ہوں، جہاں عشق ومحبت کے دو دریا گلے ملتے ہیں۔ نہیں، جہاں مہروو فا کے دو دریا زور سے ٹکر کھاتے اور چپہ چپہ زمین کو سیراب رکھتے ہیں۔ جہاں تازہ جان ڈالنے والی سعادت وبرکت کی ہوائیں چلتی ہیں فیض وعدالت کے بادل برستے ہیں۔ علم وادب کے چشمے اُبلتے ہیں۔ اس خدمت کے سرانجام ہونے سے میرا دامانِ خاطر مسرت واطمینان کی دولت سے مالامال ہے، اور میرا دل تشکر وامتنان کے جذبات سے لبریز۔ اس کے ساتھ ہی فراق وجدائی کے صدمے سے بے چین ہے۔ اور آج میری زبان پر بھی وُہی شعر ہے، جو ایک علمی خدمت کے انجام دینے کے بعد زندہ جاوید رائٹ نے چلتے وقت پڑھا تھا۔

أرض يطيب فوادي من قرارتها   شوقالها ولمن فيها من الناس

[وہ سرزمین، جس کے شوق میں، اور جس کے رہنے والوں کے لئے میرا مُرغِ دل اپنی آرام گاہ (نشیمن) سے پرواز کے لئے طیار ہے۔]

خسرو باغ۔ اس مبارک زنجیر کی پہلی کڑی ہے۔ آپ بَیَانِ **خسرو باغ** کہہ سکتے ہیں کہ اس تاریخ کی ابتدا کی تاریخ (۱۹۳۲ء) اسی نام سے نکلتی ہے۔ شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم۔

اوقات فرصت میں میں نے یہ مضامین متفرق طور پر لکھے، اور قلمرو ہند کے دو ممتاز وموقر رسالوں، معارف اور ہندستانی میں شائع کئے تھے۔ اب ان پر پھر نگاہ ڈالی اور کتابی شکل میں مرتب کر دیا ہے۔ نظر مکرر میں بقدر مناسب اضافہ ہو جانا لابد تھا۔ ہُوا۔

---

[1] رحلۃ ابن جبیر۔

[2] ہمارے یہاں ہالینڈ بولا جاتا ہے۔ یورپ کے بعض ممالک میں بھی۔ مگر اہلِ زبان واہلِ علم ہولانڈ بولتے اور لکھتے ہیں۔

ان[1] ناچیز صفحات میں اس گلزارِ ہمیشہ بہار، شاہ بیگم اور اُس کے مدفن، شاہزادۂ خسرو اور اُس کے مقبرے، سلطان بہار بانو کے روضے اور تمبولن بیگم کے گنبد کے گزشتہ و موجودہ حالات یکجا ملیں گے۔ جن کی فراہمی، تلاش و تحقیق میں سعی و کاوش سے کام لیا گیا، اور حتی الوسع کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا ہے۔ تاخیرِ اشاعت و تکمیل مجبورانہ تھی۔

اُکمِلُ کُلَّ سَطرٍ بعدَ شَہرٍ ۔ وَاَبنِی کُلَّ بَیتٍ بعدَ عامٍ

طوالت و تفصیل کے لئے بھی عذر خواہی کی ضرورت نہیں۔ مسٹر ای اے ڈنکن نے کین صاحب کی آگرہ ہینڈ بک[2] کے "پیش کلمہ" میں ایک امریکن سیاح کا ذکر فرمایا ہے۔ جس نے آگرہ اور دہلی کی جی بھر کر سیر کر لی تھی۔ پھر بھی اُس کو شکایت تھی کہ کوئی پسندیدہ گائیڈ بک نہیں ملتی۔ اُس نے اپنا خیال ظاہر کیا تھا کہ اس کی تو مجھے چنداں پروا نہ ہوگی کہ جو کچھ لکھا ہو میں سب ہی پڑھ جاؤں، لیکن اگر پڑھوں تو ضرور ہے کہ اُس میں سب کچھ پاؤں۔" مجھے ندامت ہے اور افسوس کہ میں اس زیرک سیاح کی آرزو اور اپنے ارادہ کو پورا نہ کرسکا۔ بہت سے حالات و واقعات و خیالات تھے جو حوالۂ قلم ہونے سے رہ گئے۔ ہر ہر قدم پر دلِ نافہم اور دامانِ تنگ یہی سبق دیتے تھے کہ

قلم بشکن، سیاہی ریز، کاغذ سوز و دم درکش ۔ حسن ایں قصۂ عشق است در دفتر نمی گنجد

---

[1] دونوں کے یکجا ہو جانے سے تنافر کا پہلو نمایاں تھا، اس لئے مجھے اس کی ترتیب لفظی کو صحیح اور اس ترکیب کو مانوس و پسندیدہ ماننے میں تامل تھا۔ دربار فصاحت اور علم معانی کا یہی آئین ہے۔ لیکن قرآن مجید میں جو فصیح ترین کتب آسمانی ہے اَلمَلِکُ القُدُّوسُ السَّلامُ (آیت ۲۳۔ سورۂ حشر پارہ ۲۸) دیکھ کر اطمینان ہو گیا۔ جہاں ایک جنس کے تین حرف (سین) جمع ہیں۔ اب ثقل و بے لطفی کا اعتراض یا قانونِ خوشگوئی کی خلاف ورزی کا الزام کون لگا سکتا ہے۔

[2] Keene's Hand-book for Visitors to Agra - By E. A. Duncan, C. E., F. G. S. - 1909 - Calcutta.

پریاگ کی تحسین وتکریم اور سنگم کی حرمت وعظمت کے اعتراف پر مجبور ہوں۔ میرے دیندار بزرگ اور خانہ نشین طالب مجھے معذور رکھیں۔ سنگم کیسے دلپذیر و دلکش مقام کی دل آویزیوں اور دلنوازیوں کو تو اہل دل سے پوچھنا چاہئے۔ چھیڑتا ہے کوئی رہ رہ کے رگِ جاں اب تک انسانی آبادی سے دور، نور اور پرتوِ نور سے معمور جگہ۔ ہو اور اللہ ہو کا عالم۔ جہاں نہ اذان کی آواز پہنچتی ہے نہ نغمۂ دیر کی صدا۔ کیف آور وجذبات آفریں فضا۔ انسان فریب وجد افزا راتیں۔ ذوق وشوق کی گھاتیں۔ سوز وگداز، درد ونیاز کی سوغاتیں۔ حضرت عشق کی مدارتیں، ریاضت وعبادت کی گھڑیاں، دل کی چوٹیں، آنسوؤں کی لڑیاں۔ تسبیح وتہلیل کے ازلی ترانے۔ تقدیس وتمجید کے سرمدی نعرے۔ روح کی تڑپ، بیقراری۔ دل کی بے چین تمنائیں۔ جلوۂ دیدار کے لئے بے تابیاں۔ مشاہدۂ جمالِ لاہوتی کی آرزوئیں۔ اور ان سب کا ذہنی برق افگن "ایک" جواب جادۂ عرفان وایقان کے ایک باخبر رہ نورد نے اسی کیف و بے خودی کی منزل پر پہنچ کر حقیقت سے پردہ اٹھا دیا ہے۔

محو کھڑا ہوا ہوں مَیں حُسن کی بارگاہ میں[ل] اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں

یہ کاوشیں اور کاہشیں نہیں، نعمتیں ہیں اور برکتیں۔ جن کی اہمیت کا اندازہ کچھ بصیرت والے ہی کر سکتے ہیں۔ مبادا کہ ان بے معنی کلموں اور بے جوڑ فقروں سے کسی دانشمند کو یہ گمان پیدا ہو کہ میں اوروں کو بھی متأثر کرنا چاہتا اور اپنا سا خوش عقیدت بنا رہا ہوں۔ نہیں، حاشا کہ نہیں۔ جانتا ہوں کہ فلاسفۂ فرنگ بھی ان کو نہیں مانتے اور فرماتے ہیں کہ "اس قسم کا تخیل عدم کمال پر دلالت کرتا ہے" اور یہ کہ "ناقابل فہم باتوں میں ایک طرح کا تقدس خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔" ہمارے مجتہدین اور فقہائے کرام کا بھی منشور عمل اور ارشاد یہی ہے کہ کیف وکشف کی باتیں حجت قاطع اور قابل تقلید نہیں ہوتیں۔

اس لئے اہلِ علم وفضل کے اطمینان خاطر اور اپنے فہم وادراک کی تقویت کے واسطے سورۂ رحمٰن (پارہ ۲۷) کی انتیسویں آیت کا پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ جس میں قادرِ مطلق تبارک وتعالیٰ نے ہم ناچیز بندوں کے لئے اپنے انعام اور کارآمد چیزوں اور ان پر اپنی قدرت وحکومت کا بیان فرمایا ہے۔

ل سرودِ زندگی۔ از حضرتِ اصغر مرحوم صفحہ ۲۶۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ۙ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ ۚ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ؀

[ترجمہ] اسی نے (اس طرح کے) دو دریا نکالے کہ آپس میں ملتے ہیں (اور پھر بھی) دونوں میں ایک پردہ (رہتا) ہے کہ (اس سے ایک دوسرے کی طرف) بڑھ نہیں سکتے۔ تو اے جنّو اور آدمیو! تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرو گے۔

دُور رس و اسرار جو مفسرین نے دو دریاؤں سے مرادیں مختلف لی ہیں اور ہر ایک کو اپنی اپنی تعبیرات و تحقیقات کے ساتھ چسپاں اور برمحل ثابت کرنا چاہا ہے۔

متقدمین کو لیجئے۔ علامہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری[1] محدث و مورخ، جن کی تفسیر جامع البیان نہایت مستند مانی گئی ہے اور جس کو انھوں نے سو جلدوں میں پورا کیا تھا، ائمہ فن کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ دو میں سے ایک دریا تو زمین پر ہے، دوسرا آسمان پر، اور سال بھر میں ایک بار یہ دونوں مل جایا کرتے ہیں۔ ابن جریر خود بھی اسی رائے کو پسند کرتے اور ترجیح دیتے ہیں۔ (جلد ۲۷۔ صفحہ ۶۸)۔ علمائے کرام کے ایک دوسرے طبقہ کا ارشاد ہے کہ ان دو دریاؤں سے مراد بحر فارس اور بحر روم ہیں۔ اس کی تائید بھی متعدد جلیل المرتبت حضرات نے فرمائی ہے۔

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی[2] جو مشہور متکلم اور صاحب تصانیف کثیرہ ہیں، یہ مانتے ہیں کہ ایک دریا تو آب شیریں کا ہے دوسرا شور کا۔ پھر بعض وجوہ سے اس سے اعراض بھی فرماتے ہیں۔ (تفسیر کبیر، موسوم بہ مفاتیح الغیب۔ جلد ۱۸۔ صفحات ۱۴ و ۱۵)۔

ان سب کے پیشرو امام عبد الملک ابو خالد ابن جریج[3] مکی جو تابعین، محدثین و معدلین و فقہائے اعلام سے ہیں اور جنھوں نے اسلام میں سب سے پہلے کتابیں لکھی تھیں[4] اور ان کے ہم خیال و متبعین اس لفظ کی تعمیم کے قائل ہیں۔ وہ تعریفات بالا کے ساتھ ساتھ دو دریا اور بتاتے ہیں۔ ایک ملکیت کا، جو میٹھا ہے۔ دوسرا بہیمیت کا، جو کھاری ہے۔

---

[1] ولادت ۲۲۴ھ = ۸۳۹ء۔ وفات ۳۱۰ھ = ۹۲۲ء۔ مدفن بغداد۔ [2] ہرات میں ۶۰۶ھ (۱۲۰۹ء) میں وفات پائی۔ [3] ولادت ۸۰ھ = ۶۹۹ء۔ وفات ۱۴۹ یا ۱۵۰ھ = ۷۶۷ء۔ بعض ۵۵ بتاتے ہیں۔ [4] تاریخ اسلام، جلد پنجم، موسوم بہ مشاہیر اسلام، صفحہ ۸۔ و۔ کشف الظنون از حاجی خلیفہ، جلد اول، صفحہ ۸۰، حوالہ خطیب بغدادی۔ و۔ اکمال فی اسماء الرجال، صفحہ ۶، بہ روایت ابن قتیبہ۔

یہ اقوال جو نقل کئے گئے ہیں ذہانت و ذکاوت کے کارنامے تھے یا الہامات ربّانی کا پرتو۔ یہ بھی محتمل ہے کہ روم و ایران کے ساتھ اُس زمانہ کے تعلقات، ہمسائگی اور مصلحت شناسیوں کا مقتضٰے رہے ہوں۔ ورنہ اس وقت یہ سب تعبیریں یا تاویلیں جیسی دل نشین و سہل الفہم ہو سکتی ہیں ظاہر ہے۔ عجائب پسندی و نازک خیالی میں ہم کیوں پڑیں۔ جس کی تحدید و تعیین خالق کائنات و سرورِ موجودات نے نہ فرمائی ہو، اُس پر بحث و رائے زنی اور اپنے ناقص علم و عقل سے ہنگامہ آرائی ہم کو مناسب نہیں۔ مسلّم ہے کہ ہمارے بزرگ و برگزیدہ پیشواؤں کی نظر اپنے ہی وقت تک کی تاریخ و جغرافیہ پر تھی۔ امتدادِ زمانہ و مرورِ دُہور کے ساتھ خدائے برتر و دانا کی موہبت و کرم سے تمامی علوم خصوصًا ان دونوں نے خاصی ترقی کی ہے۔ عصرِ حاضر کے ہم قرآن پڑھنے والوں کو بھی موجودہ جغرافئے اور اطلس پر نگاہ رکھنا لازم ہے۔ ورنہ (عبور نہ ہونے سے) قرآن حکیم کے تفکر و تدبّر میں بہت سے اختلافات و مشکلات کا سامنا پڑ جائے گا۔

آلاء کے معنی عمومًا 'نعمت' کے لئے جاتے ہیں لیکن علامہ ابن جریر نے بعض سلف سے 'قدرت' کے معنی بھی نقل فرمائے ہیں۔ اس لئے جس مقام پر جو معنے زیادہ چسپاں ہوتے ہوں وُہی اختیار کئے جانا چاہیئے۔ یہ صحیح ہے کہ ہم کیا اور ہماری استعداد و علمی قابلیت کیا۔ کسی نو آموز طالب علم کو 'عجب العجاب' یا 'جلالین' کا سبق دے کر بہلا لینا یا بہکا دینا ہمارا بڑے سے بڑا کارنامہ ہے۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ عربستان و حجاز سے دُور بلاد ہند کے ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے کتب بینی یا چند رسائل و صحائف کی ورق گردانی ہم کو علم و حکمت اور وقوف و خُبرت کی دُنیا میں کس مرتبہ پر پہنچا سکتی ہے۔ پھر بھی کون سی آنکھ اس کو نہیں دیکھتی کہ پریاگ (الٰہ آباد) کے نیچے دو پوترِ دریا گنگا اور جمنا رواں ہیں۔ دونوں ایک ملتقٰے (سنگم) پر ملتے ہیں۔ مل جاتے ہیں اور پھر بھی الگ تھلگ رہتے ہیں۔ ایک برزخ [فصل یا آڑ] حائل رہتا ہے۔ انتہائے اختلاط و اتصال پر بھی ایک دوسرے سے امتیاز و افتراق کی شان آشکار رہتی ہے۔ کسی ایک کو دوسرے پر زیادتی کا دسترس نہیں ہونے پاتا۔ قرآن پاک جو برکات و رحمت ایزدی کا یاد دلانے والا اور اُس کی قدرتوں کا جتلانے والا ہے، اُس کے نزول کے وقت یہ انوکھی اور اچھی جگہ روئے زمین پر موجود تھی اور علم الٰہی نامتناہی اُس پر محیط تھا۔ اس لئے اُس کا ذکر فرما دیا گیا۔ مقصود اللہ جل شانہٗ کی عظمت و جبروت

اور اس عالم سفلی میں اُس کے ایک اعجوبۂ قدرت کا اعلان و اعلام تھا۔ اور ظاہر ہے کہ انسانی جبلّت ایسی چیزوں کی اطلاع و آگاہی کی طرف کس قدر راغب و مائل رہتی ہے۔

ہمارے دَور کے مشہور مفسر و فقیہ مولانا ابو محمد عبدالحق[1] دہلوی نے تفسیر فتح المنان معروف بہ تفسیر حقانی (جلد ہفتم، صفحہ ۷۱) میں میٹھی ندیوں کے ذیل میں نیل و جیحون اور دجلہ و فرات کے ساتھ ساتھ "گنگ وغیرہ" کا بھی نام لیا ہے۔ جو میرے خیال یا اس معنی کا موید ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن[2] دیوبندی نے اس کریمہ کا ترجمہ فرمایا ہے "چلائے دو دریا چلنے والے۔ اُن دونوں میں ہے ایک پردہ۔ جو ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرے[3]"

اس آیت سے پہلے بھی کلام پاک میں بحرین کا لفظ کئی جگہ وارد ہوا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے شیخ کے ترجمہ پر مفسرانہ حواشی لکھے ہیں۔ [لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ۔ سورۂ کہف۔ پارہ سبحٰن الذی (۱۵) کے] بحرین کی نسبت فرماتے ہیں کہ بعض افریقہ کے دو دریا مُراد لیتے ہیں۔ بعض بحر فارس اور بحر روم تجویز کرتے ہیں۔ مجمع البحرین کو وہ جگہ بتاتے ہیں جہاں دجلہ و فرات خلیج فارس میں گرتے ہیں[4]۔

حضرتِ موسیٰ کے قرب اور تعلقات کے لحاظ سے یہ موقع زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ لیکن آگے چل کر وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ (سورۂ فرقان، پارہ ۱۹) کے بارہ میں دو معتبر عالمانِ بنگالہ کی شہادت پر بحوالہ بیان القرآن نقل فرماتے ہیں کہ "اراکان سے چاٹ گام تک دریا کی شان یہ ہے کہ اس کی دو جانبیں بالکل الگ الگ نوعیت کے دو دریا نظر آتے ہیں۔ ایک کا پانی سفید ہے ایک کا سیاہ۔۔ ..... دونوں کے بیچ میں ایک دھاری سی برابر چلی گئی ہے جو دونوں کا ملتقیٰ ہے۔" اسی طرح باریسال کے بعض طلبہ کے حوالہ سے ضلع مذکور میں دو ندیوں کا ایک ہی دریا سے نکلنا، ایک کا پانی کھاری اور کڑوا، دوسرے کا شیریں و لذیذ ہونا بیان کرتے ہیں۔ خود اپنے سفر ڈابھیل سملک ضلع سورت (ملکِ گجرات) کے قریب بروایت ثقات دس بارہ میل کے فاصلہ پر سمندر کے ایک عجیب و غریب قسم کے جوار بھاٹے کا حال تحریر فرماتے ہیں[5]۔

---

[1] ولادت ۱۲۶۷ھ = ۱۸۵۰ء۔ وفات ۱۳۳۴ھ = ۱۹۱۵ء۔ [2] متوفی ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ۔

[3] مطبوعہ مدینہ پریس بجنور، صفحہ ۸۴۹۔ [4] صفحہ ۴۷۹۔ [5] صفحہ ۵۸۱۔

ظاہر ہے کہ ان میں سے بعض تقلیدی تعبیریں متصور ہوں گی، بعض شخصی رائیں کہی جائیں گی، جن کا ماحصل تمام تر تمثیل و تشبیہ یا عوام کی سہولت فہم کے لئے نظائر و امثال کا فراہم کرنا ہے لیکن میرا مقصود ان اقتباسات کے پیش کرنے سے اسی قدر ہے کہ جب ہمارے پیش آگاہ وسیع النظر روشن خیال علمائے حال نے اس سلسلہ میں ہندوستان کے دریاؤں اور مقاموں کا نام لینا شروع کر دیا ہے تو عجب نہیں کہ کسی وقت سنگم بھی وہی ملتقے البحرین مان لیا جائے۔

یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ جو حضرات خارزار علم و خبرت میں اپنی آبلہ پائی کے شاکی ہوں یا تحقیق و تدقیق کے وادی میں قدم رکھنے سے ڈریں، براہ کرم دخل در معقولات نہ فرمائیں۔ اُن کے لئے یہی سبق کافی ہے۔

آپ اس بحث کی تکلیف نہ فرمائیں کہ آپ حامل فقہ نہیں، واقف تفسیر نہیں

ابوالفضل علامی نے قلعہ آگرہ کی نسبت جو کچھ لکھا تھا وہ الٰہ آباد کی شان میں حرف بہ حرف بلکہ دو دریاؤں کے جمع ہونے سے دوگونہ صادق آتا ہے یعنی "واز دریائے جون کہ بلب ادب پائے قلعہ بوسیدہ می گزرد چہ نویسد کہ آبروئے ہفت اقلیم است۔

بادِ وے از آب نگارندہ تر   آبِ وے از باد گوارندہ تر"

ہندوستان کے آثار، خصائص و فضائل اور محاسن و شرائف، نیز یہاں کی اکثر نعمائے الٰہیہ کے متعلق علامہ میر غلام علی آزاد بلگرامی[۱] نے ایک مبسوط و مدلل کتاب سُبحۃ المرجان عربی میں تحریر کی تھی[۲] جس کا اُردو ترجمہ کسی ہندو والی ریاست کی فرمایش سے مولوی شمس الدین کے قلم اور منشی نولکشور کے مطبع سے ہو کر ۱۸۸۰ء میں مظہر آدم کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور قابل مطالعہ ہے۔

اہل مصر نے بھی گنگا کی بزرگی اور اُس کے منافع و فوائد کا ذکر کیا ہے[۳]۔ امہات مدن الھند کے ذیل میں اللہ آباد کی نسبت تحریر ہے[۴] علے ملتقے الگنج بالجمنا (وھما نھران مقدسان) ولذالک یؤمھا الکثیر من الحجیج۔ (اللہ آباد جمنا کے ساتھ گنگا کے ملنے کی جگہ پر واقع ہے۔ اور یہ دونوں دریا مقدس ہیں۔ اسی وجہ سے یہاں جاتری بہت آتے ہیں۔

---

[۱] ولادت، صفر ۱۱۱۶ھ مطابق جون ۱۷۰۴ء۔ وفات ۱۲۰۰ھ یعنی ۸۶ / ۱۷۸۵ء۔ مدفن روضہ، خلد آباد دکن۔
[۲] مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۳ھ۔ [۳] دروس الجغرافیۃ، جزء اول، مؤلفہ پروفیسر محمد ثابت، مطبعۃ الرحمانیہ مصر، صفحہ ۵۰۔ [۴] ایضاً صفحہ ۷۹۔

تعارُف

مغلوں کے زمانہ میں بادشاہ زادے عموماً سلطان کہلاتے تھے۔ اسی لئے شاہزادہ خسرو بھی "سلطان خسرو" کہلاتا ہے۔ وہ شہنشاہ جہانگیر کا بڑا بیٹا، جے پور امبیر کی راج دولاری راج کماری رانی مان بائی، مخاطب بہ "شاہ بیگم" کے بطن سے تھا۔ اکبر اعظم کے سے نامور دادا کے سایۂ شفقت میں پرورش و تربیت پائی تھی۔ دربار شاہی میں مرزا راجہ مان سنگھ اس کا ماموں، اور خان اعظم مرزا کوکلتاش اس کا خسر، دو زبردست حامی و معاون موجود تھے۔ جہانگیر کو محروم کرکے خسرو کو تاج و تخت دلانے کا ولولہ دونوں کے دلوں میں موج زن تھا۔ یہ تو اکبر کو بھی کبھی کبھی ماننا پڑا تھا کہ باپ سے زیادہ بیٹا فرماں روائی کی استعداد و قابلیت رکھتا ہے۔[1] اس کے فیصلۂ قطعی اور اعلان کے موقع بارہا پیش آئے مگر ٹلتے رہے۔ بالآخر تقدیر الٰہی نے کارفرمائی فرمائی۔ جب وقت آیا تو جہانگیر آگرہ میں تخت پر بیٹھا۔ اس نے شاہزادہ اور اس کے واسطہ داروں کی استمالت و دلداری اور عزّت افزائی میں حتی الوسع دریغ نہیں کیا مگر جو ہونا تھا ہو کر رہا۔ خسرو اپنے بندی خانہ یعنی قلعۂ آگرہ کے شاہ برج سے بھاگا۔ بغاوت کی۔ بادشاہی فوجوں نے تعاقب کیا۔ لاہور پہنچ کر مقابلہ ہوا۔ بیٹے نے شکست کھائی۔ گرفتار ہوا۔ مدۃ العمر قید و بند میں رہا۔ کبھی پدری شفقت کا دریا لہرانے لگتا۔ کبھی سیاست کا جذبہ غالب آجاتا۔ انھیں شدائد و مصائب میں وہ اپنی زندگی اسر و حبس میں گزارتا رہا۔ چھوٹے بھائی شاہجہاں کی تمام تدبیریں اور سازشیں خسرو کو پامال کرنے اور راستہ سے ہٹا کر تخت پر پہنچ جانے کی کارگر و کامیاب نظر آنے لگیں۔ خورم مہم دکن پر بھیجا گیا۔ خون کے جوش اور مہر و محبت کے دعوے اور دردسی و پرداخت

---

[1] میر غلام حسین خان طباطبائی، سیر المتاخرین میں لکھتے ہیں۔ اکبر در زمانِ رحلت ہم فرمودہ بود کہ شاہزادہ سلیم عیش دوست است، قابلیت سلطنت ندارد۔ سلطان خسرو پسرش بجمیع خوبی ہا آراستہ و قابل سلطنت است (صفحہ ۱۹۰)
پٹیرو ڈیلاویلی کے سفرنامۂ ہندوستان، شائع شدہ ۱۶۶۴ء، جلد اول، صفحہ ۵۵، سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

کے حیلے سے پابزنجیر بڑے بھائی کو ساتھ لے کر چلا۔ خسرو کا انجام سب کے پیشِ نظر تھا۔ محلات شاہی اور بیگمات میں کہرام برپا ہوا۔ اُمرائے دربار و ارکینِ سلطنت حزین و غمگین خاموش کھڑے تھے۔ سیہ سیت جہانگیر کی صرف آنکھیں نہیں، کان بھی نہ تھے۔ بے کس و بے بس، اسیرِ قفس خسرو دکن میں اپنے صاحبِ تقدیر با تدبیر، قوتِ بازو، شاہ جہاں کے حکم و اشارہ سے ہلاک کر دیا گیا۔ زمانہ ساز و زمانہ شناس مورخ قولنج کا درد اور قضائے الٰہی کی تمشیت بتاتے ہیں۔ ممالکِ غیر کے سیاح کچھ اور لکھتے ہیں۔ مجھ سے جو کچھ تحقیق ہو سکا، شاہزادۂ خسرو کے تذکرہ میں مفصّل حوالۂ قلم کر دیا ہے۔ نعش بُرہان پور (دکن) میں سپردِ خاک کر دی گئی۔ چھ مہینہ بعد جہانگیر کے حُکم سے نکالی گئی۔ نتیجۂ تحقیقات و تفتیش کے بارہ میں سب خاموش ہیں۔ الزامات و شبہات ثابت ہوئے، یا رفع کر دیے گئے۔ دیکھ بھال کی گئی، جراحی اور تشریحِ اعضا بھی عمل میں آئی ہوگی۔ پھر براہ آگرہ جنازہ الٰہ آباد بھیج دیا گیا۔ فرسودہ و بوسیدہ ہڈیوں نے ماں (شاہ بیگم) کی آغوشِ محبت یا قبر کے قریب جگہ پائی۔ خسرو باغ آج بھی انھیں دونوں کی بدولت آباد ہے اور مظلوم شاہزادہ کا نام روشن کر رہا ہے۔

مرحوم دل بھی کیا تھا، کیا حسرتیں تھیں اُسمیں ۔۔۔ اب تک کچھ اُس کی باتیں میری زبان پر ہیں



خسرو باغ

بیابانِ محبت، دشتِ غربت بھی، وطن بھی ہے   یہ ویرانہ قفس بھی، آشیانہ بھی، چمن بھی ہے

اِس کُرۂ آب و گِل کے جس زندان خانہ میں شاہزادہ خسرو کا پیکرِ خاکی اس وقت محفوظ ہے، وہ اکبر کے مشہور و بے نظیر قلعہ سے ایک کوس پچھم واقع ہے۔ شہر الہ آباد میں آبادی سے بعض سمت ملا ہوا اور بعض سمت جُدا، ایک نہایت وسیع و پُر فضا فرحت افزا باغ ہے، جس کو جاننے والے "خسرو باغ" کے نام سے جانتے اور پکارتے ہیں۔ وجہ تسمیہ کسی اہل قلم نے نہیں لکھی۔ خواہ اس وجہ سے کہلاتا ہو کہ خسرو کی ماں وہاں دفن ہوئی، یا خسرو نے اپنی غم ناک و اندوہگیں زندگی کے کچھ دن کبھی یہاں کاٹے ہوں، یا اس سبب سے کہ سوا تین سو برس سے یہ باغ خسرو کی دائمی خوابگاہ ہے۔

اونچاس سال ہوئے جب مَیں اس باغ کو پہلے پہل دیکھنے گیا تھا۔ اس کے متعلق تاریخی سوتے فراہم کرنا چاہا تو ان پیرانِ گم راہ سے بھی، جو رہنما یا گائڈ کہلاتے ہیں، معلومات حاصل کرنا چاہی۔ ارشاد ہوا کہ یہ جگہ بہت پُرانی ہے، پُراچین زمانہ کی۔ پہلے یہاں پراگ جی مہاراج کا مندر تھا، جنھوں نے یہ شہر بسایا ہے۔ ایک طالب علم کی تشفی و طمانینت کسی کتابی سند کے بغیر دشوار تھی۔ دوسرے یہ تو اُن برگزیدہ لوگوں کی جماعت تھی، جن کی فضول گوئیوں اور حاضر جوابی کے مسٹر فرینچ بھی سو برس پہلے شاکی نظر آ چکے تھے[۱] اس لئے اس ورق گردانی شروع ہوئی۔

مطالعۂ تحقیق کے دوران میں جنرل کننگھم General A. Cunningham کی رپورٹ محکمۂ آثارِ قدیمہ[۲] سے پتہ چلا کہ پراگ دراصل ایک برہمن کا نام تھا، جو اکبر بادشاہ کے عہد میں گزرا ہے۔ وہ ایک بے حقیقت و کم مایہ شخص تھا۔ اُس کی یا اُس کے نام کی شہرت کا راز صرف اِس قصے میں مرکوز و مذکور ہے کہ جب اکبر کے حکم

---

[۱] سفرنامہ بلائی ہند، ۳۸، ۳۸ او ۳۹، صفحہ ۸۰۱۔ نیز ڈنکن و کین صاحبان کی آگرہ ہینڈ بک، صفحات ۲۴، ۲۱۹ و ۱۳۳ و ۱۳۵۔

[۲] ڈاکٹر فوہرر صاحب کے آثار قدیمہ، صفحہ ۲۷۔ محکمہ آثار قدیمہ کا اب ان قدیم مدعیانِ خدمت گزاری کو خسرو باغ سے برطرف کر دینا ایک مستحسن کارنامہ ہے۔ [۳] صفحہ آیندہ پر۔

سے قلعہ کی تعمیر شروع ہوئی تو سمتِ دریا کی دیواریں بار بار بنائی جاتیں، اور گر جاتی تھیں۔ عملۂ تعمیرات کی کوششیں بے کار ثابت ہوئیں، تو بعض واقف کار و دانشمند لوگوں کے مشورہ و صوابدید سے بادشاہ کو اطلاع کی گئی کہ جب تک بنیاد میں کسی انسان کا خون بھرا نہ جائے گا، بنیادیں قائم نہیں رہ سکتیں۔ چنانچہ اعلان عام کیا گیا۔ اور ایک برہمن جس کا نام پریاگ تھا، بخوشی خاطر از خود سامنے آیا، اور اپنی جان اس شرط پر نذر کی کہ قلعہ کا نام اُس کے نام پر رکھا جائے۔

آیندہ سلسلۂ روایات و تحقیق میں یہ بھی کھل جائے گا کہ پریاگ کی آبادی یا تیرتھ گاہ، اکبر اعظم کی آمد اور قلعۂ الٰہ آباد کی تعمیر بلکہ تجویز سے بہت پہلے سے موجود تھی۔

سر ہنری ایلیٹ کی بحث و تحیص جو الٰہ آباد کی قدامت کے متعلق اُن کی کتاب "سپلی منٹل گلاسری" Elliot's Supplemental Glossary میں مندرج ہے، [1] مندرجۂ اس واقعہ کی تردید کرتی ہے۔

انگلستان کا مشہور جوہری اور جہاندیدہ سیاح ٹیورنیر Tavernier جو دسمبر ۱۶۶۵ء میں الٰہ آباد آیا تھا [2] اور یہاں کی بہت سی باتیں، اچھی بُری کہہ گیا ہے، اس بارہ میں کیوں خاموش ہے؟ مسٹر فرگوسن Fergusson اس تردید کی تردید کیوں نہیں فرماتے؟

اس قسم کی زبانی روایات کی لغویت کا ثبوت ایک اور ملتا ہے:-

سر ولیم سلی مین Sir William Sleeman نے ایک موقع [3] پر دعویٰ کیا تھا کہ "اس ملک میں مسلمانوں نے جیسے ہی قدم رکھا اور اپنی وسیع فتوحات کا دائرہ پھیلایا تو ہندوؤں کے شہر ویران اور اُجاڑ ہونے لگے"۔ مگر اس کا شافی جواب خود اُنھیں کی کتاب کے مرتب اور مصحح ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ

صفحۂ گزشتہ۔ [5] محکمۂ آرکیالوجی کی رپورٹ بابتہ ۶۳-۱۸۶۲ء، حصہ اول، صفحہ ۳۰۰۔ Archaeological Report, Part I, by Major-General A. Cunningham, C.S.I.

ڈسٹرکٹ گزیٹیر الٰہ آباد، مطبوعہ ۱۸۸۴ء (جلد ہشتم) صفحہ ۱۶۱۔ [1] ب صفحہ ۲۶۹۔ [2] بحوالۂ سیاحت نامہ و تذکرۂ سلی مین، حصہ دوم، صفحہ ۲۲۵۔ [3] ریمبلس اینڈ ری کلکشنس، جلد دوم، صفحہ ۱۰۱۔ Rambles and Recollections

Vincent Smith نے اُسی جگہ دے دیا تھا۔ وہ اپنے نوٹ[1] میں لکھتے ہیں کہ "یہ بیان بہت زیادہ عمومیت رکھتا ہے۔ بنارس، الٰہ آباد (پریاگ) اور بہت سے اور بڑے بڑے قصبے اور اہم شہر ہندوؤں کے تو کبھی ویران نہیں ہوئے، باوجود تمام انقلابات کے آباد و بارونق، قائم رہے ہیں۔ صحیح اسی قدر ہوگا کہ خاص خاص مندر اکثر مقامات پر ضائع یا خراب کر دئے گئے اور زیادہ تر مسجد بنا دئے گئے تھے۔"

بدیں کرامتِ بُت خانۂ مرا اے شیخ   کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

اس جگہ مندر یا کسی پرانی عمارت کا کوئی نشان پایا نہیں جاتا۔ بخلاف اس کے یہ واقعہ پیش نظر آجاتا ہے کہ یہ عہد تو اکبر کا تھا، جس نے مسٹر بنویل Mr. H. R. Nevill, I.C.S. اور اُن کے گزیٹیر (سلسلۂ جدید، ۱۹۱۱ء[2]) کی روایت کے بموجب "الٰہ آباد کے پُرانے مندروں کو بھی قائم رکھا کوئی دست اندازی نہیں کی، اور قلعہ بھی تعمیر ہو گیا۔ اس سے بڑھ کر کوئی نمایاں اور قابل تقلید مثال اس نیک نفس بادشاہ کی مذہبی رواداری اور اعتدال پسندی کی کیا ہو سکتی ہے۔"

ڈاکٹر فوہرر Dr. A. Führer کی روایت سے بھی اس کی کچھ اصلیت پائی نہیں جاتی۔ وہ لکھتے ہیں[3] کہ "اکبر نے یہاں قلعہ بنایا، شہر بسایا، الٰہ آباس نام رکھا، جو بعد کو الٰہ آباد ہو گیا۔ ورنہ پریاگ پُرانا نام اور پُرانا مقام ہے۔ مشہور سیاح ہیوین تسانگ[4] Hiouen Thsang جو ساتویں صدی میں آیا تھا، یہی نام لکھتا ہے[5] جو بگمان غالب اشوک[6] کے وقت سے چلا آتا ہے۔"

---

[1] نوٹ ذیلی، صفحہ بالا۔ [2] District Gazetteer, Allahabad صفحہ ۲۱۱۔ [3] ممالک مغربی و شمالی و اودھ کے صنادید قدیمہ اور اُن کے کتابے، صفحہ ۱۲۷۔ [4] اس نامور شخص کی سیاحت ۶۲۹ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس نے ہمارے ملک کی ہر چیز کو غور و احتیاط سے دیکھا ہے۔ اور اُس زمانہ کے زاویۂ نظر اور نقطۂ نگاہ کے مطابق ضروری تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ فاضل مورخ الفنسٹن Elphinstone نے اپنی تاریخ کے ضمیمہ ۹، جلد چہارم میں اس کے مفصل حالات تحریر کئے ہیں۔ نیز اکثر اہل قلم نے۔ پرانے ڈسٹرکٹ گزیٹیر کا صفحہ ۱۳۴ بھی ملاحظہ طلب ہے۔ [5] مختصر تاریخ اہل ہند، مولفہ ڈاکٹر ہنٹر، صفحہ ۷۲۔ [6] ہندوستان کا مشہور منتظم فرمانروا اشوک جناب مسیح سے دو سو چالیس سال پیشتر گزرا ہے۔ اس کا ہم عصر انطاکیوس (انٹی اوکس Antiochus) تھا۔ (صفحہ ۱۳۴ مذکور)۔

مسٹر سی ڈی اسٹیل C. D. Steel پرانے ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں تحریر فرماتے ہیں[۱] کہ "الٰہ آباد کا موجودہ نام اکبر نے رکھا تھا اُس وقت تک اس کا نام پریاگ چلا آتا تھا۔ یہ نام غالباً پوروں نے رکھا تھا، جو بودھ کی نسل سے چھٹویں پیڑھی میں تھا۔ مشہور ہے کہ اُسی نے پُرانے شہر کی بنیاد حضرت عیسٰی سے اکیس صدی پیشتر ڈالی تھی۔" اور یہ کہ "الٰہ آباد کی سب سے پرانی تاریخ پریاگ مہاتم Prayag Mahatmya آج بھی موجود ہے[۲]۔"

با ایں ہمہ مسٹر ولسن Wilson کو اختلاف ہے۔ اپنی کتاب "ہندوستان[۳]" میں فرماتے ہیں کہ "جب تک اکبر نے اس کو شہر نہیں بنایا، الٰہ آباد یا پریاگ کوئی شہر نہ تھا۔" موصوف کا خیال شاید اکبر نامہ کی طرف نہیں گیا، جس سے "قصبۂ پیاگ" کی موجودگی ثابت ہوتی ہے[۴]۔ طبقات اکبری نے، جو اکبر کے عہد اور اُس کے جلوس کے اڑتیسویں سال تک کی نہایت معتبر و چشم دید تاریخ ہے، کم از کم دو جگہ پیاگ کا نام لیا اور جاے وقوع بتائی ہے[۵]۔ اور پریاگ تو وہ مشہور تاریخی مقام ہے جہاں قنوج کا مہاراجہ ہرش وردھن مذہبی میلے اور اجتماع کیا کرتا تھا۔ یہاں کی کانفرنس مصالحت (۱۹۳۲ء) میں مہاراجہ صاحب الور نے اپنی اسپیچ (تقریر) میں فرمایا تھا کہ "الٰہ آباد کا پُرانا نام "پریاگ" ہے۔ وہ سنسکرت کے لفظ پراگ سے نکلا ہے، جس کے معنی قربانی کے ہیں۔ اس سے پہلے اس شہر کا نام کوسم نگری تھا۔ رام کے سب سے بڑے بیٹے کُش نے اس کی بنیاد ڈالی تھی۔" شیخ ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے "پیاگ۔ امروز بہ الٰہ باس روشناس واز ہر طرف تابیست کردہ نیایش گاہ دانند عنوانِ بزرگ پرستش گدہا[۶]۔"

ان سب سے قدیم تر، جہانگرد و نامور فیلسوف و حکیم، ابوریحان محمد بن احمد بن محمد بیرونی خوارزمی [مابین ۳۶۲ و ۴۲۹ھ مطابق ۹۷۳ و ۱۰۳۸ء] گزرا ہے۔ جس کی جامع علوم و فنون کتاب "عجائب الہند" کا زمانہ نو سو برس سے زائد (۱۰۳۰ء کے قریب کا) قرار دیا جاتا ہے، پریاگ اور اس کے قدیم و عظیم درخت

---

[۱] مطبوعہ ۱۸۴۳ء جلد ہشتم، صفحہ ۱۶۱۔ [۲] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، صفحہ ۱۰۱۔ [۳] تھیٹر اول، Theatre I صفحہ ۲۰۷۔ [۴] جلد دوم، صفحات ۲۲۵ و ۳۷۳۔ [۵] صفحات ۲۸۰ و ۳۵۹۔ [۶] آئین اکبری مطبوعہ نولکشور، صفحہ ۱۴۷، جلد سوم۔

"وٹ" کا ذکر کرتا ہے۔ وہ اس درخت کو مرکز و مستقل مان کر بعض مقامات کا فاصلہ فرسخ کے حساب سے (فرسخ چار میل یا ایک کروہ) بتاتا ہے۔ اُس جگہ کا بھی حوالہ دیتا ہے جہاں جون (جمنا) کا پانی گنگا سے مل جاتا ہے۔ اور جہاں ہنود طرح طرح کی ریاضتیں اور مشقتیں خود برداشت کرتے ہیں۔ اُن کا کسی قدر صراحت کے ساتھ اُس نے ایک باب میں بیان فرمایا ہے۔ اس بڑے درخت "وٹ" اس کی ٹہنیوں اور زمین بوس شاخوں کی نسبت بھی لکھا ہے۔[1]

کچھ دن ہوئے ایک ممتاز دانش آموز نے الہ آباد اور الہ باس کی بحث ایک کثیر الاشاعت مقامی اخبار میں چھیڑی تھی[2]، اور اپنی نازک خیالی اور بلند نظری کے ساتھ اس کو بڑھانا چاہا تھا۔ لیکن جہاں تک مجھے علم ہے، اہل علم نے اعتنا نہیں فرمایا اور ساکت رہے ہیں بھی اس کو تردید کیا سمجھتا رہا ہوں۔ تاہم یہ قضیہ رہ رہ کر سامنے آجاتا ہے کئی سال ہوئے ایک خوش طبع انشا پرداز نے الہ آباد کے متعلق کچھ شذرات لکھتے ہوئے ظریفانہ انداز میں یہ فرمایا تھا کہ "ان حضرات (عمائد شہر) نے بادشاہ (راجا؟) اِلّا کا ذکر نہیں کیا، جو الہ آباد ALLAHABAD کا داستانی بانی ہے۔ وہ جس کو مسلمانوں کی فتح کے بعد بگاڑ کر اللہ آباد بنالیا گیا ہے۔[3]

یہ قصہ آج کا نہیں، بہت پرانا ہے۔ خلاصۃ التواریخ[4] میں مرقوم ہے کہ اکبر نے قلعہ تعمیر کرایا الہ باس نام رکھا۔ شاہ جہاں نے الہ آباد کر دیا۔ مسٹر بیل Beale اکبر نامۂ شیخ ابوالفضل کے حوالہ سے مفتاح التواریخ میں راوی ہیں کہ یہ شہر الہ آباد، آباد ہوگیا تو الہ باس[5] نام رکھا گیا۔ دوسرے موقع پر نقل کرتے ہیں[6] کہ قلعہ الہ آباد کی بنیاد رکھی گئی۔ الہ باس نام قرار پایا، شاہجہاں کے عہد میں الہ آباد مشہور ہوا۔ غالباً ان کی سند خلاصۃ التواریخ کی تحریر ہے۔ میر غلام حسین خان طباطبائی کے الفاظ "شہرے بتازگی

---

[1] اصل عربی مطبوعہ لندن ۱۸۸۶ء، صفحات ۹۸ و ۲۴۰ و ۳۱۶۔ ترجمہ انگریزی از ڈاکٹر ایڈورڈ سخاؤ (شیخو) جرمنی، مطبوعہ ایڈ نمبر ۱، ۱۹۱۰، جلد اول، صفحہ ۹۸۔ و۔ جلد دوم، صفحات ۲۴۰ و ۳۱۶۔ [2] اخبار لیڈر مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۱ء۔ [3] اخبار لیڈر مرقومہ ۳ اگست ۱۹۳۵ء بروز شنبہ، صفحہ ۸۔ [4] قلمی موجودہ کتب خانہ مولوی حکیم سید منظور احمد مرحوم، واقع قصبۂ صمدن، ضلع فرخ آباد۔ [5] صفحہ ۲۵۶، طبع اول، ۱۸۴۹ء۔ [6] صفحہ ۲۸۵ طبع اول۔

احداث فرمودہ الہ باس نام گزاشت[1]" اسی کی صدائے بازگشت ہیں۔

شمس العلما آزاد دہلوی دربار اکبری میں فرماتے ہیں کہ "خلاصۃ التواریخ کا لکھنے والا ہندو ہے" (صفحہ ۵۱۹)۔ پھر لکھتے ہیں کہ "بٹالوی صاحب خلاصۃ التواریخ سے تعجب ہے کہ ملک پنجاب میں بیٹھکر کتاب لکھی، اور شاہجہاں اور عالمگیر کا زمانہ پایا" (صفحہ ۵۳۲)۔ "یہ اکبر کی جدت پرستی اور ہندو پسندی تھی کہ منشیانِ دفتر الہ آباد کو بھی الہ باس لکھتے تھے" (صفحہ ۸۰)۔ وہ اس سے پیشتر لکھ چکے تھے کہ "۲۸ سنہ جلوس میں عمارت کا کام ختم ہوا تھا۔ پھر وہ الہ آباد سے الہ باس ہوگیا"[2]

آپ نہ لالہ سجان رائے بھنڈاری "منشی المناشی" سرکاری کے قول پر اعتماد کریں نہ جناب آزاد کے کہنے پر۔ بلکہ خود اکبر اور رائس کے ارکان حکومت اور مقربین عالی منزلت کے طریق عمل پر نظر ڈال لیں جب یہاں قلعہ بنا اور شاہزادوں اور اُمرائے دولت کے لئے محلات و قصور تعمیر ہوئے تو ٹکسال بھی قائم ہوئی۔ اسی ٹکسال سے اکبر کے الہ آباد نام رکھنے کا ثبوت ملتا ہے[3]، جس کے سکوں پر شریف سرمدی کا یہ شعر مقبول ہو کر منقوش ہوا تھا[4]۔

ہمیشہ چوں زر خورشید و ماہ روشن باد　　به شرق و غرب جہاں سکۂ الہ آباد

میرے نزدیک یہ بھی کوئی حجت قاطع نہیں ہوسکتی۔ مسٹر وائٹ ہیڈ R. B. Whitehead کے قابل قدر مقالہ "ہندوستان کے مغل شاہنشاہوں کے ٹکسال والے شہر" سے واضح ہے کہ برٹش میوزیم میں جہاں الہ آباد کا سکہ موجود ہے، وہاں اسی عہد اکبری کا اسی عجائب خانہ میں ایک سکہ Æ دار الضرب الہاباس کا بھی محفوظ ہے جو ۱۸۹۲ء میں داخل ہوا تھا۔[5]

اکبر کے عہد میں اس نام (الہ آباد) کے مقبولِ عام ہونے کا ثبوت ایک اور ملتا ہے۔ رمضان ۱۰۰۹ھ (مارچ ۱۶۰۱ء) میں اکبر نے بُرہان پور و آسیر (ملک خاندیس) فتح کیا تو عادل شاہ کی نو تعمیر[5] جامع مسجد واقع بُرہان پور کے عقبی مینار پر میر محمد معصوم، نامی تخلص، مشہور درباری شاعر اور خطاط نے یہ کتبہ لگایا:۔

"تاریخ الٰہی عبارت است از زمان جلوسِ حضرتِ شہنشاہِ ظل الٰہ اکبر پادشاہ غازی کہ ز تائید جوان بخت خویش قلعہ آسیر گشاد۔

---

[1] سیر المتاخرین، طبع الہ آباد، صفحہ ۱۳۹۔ [2] دربار اکبری، صفحات ۱۲۲ و ۱۲۳۔ [3] دربار اکبری، صفحات ۱۲۲ و ۱۲۳۔ د۔ حیات جلیل، مؤلفہ مقبول، جلد دوم، نوٹ نمبر ۱۰۲، صفحہ ۱۲۸، مطبوعہ ۱۹۲۹ء۔ [4] صفحہ ۹۴۴، رسالہ ایشیاٹیک سوسائٹی بنگال (سلسلۂ جدید)، جلد ہشتم، نمبر ۲۔ بابتہ ۱۹۱۲ء۔ [5] سنہ ۹۹۹ھ = ۱۵۸۹ء۔

گشت آباد اسیر ازاں نامی سنہ بیشش بگفت الٰہ آباد"[1]..

سال الٰہی، ظل اللہ، آباد الٰہ سے الٰہ کے معنی اور الٰہ آباد کی مناسبت روشن ہوجاتی ہے۔
اہل علم جانتے ہیں کہ الٰہ اور اللہ میں لفظاً و معناً کوئی فرق نہیں۔ سامی زبان کی تمام شاخوں میں ا، ل، اور ہ کا مادّہ کسی نہ کسی ترکیب سے معبودیت کے لئے استعمال ہوتا چلا آیا ہے۔ کلدانی اور سریانی کا "الاہیا" عبرانی کا "الوہ" عربی کا "الٰہ" سب اسی سے نکلے ہیں۔ یہی "الٰہ"، حرف تعریف (اَل) کے اضافہ کے ساتھ اللہ ہوگیا۔ جو اسم ذات کے طور پر خدا کے لئے مستعمل ہوتا آیا ہے۔ اُسکی کسی خاص صفت کے لئے نہیں بولا جاتا۔ اللہ کے لغوی معنی کے بارہ میں علمائے لسان و اشتقاق فرماتے ہیں کہ اس کی اصل "اُلہ" یا "وُلہ" ہے۔ اُلہ اور وُلہ تحیّر و درماندگی کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پروردگار عالم و عالمیان کے متعلق جو کچھ ہم جانتے، یا سمجھتے، یا جان سکتے ہیں، وہ عقل کی نارسائی اور فہم و ادراک کے تحیّر کے سوا اور کیا ہے۔

رہی الٰہ باس یا الٰہ آباس یا الٰہ آباد کی بحث ہمارے زمانہ میں تو یہ شہر تمام غیر زبانوں اور ایشیا کے اکثر ممالک میں الٰہ آباد ہی کے نام سے شہرت پا گیا ہے۔ عرب و مصر کے جغرافیوں کو لیجئے۔ ان میں ہم کو عربی املا اور نحوی ترکیبات کے لحاظ سے "اللہ باد" اور "اللہ آباد" ہی لکھا ملتا ہے۔ پروفیسر محمد ثابت مصری کے الفاظ پہلے نقل کرچکا ہوں[2] جو دو جگہ اللہ باد[3] لکھتے ہیں تو ایک جگہ اللہ آباد[4]۔ وہاں کے ایک اور ممتاز جغرافیہ نویس نے بھی "اللہ آباد" ہی لکھا اور یہاں کی شہرت و استحکام، دریاؤں کے ملنے کی جگہ، تقدّس، غلّہ اور روئی کی وسیع تجارت، یونی ورسٹی، اور بہت سی ریلوے لائنوں کے اتصال کا ذکر کیا ہے[5]۔

ہندوستان کی پرانی تاریخوں اور تحریروں میں "الٰہ باس" اور "الٰہ آباد" دونوں ملتے ہیں۔ شمار کے اعتبار سے الٰہ باس زیادہ، الٰہ آباد کم۔ آئین اکبری میں ٹکسال کا نام الٰہ باس[6]، صوبہ کا نام

---

[1] صفحہ ۲۹، رسالہ نگار، نمبر ا جلد ۱۶، جولائی ۱۹۲۹ء۔ [2] صفحہ ۱۱ کتاب ہٰذا۔ [3] دروس الجغرافیۃ، جزو اول، صفحہ ۷۴۔ [4] ایضاً، صفحہ ۷۹۔ [5] الجغرافیۃ الحدیثۃ، تالیف احمد حافظ، جزو ثالث، مطبعۂ ہندیہ، قاہرہ، صفحہ ۳۴۷۔
[6] مطبوعہ منشی نولکشور، جلد اول، صفحہ ۱۹۔

الہاباس[1]، سرکار کا نام الہاباس، حویلی کا نام الہاباس ملتا ہے؛ محال جلال آباس؛ جو شاید شاہی لقب جلال الدین سے منسوب ہوئے[1]۔ لیکن آگے چل کر وہی صوبہ الہ آباد، اور شہر بھی الہ آباد ہو جاتا ہے[2]۔ خود مؤتمن الدولہ شیخ ابو الفضل نے کئی جگہ پیاگ[3] اور الہ آباد کا حال لکھا ہے۔ ایک کا نقل کر دینا کافی ہوگا۔

"صوبۂ الہ آباد۔ الہ آباد، پیشیں نام پیاگ (بفتح بائے فارسی) گیتی خداوند بداں نام روشناس گردانید۔ و سنگین قلعہ بانجام رسید۔ و گزیں کاخہا افراختہ آمد۔ اورا پادشاہِ معابد انگارند۔ نزد آں گنگ و جون و سرستی بہم پیوندند۔ لیکن پسیں را پیدائی نہ بود[4]"

(یعنی) صوبۂ الہ آباد میں۔ الہ آباد۔ پرانا نام پیاگ تھا۔ (پ کو زبر ہے)۔ اکبر بادشاہ نے اس نام (الہ آباد) سے شہرت دی۔ پتھر کا قلعہ بنوایا۔ اچھے اچھے بلند محل تعمیر کرائے۔ یہ تیرتھوں کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے پاس گنگا جمنا اور سرستی ملتی ہیں۔ مگر ظاہر میں سرستی کا پتہ نہیں۔

یہی حالت اقبال نامہ معروف بہ اکبر نامہ کی ہے، آئین اکبری جس کا جزوِ خاتم ہے۔ اس میں پہلے تو الہاباس ملتا رہا[5] پھر الہ آباد ہو گیا[6]، اور وہی رفتار پوری قوت کے ساتھ آخر تک قائم رہی[7]۔ حتیٰ کہ آغاز ہی سے اس کو الہ آباد قرار دے دیا۔ "بساعتِ خجستہ اساس شہر الہ آباد نہادند"[8]

باوجود اس کے کہ الہاباس یا الہ آباد نے صوبہ کا صدر مقام ہو جانے سے سرکاری و دفتری اقتدار[9] حاصل کر لیا تھا، لیکن کڑے کی اہمیت اس وقت تک باقی اور نمایاں تھی۔ اکبر نامہ میں قصبہ کڑہ[10] اور گزر کڑہ[11] اور آئین اکبری میں سرکار کڑہ[12]، سرکار کڑہ[13] غربی، حویلی کڑہ[14] اور بلدۂ کڑہ[15] کا نام جابجا آتا ہے۔

---

[1] مطبوعۂ منشی نولکشور، جلد دوم، صفحات ۲، ۴، ۶ و ۷۲۔ و۔ جلد سوم، صفحہ ۱۴۷۔ [2] ایضاً، جلد دوم، صفحہ ۱۷۔ [3] اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۱۴۱۔ [4] آئین اکبری، جلد دوم، صفحہ ۱۷۔ [5] جلد دوم، صفحات ۳۲۵ و ۳۷۲ و ۳۷۳۔ جلد سوم، صفحہ ۳۹۰۔ [6] اکبر نامہ جلد سوم۔ صوبۂ الہ آباد، صفحات ۷۱۴ و ۶۰۳ و ۷۶۹ و ۷۷۸ و ۸۰۴۔ حویلی الہ آباد، صفحات ۵۱۴ و ۷۱۴ و ۷۳۴ و ۷۱۴۔ الہ آباد، صفحات ۴۷۴ و ۵۰۹ و ۵۳۰ و ۶۳۴ و ۷۱۳ و ۷۹۸ و ۸۳۲۔ [7] اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۴۱۲۔ [8] جلد دوم، صفحات ۱۹۰ و ۳۱۵ و ۳۲۳ و ۳۶۰ و ۳۷۵ و ۳۸۶۔ [9] جلد دوم، صفحہ ۳۷۴۔ [10] جلد دوم، صفحہ ۳۔ [11] ایضاً صفحہ ۷۷۔ [12] ایضاً، صفحات ۳ و ۷۷۔ [13] ایضاً، صفحہ ۷۷۔

کرنیل جی بی میلسن G. B. Malleson بھی لکھتے ہیں کہ بابر اور اکبر کے وقت میں کڑا بہت آباد و بارونق تھا۔[1]

مسٹر جیریٹ H. S. Jarret نے آئین اکبری کے ترجمہ[2] میں بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ اکبر کے عہد میں جب کڑے کی بجائے الہ آباد کو مرکزِ حکومت بنادیا گیا تھا تو کڑہ کی اہمیت جاتی رہی۔ تاہم اس کی پرانی تاریخی عظمت[3] برقرار تھی۔ وہ تغلقوں کے زمانہ میں ہندوستان کے اہم شہروں میں سے تھا۔ صوبہ کا نام بھی یہی تھا۔ مصر کے نامور مورخ و جغرافیہ نویس شیخ ابوالعباس احمد[4] نے اپنی زندہ رہنے والی کتاب صبح الاعشیٰ فی صناعۃ الانشاء میں اس کو صاحب ہند کی مملکت کے تیئیس اقلیموں میں سے ایک اقلیم بتایا[5] ہے۔ بہت سے تاریخی واقعات اس قطعۂ زمین سے وابستہ ہیں۔

اسی آئین اکبری میں جہاں "بزرگ پرستش کدہا" کے عنوان سے بڑی بڑی تیرتھ گاہوں کا ذکر ہے، لکھتے ہیں[6] "پیاگ۔ امروز بہ الہاباس روشناس۔ و از ہر طرف تا بیست کروہ نیایش گاہ دانند۔ گویند کہ آدمی بہر خواہشے دریں جا فرو شود در دیگر زاد کامیاب آید و تر دامن گردد۔ ہر کہ خود را بکشد بزبان زدگی ستُرگ گراید مگر دریں جا فراواں ثواب اندوزد۔ وایں راہمگی سال بزرگ داشت نمایند۔ لیکن در ماہ ماگھ بیشتر۔"[7]

متقدمین میں سے مولانا نظام الدین احمد ہروی نے جو اکبری دربار کے رکن رکین اور ممتاز و نامور عہدہ دار و مورخ گزرے ہیں "طبقات اکبری" میں ہر موقع پر "الہ باس" لکھا ہے[8]۔ ایک جگہ یہ بھی صراحت

---

[1] اکبر اور سلطنت مغلیہ کا عروج، صفحہ ۴۳، نوٹ۔ [2] جلد دوم، صفحہ ۱۶۷ حاشیہ۔ [3] تاریخ ظفر الوالہ، جزو ثانی، صفحات ۷۲۳، ۷۲۹ وغیرہ۔ و۔ تاریخ مبارک شاہی، صفحات ۱۰۸، ۱۳۳۔ [4] متوفی ۸۲۱ھ (۱۴۱۸ع)۔ [5] جلد پنجم، صفحہ ۷۷۔ [6] آئین اکبری، جلد سوم، صفحہ ۱۴۱۔ [7] اس میں تو دوسروں کے اقوال کا صاف حوالہ ہے ورنہ جیسا کہ پروفیسر محمود شیرانی کا خیال ہے ابوالفضل نے بعض پرانی باتیں ہندو بیانات کی تقلید و اعتبار پر لکھ دی ہیں (پنجاب میں اردو، صفحہ ۱۲۲)۔ [8] مطبوعہ نولکشور ۱۸۷۵ء، صفحات ۲۸۰ و ۳۱۶ و ۳۵۸ و ۳۵۹ و ۳۶۵۔

کی ہے "پیاگ، کہ الحال بہ الہ باس موسوم و مشہور است[۱]" دوسرے محل پر فرماتے ہیں۔ "در پیاگ جائے کہ آب جون و گنگ بہم می رسد، شہر بنا فرمودہ و قلعۂ چند بر روے ہم طرح انداختہ آں شہر را بہ الہ باس نام کردہ بودند۔"[۲]

"منتخبات ابوالفضل علامی" میں خان خاناں سپہ سالار کے نام شیخ کا ایک خط موجود ہے، جس میں امن آباد الہ آباد تحریر کیا ہے[۳]۔ کہیں اس سے یہی شہر مراد نہ ہو۔

جہانگیر کے عہد کو دیکھئے۔ مرحوم مولوی خدا بخش خاں کے مشرقی کتابوں کے عجائب خانہ (پٹنہ) میں ایک چھوٹا سا خوش خط نسخہ دیوان حافظ کا محفوظ ہے۔ اس کے حاشیہ پر کچھ عبارت خود جہاں پناہ کے قلم سے تحریر ہے، جس میں "الہ باس" لکھا ہے[۴]۔ اقبال نامۂ جہانگیری یعنی جہانگیر نامہ میں خواجہ ابوالحسن معتمد خان بخشی نے بعض بعض جگہ "الہ باس" لکھا ہے[۵] اور کہیں کہیں الہ آباد بھی[۶]۔ اسی طرح تزک جہانگیری میں الہ باس اور الہ آباد دونوں نام آئے ہیں[۷]۔ دبستان مذاہب میں جو شاہجہاں کے زمانے یعنی ۱۰۵۹ھ (۱۶۴۹ء) کی ایک مشہور و معتبر کتاب ہے[۸] اور جس کا حوالہ کیننگھم صاحب بھی دیتے ہیں تیرتھ (محل بزرگوار) کی تعریف اور تمثیل میں تحریر ہے "پریاگ کہ اکنوں مشہور بہ الہ آباد است[۹]"

اورنگ زیب عالمگیر کی تمام تحریرات میں جو اس نے شاہجہاں کو زمانہ عزلت میں بھیجی تھیں

---

[۱] صفحہ ۲۸۰۔ [۲] صفحہ ۳۵۹۔ [۳] مطبوعۂ نولکشور، ۱۸۶۳ء، صفحہ ۱۱۶۔ [۴] چشم دید۔ [۵] مطبوعۂ نولکشور، ۱۸۹۶ء، صفحات ۱۹۷ و ۱۲۷ و ۱۶۶ و ۲۳۵۔ [۶] صفحات ۸۸، ۱۲۳، ۲۰۵، ۲۱۶۔ [۷] الہ باس، صفحات ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۳۱۔ الہ آباد، صفحات ۲۷۳، ۲۸۰۔ [۸] اس کا مصنف ۱۰۵۷ھ (۱۶۴۷ء) میں سرہند سے حیدرآباد دکن میں ملا تھا اور اس کا زمانہ عالمگیر کے وقت سے پہلے تھا۔ شمس العلماء مولانا شبلی فرماتے ہیں "دبستان مذاہب کی نسبت مشہور ہے کہ محسن فانی کشمیری کی تصنیف ہے۔ بعض اس کو داراشکوہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ذوالفقار اردستانی کی تصنیف ہے، جیسا کہ مآثر الامراء جلد دوم صفحہ ۳۹۲ میں مذکور ہے۔ سب سے پہلے یہ کتاب بمبئی میں ۱۲۶۲ھ میں چھاپی گئی تھی۔" (رسالۂ الندوہ، جلد ۲، نمبر ۷، رجب ۱۳۲۳ھ، صفحہ ۴)۔ [۹] مطبوعۂ نولکشور، ۱۸۸۱ء، صفحہ ۱۹۴۔

الہ آباد ملتا ہے[1]۔

راجہ کندن لال بہادر، اشکی جو ایک گرامی منش، محتاط انسان اور عہد امجد شاہی میں سلطنت اودھ کے میر منشی تھے، اپنی نفیس و مستند تاریخ (منتخبِ تنقیح الاخبار) میں "ولایت الہ آباد" اور اُس کا "دار الحکومت الہ آباد" لکھتے ہیں[2]۔ صوبہ کا نام بھی "الہ باس" نہیں بتاتے۔ حالانکہ آگرہ کے متعلق صوبہ کا نام آگرہ اور اُس کا دار الصدر اکبر آباد تحریر فرمایا ہے[3]۔

البتہ منشی سبحان رائے نے باوجودیکہ شاہجہانی فرمان اور (باقرارِ خود) تبادلۂ نام سے آگاہ تھے، اپنی کتاب (خلاصۃ التواریخ[4]) میں ہر جگہ "الہ باس" لکھا اور بدنصیب و بدنام اورنگ زیب نے مواخذہ و تعرض بھی نہیں فرمایا۔

سرکاری گزیٹیر میں بحوالۂ تاریخ الفنسٹن لکھا ہے کہ اکبر نے شہر کی بنیاد ڈالی اور الہ باس نام رکھا تھا۔ پھر الہ آباد بدل دیا اور یہی سکوں پر بھی لکھوایا[5]۔

مسٹر فرنو، J. H. Furneaux ایڈیٹر ٹائمس آف انڈیا اپنی ضخیم و عظیم الشان کتاب "ہندوستان کی جھلک" The Glimpses of India میں تحریر فرماتے ہیں کہ الہ آباد کا نام ۱۵۷۵ء میں اکبر نے الہ آباد رکھا تھا۔ جس کے معنی "دی اے بوڈ آن گاڈ" The Abode of God (خدا کے ٹھکانے کے) ہیں[6]۔ میری رائے میں قابل مترجم کی ذہانت و ذکاوت لائق داد ہے کہ "آباد" اور "اے بوڈ" کی بے تکلف و برجستہ آمد اور معنی و تلفظ کی یکسانی سے ایک مستحق ستائش بات پیدا کر دی۔ دوسرے موقع پر لکھتے ہیں کہ "الہ آباد اگرچہ ابتدا میں ہندوؤں کا مقام پریاگ نام تھا، تاہم شہر اُس کو مغلوں نے بنایا...... اور انتہائے عروج پر اُس کو اکبر نے پہنچایا[7]۔"

---

[1] رقعات عالمگیر، مطبوعہ دار المصنفین، جلد اول، صفحہ ۲۱۷۔ [2] مطبوعہ ۱۲۶۷ھ، سلطان المطابع، صفحہ ۳۵۔ [3] ایضاً، صفحہ مذکور۔ [4] قلمی کتب خانہ صمدن۔ [5] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، جلد ۲۳، صفحہ ۱۶۶-۷۔ تاریخ الفنسٹن، جلد پنجم، صفحہ ۵۱۳۔ [6] صفحہ ۴۲۵۔ مطبوعہ فیلاڈلفیا، ۱۸۹۵ء Piladelphia U. S. A.

[7] صفحہ ۳۲۵۔

نواب نصیر حسین خاں، خیال کا خیال ہے کہ "الہ آباد (شہر) گنگا، جمنا کے سنگم پر تھا۔ ماگھ میلے میں ایشور (خدا) کا نام وہاں لیا جاتا تھا۔ اس مناسبت سے وہ الہ باس پکارا اور یوں اردو بنا لیا گیا۔"[1]

یورپ کے اہل قلم نے جن کا سلسلہ زیادہ تر عہد جہانگیری سے چلتا ہے، ہمیشہ الہ آباد لکھا ہے۔ انگریزوں کی عملداری کے آغاز بلکہ آمد کے وقت یہ تحریک کی جاتی تو شاید "الہ باس" کا پھر رائج ہو جانا بہ آسانی ممکن تھا۔ جیساکہ الہ آباد سے انگریزی کا اللہ آباد Allahabad ہو گیا ہے۔

بہر حال دو تین صدی سے انگریز جو کچھ لکھ رہے ہیں سب کو معلوم ہے۔ سرکاری تحریرات سے ایک پرانی نظیر پیش نظر ہے۔ جس زمانہ میں کہ پونا کی حکومت کا آفتاب لب بام تھا اور یہاں کا زبردست مرہٹہ سردار بے دست و پا سا ہو رہا تھا تو مادھو راؤ نارائن پیشوا نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی وساطت سے اودھ کے نواب وزیر سے درخواست کی تھی کہ الہ آباد کے میلوں کے موقع پر ہندو جاتریوں سے محصول اور چنگی کم لی جائے۔ ارل کارنوالس Earl of Cornwallis سپہ سالار افواج شاہی و کمپنی نے ۲۸ اگست ۱۷۹۰ء کو اپنے (انگریزی) وکیل سید نور الدین حسن خاں بہادر کی معرفت یہ جواب دیا تھا۔

"حقیقت محصول تیرتھ پراگ یعنی الہ آباد کہ بہ مد نظر آرام و رضا جوئی زائران بہ نسبت ایام پیشیں خیلے تخفیف نمودند برائے اطلاع مخلص لطف فرمودہ اند و مخلص بہ مقتضائے محبت و وداد نقل افراد مرسلۂ نواب صاحب ممدوح بہ قید ہر قسم پیش آں مشفق ارسال می دارد۔ و ر جائے واثق کہ ارادۂ نواب معظم الیہ بہ ہماں طریق از فرط رحم و شفقت کہ مملو بر اطمینان و حفاظت زائران است بوجہ احسن جلوۂ ظہور خواہد یافت۔"[2]

اس میں پراگ تیرتھ اور الہ آباد کے ساتھ ساتھ، دکن کے ایک ہندو سردار کی خواہش و استدعا اور اودھ کے مسلمان حکمراں کی رواداری و مروت، انتظام اطمینان و حفاظت اور اپنی ہندو رعایا

---

[1] مغل اور اردو، صفحہ ۱۱۔ [2] "مکاتبات و مراسلات فارسی ایسٹ انڈیا کمپنی با دربار پیشوا" جن کو بھارت اتہاس سنشودھک منڈل نے شائع کیا ہے۔

اور جاتریوں پر نظرِ مہر و پرورش قابل توجہ باتیں ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب خود الہ آباد میں اشرافِ میونسپل کمیٹی نے اقتدار و اختیار پایا تھا تو ہندوؤں کے مُردوں پر عجیب و غریب ٹیکس لگا دیا تھا۔ یعنی جتنی لاشیں گنگا اور جمنا کے کنارے پر جلائی جاتیں، اُن کے لئے فی لاش ڈھائی روپیہ لیا جاتا تھا۔[1]

باوجودِ سعیِ مفرط و توجہ بلیغ، پروفیسر کوشل کشور "الہ باس" کے صحیح اور واقعی معنی معلوم کرنے اور اس (شاید سنسکرت نژاد) "اِلا" کے ماخذ و اصل کی تحقیق سے قاصر رہے۔ وہ اس کو ایک چیستان مان کر اہل ذوق و تلاش کو صلائے کرم دیتے ہیں۔ اس دعوتِ خاص میں مقبولِ بے نوا بھی ممدوح کا ہم آہنگ و ہم نوا ہے۔ ان کے نزدیک یہ اُس "اِلا" کی طرف بھی منسوب ہو سکتا ہے، جس کا تذکرہ "پرانو ن" میں ہے، اور جو بنی آدم کا ابوالآباء تھا۔ یا یوں کہیئے کہ حقیقتاً اس کی فطرت و جنسیت مشتبہ ہے۔ کیونکہ بعض اس کو اُم الامہات بھی کہتے اور بتاتے ہیں۔ نیز گنگا کے ایک تیرتھ کا نام "ایل" ہے۔ قیاس پہنچا ہے کہ اسی "ایل" کے مشتقات توصیفی سے "اِلا" ہے۔ نکتہ نواز و دقیقہ رس پارگیٹر صاحب اِسی "ایل" سے آریا کو ماخوذ اور اس جہت سے اگر تمام نوع بشری کا نہیں، تو کم از کم کُل اصناف و اقوام "آریا" کا مہد و گہوارہ الہ آباد کو سمجھتے ہیں۔[2]

لیکن دشواری تو یہ ہے کہ اس وسیع ملک میں بہت سے مقام الہ آباد اور الاباس سے موسوم ہیں۔ ضلع مظفر نگر ہی میں اسی نام "الہ باس" کا ایک مشہور گاؤں موجود ہے۔[3] تو یہ عظمت و تقدس اور دیرینہ سالی کا خلعت کس کس کو پہنانا جائز ہو گا۔

رہے "ایل" کے معنی۔ یہ بھی سُریانی زبان میں خدائے پاک کے ناموں میں سے ایک ہے۔ شیخ الامام محی الدین ابن محمد عبدالقادر القرشی[4] نے اپنی مبسوط و مستند تالیف الجواہر المضیۂ فی طبقات الحنفیہ میں لکھا ہے کہ اللہ، اللہم اور الاہ کے سوا "ایل" بھی اسمائے الٰہی میں سے ہے[5]۔ امام راغب اصفہانی المفردات

---

[1] رسالۂ اردو، ماہ اپریل ۱۹۳۵ء، صفحہ ۲،۳، جلد ۱۵۔ انتخاب اکمل الاخبار دہلی بحوالۂ پانیر الہ آباد ۱۸۷۵ء۔ [2] اخبار لیڈر، مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۵ء۔ [3] ڈسٹرکٹ گزیٹیر مظفر نگر، جلد سوم، مطبوعہ ۱۹۰۳ء، صفحہ ۲۵۲۔ [4] صاحبِ تصانیف کثیرہ ائمہ فقہا سے تھے ۷۷۵ھ (۱۳۷۳ء) میں وفات پائی۔ [5] نسخۂ قلمی قدیم، صفحہ ۶۔ موجودہ کتاب خانۂ مولوی سید منظور احمد صاحب مرحوم واقع صمدن ضلع فرخ آباد۔ [اس کا ایک مکمل و صحیح نسخہ پبلک لائبریری الہ آباد میں بھی موجود ہے۔ نمبر فہرست ۱/۱۴]

فی غریب القرآن میں تحریر فرماتے ہیں کہ "ایل اللہ تعالیٰ کا نام ہے"۔[1]

جتنے منہ اتنی بات۔ حال میں ایک صاحب علم نے اچھا خاصا رسالہ[2] تصنیف فرما کر یہ دکھایا ہے کہ "ایل" ایک قوم تھی جس سے مغل اور ترک قومیں نکلی ہیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی کے ایک برگزیدہ فرد تھے۔ بظاہر یہ تحقیق پروفیسر کونسل کشور کے نظریہ سے زیادہ قریب پائی جاتی ہے۔

باقی ناموں اور لفظوں کے متعلق آئین اکبری کے فاضل مقدمہ نویس اور حاشیہ نگار کی تحریر نقل کر دینا ضروری ہے فرماتے ہیں:۔

"پراگ و پیاگ، در ہندی وصل و اتصال۔ الہا باس و الہ آباد، بمعنی جائے ظہورِ قدرت اسم ذات بمعنی باش و بود آمدہ بمعنی جائے فرود آمدن و ظہور بودن دراں مکان و الہ آباد یعنی آباد کردہ حق سبحانہٗ تعالیٰ۔ و الہا باش یعنی جائے ماندن حق جل جلالہٗ۔[3]"

(ترجمہ) پراگ و پیاگ کے معنی ہندی میں ملنے، مل جانے کے ہیں۔ الہا باس اور الہ آباد، قدرت کے ظاہر ہونے کی جگہ، اسم ذات کے، رہنے سہنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ بمعنی اترنے کی جگہ کے، اور اُس مکان میں ظاہر ہونے کے۔ اور الہ آباد یعنی حق تعالیٰ کا آباد کیا ہوا اور الہا باش، خدا کے رہنے کی جگہ۔

پریاگ اور سنگم، سنسکرت کے لفظ ہیں جس سے غالباً اس عربی دان فاضل کو واقفیت نہ تھی۔ دوسروں کا بتایا ہوا لکھا ہے، یا یہ کہ اُس وقت اِن لفظوں اور ناموں کا یہی مفہوم مانا جاتا ہو۔ مجھ ہیچ مداں کو بھی اس زبان میں درک و دخل نہیں۔ غیروں سے حاصل کی ہوئی معلومات کی صحت کا دعویٰ کون کر سکتا ہے؟

پریاگ، پر (प्रिय) اور یاگ (یگ) (याग) سے بنا ہے۔ پر یا پریہ، سنسکرت میں پیارے کو کہتے ہیں اور یگ ہون کو جو معروف عام ہے۔ پریاگ کے معنی ہوئے جہاں یگ پیارا ہو یعنی جہاں بڑے بڑے ہون ہوتے ہوں۔ (प्रयाग)۔

---

[1] مطبوعہ مصر، صفحہ ۳۰۔ [2] تبصرۂ ایلیہ، از مرزا اسد علی بیگ برلاسی۔ [3] آئین اکبری از شیخ ابوالفضل علامی۔ منشی نول کشور۔ لکھنؤ۔ جلد دوم، صفحہ ۱۱، حاشیۂ اوّل۔

سَن सं اور گم गम سے سنگم संगम مرکب ہے۔ سَن = برابر۔ گَم = پہنچ؛ جہاں دونوں برابر پہنچیں، میل کی جگہ۔ باس वास کے معنی سنسکرت کے اہل لغت نے متعدد لکھے ہیں۔ یہاں، بسنے کے، استھان، ٹھاؤں، جگہ کے صادق آتے ہیں۔ باس، نواس اور استھان ہم معنی و مترادف کلمے ہیں سکونت یا رہنے کی جگہ۔ باش فارسی ہے۔

خوب ہوا کہ اس تاریخی چھیڑ چھاڑ سے الہ باس اور الہ آباد کی قدامت، تسمیہ اور اصلیت کے متعلق کچھ ذکر آ گیا اور پرانی کتابوں کی ورق گردانی کر لی گئی، ورنہ کون اس طرف توجہ کرتا اور تحقیق و تدقیق پر آمادہ ہوتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ آسان طلبی و سہل انکاری کے موجودہ دور میں الہ آباد کو الہ باس بنا لینے کی تحریک محض بے سود ہے۔ جس طرح چند صدیاں پیشتر، باوجود حکومت کی قوت و پشت پناہی کے، زمانہ کی زبان بنارس کو محمد آباد[1]، متھرا کو اسلام آباد[2]، برندابن کو مومن آباد[3]، بنگالے کی لکھنوتی کو جنت آباد[4]، صوبہ بہار کی سرکار مونگیر کو فرخ آباد[5]، اور پنجاب کے گجرات کو اکبر آباد[6] بنا کر شہرت نہ دلا سکی، یہ سعی بھی ناکام رہے گی۔ اس لئے ایسی باتوں کے چھیڑنے سے جو جماعتی اختلافات اور تلخیوں کو بڑھائیں، احتراز مناسب ہے۔

از من سخنِ عشق و جنوں پُرسس نظیری ... دیر یست دل و دین و سرکیش نہ دارم

کسی تاریخ سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا ہے کہ باغ کب نصب ہوا تھا۔ کس نے نصب کیا تھا۔ ابتداءً نام کیا رکھا گیا تھا۔ البتہ یہ مشہور و زبان زدِ عام ہے کہ باغ بہت پرانا ہے، جس کی پیدائش (لغوی معنی میں) اکبر کے قلعے کے ساتھ ہوئی تھی۔ اور اکثر مورخ اس بارہ میں متفق ہیں کہ قلعہ کی بنیاد[7] اکبر کے ایک ستون

---

[1] تاریخ بنارس از حکیم مظہر حسن۔ مطبوعہ ۱۹۱۶ء۔ صفحہ ۵۵، جلد اول۔ [2] متھرا کا ڈسٹرکٹ گزیٹیر مطبوعہ ۱۹۱۱ء۔ صفحات ۱۳۷ و ۱۹۶۔ مشہور قصبہ پٹیالی کا پرانا نام بھی مومن آباد ہے جو امیر خسرو کا مولد و موطن تھا۔ ترجمہ انگریزی مآثر الامراء، مطبوعہ ۱۹۱۱ء۔ صفحہ ۳۰۳۔ [3] آئین اکبری، جلد دوم، صفحہ ۴۵۔ [4] "آخر کے مغل" مصنفہ ولیم آروین، صفحہ ۲۰۰۔ Later Mughals by William Irvine [5] حیات جلیل، مؤلفہ مقبول، حصہ اول، صفحہ ۲۳۴۔ نوٹ ۳۰۲۔ [6] منتخب اللباب، حصہ اول، صفحہ ۲۳۶۔ [7] دربار اکبری، صفحہ ۱۲۲۔ و مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۰۵، طبع ۱۸۴۹ء۔ و سیر المتاخرین (انتخاب مغلیہ)، مطبوعہ الہ آباد، صفحہ ۱۳۹۔

سال جلوس (۹۸۱ھ) یا حسب روایت ڈسٹرکٹ گزیٹیر ۱۸۸۴ء میں پڑی تھی[1]۔ اوراقِ تاریخ اس باغ کو اہم بتاتے اور امتیازِ خاص دیتے ہیں۔ کبھی یہ ایک سادی سی جگہ فرحت و سیر کی تھی۔ اس کی زمین، اس کے چمنوں اور روشوں نے اُس وقت بھی اکبر کے قدم چومے تھے[2]۔ اس کے پھولوں اور غنچوں نے اس عظیم الشان شہنشاہ کے دماغ کو معطر کیا تھا۔ شاہزادۂ دانیال جب الٰہ آباد کا گورنر تھا[3] تو یہاں آکر لطف اندوز ہوتا تھا۔ جہانگیر اس کے درختوں کے سایہ میں تکان دور کرتا تھا۔ تعبِ سیر و شکار کے بعد آرام و راحت پاتا تھا۔ وہ مدت تک یہاں رہا تھا[4]۔ سلطنت کی ضرورتوں یا اپنی ہنگامی شوریدہ سری کے تقاضے سے کبھی باہر بھی جانا چاہتا تو یہاں کی دلچسپیاں عناں گیر ہوتیں۔ جلد سے جلد کھینچ کر واپس لے آتیں۔ جہانگیر کو منانے اور سمجھانے کے لئے جب اُس کی والدۂ سبیبی، مہدِ مقدس سلیمہ سلطان بیگم[5]

---

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر ۱۸۸۴ء، صفحہ ۱۷۵۔ [2] طبقاتِ اکبری، صفحہ ۳۵۹۔ [3] منتخب اللبابِ خافی خاں، حصّہ اول، صفحہ ۲۲۴۔ و۔ اویماقِ مغل، صفحہ ۱۴۱۔ و۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر ۱۸۸۴ء، صفحہ ۱۶۹۔ [4] جہانگیر نامۂ معتمد خان بخشی، صفحہ ۸۔ و۔ اکبر اور سلطنت مغلیہ کا عروج از کرنیل مے لیسن، صفحہ ۱۴۱۔ و۔ گزیٹیر مذکور، صفحہ ۱۶۹۔ [5] سلیمہ سلطان بیگم، مرزا نورالدین محمد سے گلرخ بیگم کی بیٹی، بابر کی نواسی تھی یعنی ہمایوں کی بھانجی اور اکبر کی پھوپھی زاد بہن۔ ہمایوں نے اس کی نسبت بیرم خاں، خانخاناں سے ٹھہرادی تھی۔ شادی کی تقریب ۹۶۴ھ (۱۵۵۷ء) میں اکبر کے ہاتھوں انجام پائی۔ بیرم خاں کے مرنے پر ۹۶۹ھ (۱۵۶۲ء) میں خود اکبر نے اس سے نکاح کرلیا۔ شاہزادہ خانم ایک بیٹی اور سلطان مُراد ایک بیٹا اُس کے بطن سے تھے۔ بڑی خوش سلیقہ، خوش بیان، شیریں کلام، حاضر جواب، اہلِ علم و ہنر کی قدر نواز تھی۔ شعر و سخن سے بھی بہرۂ کامل رکھتی تھی۔ مخفی تخلص تھا۔ عہدِ جہانگیر، ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) میں اس دارِ فانی سے رُخصت ہوئی۔ باپ خواجگان کاشغر سے ایک خاندانی شخص تھا۔ [ملاحظہ ہو: اکبر نامہ، جلد اول، صفحہ ۱۸۱۔ و۔ جلد دوم، صفحات ۷۹ و ۸۰۔ و۔ طبقاتِ اکبری، صفحات ۲۴۶ و ۳۲۸ و ۳۵۳۔ و۔ اقبال نامۂ جہانگیری، صفحہ ۶۶۔ و۔ مفتاح التواریخ، صفحہ ۳۲۵۔ و۔ نگارستانِ فارس، صفحہ ۱۱۸۔ و۔ مکتوباتِ آزاد، صفحہ ۴۱۔ نیز۔ مآثر الامرا، صفحہ ۱۳۰۔ و۔ آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۲۳۸]۔

الہ آباد آئی تھی تو جہانگیر نے دو منزل[1] بڑھ کر استقبال کیا، اور ملکۂ عالم و عالمیان کو یہاں اُتارا تھا۔
تاریخ کا ایک اندوہگیں واقعہ بھی اسی مقام سے وابستہ ہے۔ سلیم کے اشارہ[2] سے اکبر کے دانشمند و شجاع اور بہ ہر فن کامل و ماہر مشیر شیخ ابوالفضل علامی کا سر کاٹ کر راجہ نرسنگ دیو[3] (یا انگریزوں اور ہندوؤں کی متفقہ تحقیق سے، برسنگ دیو) بوندیلہ نے جہانگیر کے حضور میں الہ آباد بھیجا تھا[4] تو اسی جگہ پیش کیا گیا تھا۔
زمانۂ حال کا ایک ممتاز انگریز عہدہ دار (جس کا نام ادباً و احتراماً لینا مناسب نہیں) خسرو باغ کو ایک اور شرف دینا چاہتا اور لکھتا ہے کہ "جب جہانگیر ۱۵۸۰ء[5] کے قریب الہ آباد کا گورنر تھا تو اُس کا بیٹا جو تخت نشین ہو کر شاہجہاں ہوا، نیز اُس کا بڑا بھائی "خوش رو" نام وہیں پیدا ہوئے تھے۔ اسی دوسرے نام یعنی 'خوش رو'

[1] منتخب اللباب، حصۂ اول، صفحہ ۳۲۳۔ [2] تاریخ اکبر از می لیسن، صفحات ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۹۔ و۔ ترجمۂ آئین اکبری جلد اول، صفحہ ۳۳۔ و۔ بیلس ڈکشنری، صفحہ ۲۰۵۔ و۔ آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۴۷۔ [3] معتمد خاں نے اقبال نامہ میں اس راجا کو نرسنگہ دیو بُندیلہ لکھا ہے (صفحہ ۱۸۸)۔ آزاد دہلوی نے بھی نگارستان فارس میں نرسنگہ دیو تحریر کیا ہے۔ (صفحہ ۱۱۷) نیز سیر المتاخرین، جلد اول، صفحہ ۲۰۸۔ مسٹر بیل نے اپنی ڈکشنری میں صفحہ ۲۰۵ پر نرسنگہ دیو راجہ بندیلہ کے نام سے حالات لکھے ہیں، مگر صفحہ ۱۶ پر بیر سنگھ بندیلہ بتایا ہے۔ سید نجیب اشرف ندوی، مقدمۂ رقعاتِ عالمگیر (صفحہ ۱۳۷، نوٹ) میں لکھتے ہیں کہ بیر سنگھ کو عبد الحمید وغیرہ نے غلطی سے نرسنگھ لکھا ہے۔ حالانکہ اُس کے بنائے ہوئے تالاب کا نام خود بیر ساگر لکھا ہے۔ اس کی سوانح عمری "بیر سنگھ دیو چرتر" نام ہے۔ (تاریخ جہانگیر، مؤلفہ ڈاکٹر بینی پرشاد، ضمیمہ ج، صفحہ ۴۶۱۔) [4] تاریخ جہانگیر از گلیڈون، صفحہ ۹۔ نیز نوٹ ۳، صفحہ مذکور۔ و۔ صفحہ ۴۳۔ و۔ بیلس بیاگرفی کل ڈکشنری، صفحہ ۱۶۔ و۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر متھرا، صفحات ۱۹۳ و ۱۹۶۔ ایلیٹ صاحب کی تاریخ ہندوستان، جلد ہفتم، صفحہ ۱۸۴۔ رشحات الفنون کا ایک نفیس قلمی نسخہ خط نسخ میں لکھا ہوا پبلک لائبریری الہ آباد میں موجود ہے، مصنفہ امین الدین خاں بن سید ابوالمکارم بن امیر خان الحسینی الہروی۔ اس میں بھی ورق ۲۴۱ (جزء اول) پر دو جگہ 'برسنگہ دیو' لکھا ہے۔ [5] سیر المتاخرین، جلد اول، صفحہ ۲۰۸۔ و۔ اُمرائے ہنود، صفحہ ۳۴۹۔ و۔ دیباچہ تزک جہانگیری صفحہ ۱۰۔ و بیلس ڈکشنری، صفحہ ۱۶۔ و۔ مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۹۹۔ و۔ تاریخ بندیل کھنڈ، قلمی، از مولوی سید منظور احمد خاں مرحوم۔

سے خسرو باغ منسوب ہے"۔ یہ صاحب اپنے ماخذ اور ذریعۂ معلومات کا حوالہ نہیں دیتے۔ خسرو کو خوش رو قرار دینا اور اپنے اہل زبان کو اس کے معنی "فیر فیس Fair face ۔ اچھے چہرے والا" بتانا ذہانت ونکتہ آفرینی کی ایک عجیب ونازک اختراع ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ان صاحب کو ملا غیاث الدین رام پوری کی تحقیقات وموشگافی سے یہ خیال پیدا ہوا ہو۔ جنہوں نے اس لفظ کے متعلق غیاث اللغات[1] میں اچھی خاصی بحث کی ہے، اور مؤلف بہار عجم اور اُن کے اُستاد کے حوالہ سے یہ خوشگوار فیصلہ کیا ہے کہ صحیح لفظ خِسرو ہے، زیر کے ساتھ نہ کہ پیش سے، اور یہ خُسْرو کا معرب ہے، جس کے معنی خوبرو ہیں۔ بہر حال میں موصوف کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ خسرو کوئی نیا وضع کیا ہوا لفظ نہیں ہے۔ اس کی نسبت ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ نے بھی سر ولیم سلی مین کے سیاحت نامہ میں لکھا اور اُس کا یونانی املا "گریک فارم" CHOSROES بتایا ہے۔[2]

واضح رہے کہ بیرون ایشیا کے سیاحوں کی تحریرات میں سب سے پُرانی، ایطالیہ کے پیٹرو ڈیلا ویلے Pietro Della Valle کی ملتی ہے، جس نے ۱۶۲۳ء میں، اپنے ملک و زبان کے تلفظ و املا کے مطابق "سلطان خسرو" کو Sultan Chosrou اور KHOUSRO حوالہ قلم کیا تھا۔[3] یہ ہی ہجی مسٹر جی ہیورز G. Havers نے اپنی انگریزی ترجمہ مطبوعہ ۱۶۶۴ء میں قائم رکھی۔ لیکن مسٹر ایڈورڈ گرے Edward Grey نے اس جدید مستشرقانہ تحقیق پر عمل فرماکر نئے ترجمہ مطبوعہ ۱۸۹۲ء میں خوش رو KHUSHRU بنادیا۔[5]

جرمن شرق نواز ڈاکٹر ایڈورڈ سخاؤ Edward C. Sachau نے ترجمہ "کتاب الہند" ابیرونی میں خسرو کو KHUSRAU لکھا ہے۔[6]

رہا خسرو باغ اور شاہجہاں کی ولادت۔ اس بارہ میں اسی قدر لکھ دینا کافی ہے کہ شاہجہاں کے مقرب اور درباری مورخ عبدالحمید لاہوری نے "بادشاہ نامہ" میں اس کے زائچہ کی نقل و صراحت کرکے یہ اضافہ کیا ہے

---

[1] فصل خائے معجمہ مع سین مہملہ۔ [2] ریمبلس اینڈ ریکلکشنس، جلد اول، صفحہ ۱۶۶، تعلیق تحتی۔ [3] سیاحت نامہ مطبوعہ لندن، صفحہ ۵۲۔ [4] THE TRAVELS [5] ایضاً، صفحات ۵۵-۵۸۔ [6] مطبوعہ ایڈنبرا، صفحہ ۳۰۴، جلد اول۔

کہ شاہجہاں دارالسلطنت لاہور[1] میں پیدا ہوا تھا[2]۔ مسٹر بیل بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ شاہزادہ خسرو کے مفصل تذکرہ میں لکھ چکا ہوں کہ خسرو کے مولد ہونے کا فخر بھی لاہور کو حاصل ہے[3]، الہ باس اس شرف سے محروم ہے۔

ڈسٹرکٹ گزیٹیر کی یہ روایت کہ "زمانۂ قیام وسکونت الہ آباد میں یہ باغ جہانگیر کا نزہت گاہ تھا"[4] واقعات وتحریرات سے صحیح معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کا دوسرا جزو کہ "جہانگیر کے بعد اس کے باغی بیٹے خسرو کو دے دیا گیا تھا[5]"، ماننے کے قابل نہیں۔ اس دادو دہش کی تائید نہ تاریخ کے صفحات سے ہوتی ہے، نہ قرائن و قیاسات سے۔ اکبر کے جیتے جی خسرو اس کے پاس آگرہ میں رہتا تھا۔ اس کے تمام معاون اور حامی امرا موقع مناسب کے انتظار میں اس کو وہاں گھیرے رہتے تھے۔ جہانگیر کے تخت پر بیٹھنے کے ساتھ ہی خسرو نظر بند کر لیا گیا۔ شاہ برج (قلعۂ آگرہ) میں مقید تھا۔ چھ مہینہ بعد بھاگا۔ لڑا۔ پکڑا گیا۔ اور پھر زندگی بھر اس کو رستگاری ومخلصی نصیب نہیں ہوئی[6]۔

یہ مختصر سی ہے اس کی سوانح عمری　　ہمیشہ وقفِ ستم ہائے روزگار رہا

مسٹر فرنیو اپنی دلچسپ وعالمانہ کتاب "گلیمپسز آف انڈیا" Glimpses of India میں لکھتے

---

[1] ہمیشہ سے شاہ نشین شہر چلا آتا ہے۔ اکبر اور جہانگیر جب کسی مہم یا سیر وتفریح کے سفر کو جاتے تھے تو حرم سرائے شاہی کو کسی قریبی عزیز یا مقرب امیر یا راجا کے زیر نگرانی یہاں چھوڑ جاتے تھے۔ [2] جلد اوّل، دور اوّل، صفحہ ۱۶۔ نیز بیاگرفی کل ڈکشنری، صفحہ ۲۴۵۔ و۔ تاریخ ہندوستان، جلد ہفتم از مولوی ذکاء اللہ و سیر المصنفین، جلد دوم، صفحہ ۲۸۸۔ و سیر المتأخرین (انتخاب سلطنت مغول)، صفحہ ۱۲۹۔ [3] طبقات اکبری، صفحہ ۳۷۱۔ و تاریخ فرشتہ، جلد اوّل، صفحہ ۲۶۶۔ و۔ سیر المتأخرین، جلد اوّل، صفحہ ۱۸۷۔ و۔ دیباچہ تزک، صفحہ ۶۔ و منتخب اللباب، حصہ اوّل، صفحہ ۲۴۵۔ [4] سلسلۂ قدیم ۱۸۸۴ء، صفحہ ۱۶۵۔ و سلسلۂ جدید ۱۹۱۱ء، جلد ہفتم، صفحہ ۲۰۳۔ و۔ ڈاکٹر فوہرر کی تاریخ یادگارہائے قدیمہ، جلد دوم، صفحہ ۱۳۰۔ The Monumental Antiquities and Inscriptions N. W. P. & O. By A. Führer [5] صفحہ ۲۰۳ مذکورۂ بالا۔ [6] مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۳۱۔ و۔ اکبر اور سلطنت مغلیہ کا عروج، صفحہ ۱۴۱۔ و۔ اورنگ زیب اور سلطنت مغلیہ کا زوال، از اسٹینلے لین پول، صفحہ ۶۲۔

ہیں کہ "شاہزادہ سلیم جو اکبر کا بیٹا تھا، اور بعد کو مشہور شہنشاہ جہانگیر ہو گیا تھا، وہ بھی اپنا وقت یہاں (خسرو باغ میں) صرف کرنے کا شوقین تھا"[1]

شاہ عالم (ثانی) کا قیام[2] بلکہ سکونت الہ آباد میں ۱۷۷۱ء تک رہی۔ تو وہ بھی خسرو باغ کا دلدادہ اور حاضر باش تھا۔ مرزا جہانگیر جو اکبر شاہ ثانی، بادشاہ دہلی کا (بقول مسٹر بیل[3]) بڑا بیٹا، اور ولی عہد سلطنت تھا، جس نے ۱۸۰۸ء میں مسٹر سیٹن[4] Seton ریزیڈنٹ متعین دہلی پر تپانچہ (پستول) کا فیر کیا تھا، اور اسیر سلطانی کی حیثیت سے الہ آباد بھیج دیا گیا تھا، یہاں خسرو باغ میں کئی برس رہا تھا۔ اُس نے اکتیس سال کی عمر میں ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۱ء) میں وفات پائی۔

کہتا تھا خود شباب کہ مرنے کے دن نہ تھے

شاہزادے کے سالہاے عمر کے شمار سے، دفن کے وقت، قلعہ الہ آباد کی فصیل سے اکتیس ضرب توپ کی ماتمی شلک سر کی گئی۔ وہ اسی باغ میں سپرد خاک کیا گیا تھا۔ مگر بعد کو معمر بادشاہ کی خواہش اور اصرار پر (۱۸۳۲ء میں) لاش نکال کر دہلی منتقل کر دی گئی اور حضرت نظام الدین اولیا کے مزار کے صحن میں دفن ہوئی۔[5]

نکالی جا رہی ہیں ہڈیاں کچھ قید خانے سے — ہوئی ہے ختم میعاد آج پابند سلاسل کی

سر ولیم سلی مین نے ۱۸۱۶ء میں شاہزادہ کو یہاں دیکھا تھا۔ وہ مسٹر بیل کی طرح اُس کو ولی عہد اور اکبر دوم کا فرزند اکبر (اول) نہیں بتاتے لیکن اپنے سیاحت نامہ و تذکرہ میں لکھتے ہیں[6] کہ "یہ شاہزادہ الہ آباد میں اسیر و حبس کی حالت میں نہ تھا، صرف دہلی واپس جانے کی ممانعت تھی۔ اُس کا مکان شاندار تھا۔ آمدنی معقول تھی اور اُس کے مرتبہ و شان کے حسب حال تمام اعزاز برقرار تھے۔"

مرزا جہانگیر کے مزید حالات آخر کتاب میں اپنی جگہ پر ملیں گے۔

ہندوستان کی بغاوت ۱۸۵۷ء کے زمانہ میں بھی ارباب سیاست کی نگاہیں خسرو باغ کی طرف

---

[1] مطبوعہ فلیڈلفیا (امریکا) ۱۸۹۹ء، صفحہ ۳۲۸۔ [2] گزیٹیر سابق صفحہ ۱۴۶۔ وحال، صفحہ ۱۸۲۔ [3] بیاگرفی کل ڈکشنری، صفحہ ۱۲۸۔

[4] یہ صاحب رزیڈنسی شاہ جہاں آباد پر ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) میں مقرر ہوئے تھے (تاریخ چدولیہ، صفحہ ۵۴۳)۔

[5] اورینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری، Oriental Biographical Dictionary صفحہ ۱۲۸۔ و قاموس المشاہیر، صفحہ ۱۸۳۔ [6] جلد دوم، صفحہ ۱۶۷۔

لگی ہوئی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ "تاریخ اپنے کو دُہراتی ہے"۔ مسٹر اسٹیل C. D. Steel اور اُن کے رفقائے قلم کے بقول "خسرو باغ اگر پونے تین سو برس پیشتر ایک بغاوت کیش و سرگشتہ شاہزادے[1] کا مامن و مسکن تھا، تو ۱۸۵۷ء میں بھی اُس نے ایک شوریدہ سر فتنہ گر کو پناہ دی تھی"[2]۔

یہ شوریدہ سر فتنہ گر مولوی لیاقت علی باشندۂ مہ گاؤں[3] (پرگنہ چایل، ضلع الٰہ آباد) ہیں، جن کے تقدس و اتقاء کا شہرہ دور دور تک تھا۔ بغاوت کے شروع ہی سے ضلع الٰہ آباد کے اُس علاقہ میں جو مابین دو آبِ گنگ و جمن واقع ہے، ان کا بڑا اثر تھا۔ وہاں کے آشفتہ مزاج، شورش پسند، خیرہ سر زمینداروں کو حسب روایاتِ سرکاری ایک ایسے رہنما کی ضرورت تھی جو قتل و خون و غارت گری و تاراج میں اُن کا پیشوا بن سکے۔ نظر انتخاب مولوی لیاقت علی پر پڑی۔ وہ بڑی آن بان اور سردارانہ تزک و احتشام سے کوچ کر کے الٰہ آباد آئے۔ بادشاہ دہلی کی فرماں روائی و حکومت کا اعلان فرمایا۔ گورنر الٰہ آباد کی حیثیت[4] سے اپنا جھنڈا بلند کیا۔ خسرو باغ میں قیام پذیر ہوئے یہیں سے تمام احکام صادر و نافذ ہوتے تھے۔

وسط جون میں مولوی لیاقت علی اور اُن کے متبعین اور پیرووں کی جماعت نے افواج انگریزی سے شکست کھائی۔ بھاگ کھڑے ہوئے۔ مولوی صاحب کچھ زمانہ تک مفرور و روپوش رہے ۱۸۷۲ء میں الٰہ آباد میں گرفتار ہوئے۔ اور مدۃ العمر محبوس رہنے کے لئے بعبور دریائے شور بھیج دئے گئے۔

قانون کی نگاہ میں، اور سرکاری طور پر ان کے جرائم کیسے ہی ناقابلِ درگذر اور نظم مملکت کے لحاظ سے شدید مواخذہ و بازپرس کے مستوجب رہے ہوں، مگر میں نے بعض سن رسیدہ، ممتاز و فہیم مسلمانوں کو ان کا نام ادب و احترام کے ساتھ لیتے ہوئے سُنا ہے۔ ان کے ذکر میں خود گزٹیروں کا لہجہ بھی چنداں تلخ و درشت نہیں پایا جاتا[5]۔

---

[1] سلطان سلیم پسر اکبر سے مراد ہے۔ [2] ڈسٹرکٹ گزٹیر سابق صفحات ۱۵۲، ۱۶۵ و جدید، صفحہ ۱۸۲۔ [3] مہ گاؤں، الٰہ آباد سے چودہ میل پچھم بڑی سڑک (پختہ) پر واقع ہے۔ [4] بہادر شاہ کا مقدمہ "مطبوعہ دہلی ۱۹۱۳ء" سے پایا جاتا ہے کہ مولوی لیاقت علی ضلع الٰہ آباد سے آئے تھے اور مستقل گورنر مقرر ہوئے تھے۔ کسی اور جماعت سے کوئی اور درخواست نہیں آئی تھی۔ [5] ڈسٹرکٹ گزٹیر مطبوعہ ۱۸۸۴ء، صفحہ ۱۵۲۔ نیز گزٹیر سلسلہ جدید ۱۹۱۱ء، صفحہ ۱۸۲۔

خسرو باغ کی تاریخ میں وہ دن بھی یادگار رہے گا، جب ۱۸۷۲ء میں شاہزادۂ ولی عہد پرنس آف ویلس بہادر کی صحت یابی کا جلسہ یہاں منعقد ہوا تھا۔ اس مبارک و مسعود موقع پر الٰہ آباد کے شاعر شہیر مولوی غلام امام شہید[1] اور ممتاز حضرات نے تہنیت کے قصیدے پڑھے تھے اور مبارک باد کی تقریریں فرمائی تھیں۔ عوام نے بھی اپنی مسرت و شادمانی کا اظہار کیا تھا۔[2]

خسرو باغ[3]، الٰہ آباد کے ایسٹ انڈیا ریلوے اسٹیشن (جنکشن) سے ایک تیر پرتاب، یا انگریزی اصطلاح میں ایک "اسٹون (پتھر) پھینکنے" کے فاصلہ پر، شہر سے ایک میل واقع ہے۔ باغ نہایت وسیع، طویل و عریض ہے۔ اس کی وسعت و گنجایش اُس دَور کے بادشاہی باغات کے مساوی اور شایانِ شان رکھی گئی تھی یعنی انگریزی پیمایش سے چالیس ایکڑ، ستر ڈسمل۔ پوری تفصیل اور رقبہ کی موجودہ تقسیم مقبروں کے ذیل میں ملے گی۔

خسرو باغ کے متعلق تفصیلات و جزئیات کے بیان کرنے سے پہلے فنِ نخلبندی و باغبانی کی نسبت اس قدر کہہ دینا ضروری ہے کہ کسی وقت یہ ایک مستقل ہنر تھا۔ ہندوستان میں اس کا شوق، مسلمان ایران اور وسط ایشیا سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ دُنیا کے تاریخ داں مانتے ہیں کہ انھیں کے ایک پیشرو منوچہر پیشدادو نے سب سے پیشتر باغ لگوائے اور قلعہ و خندق بنوائے تھے۔ سلاطینِ اسلام اور اُن کے ارکانِ دولت نے خاص کر اپنے ذوق، رنگِ طبیعت، مُلک کی آب و ہوا اور رسم و رَواج یا (بہ لفظِ واحد) "ضرورت" کے موافق و مناسب تغیرات کر کے اُس کو خوب ترقی دی، سرپرستی و پرورش فرمائی۔ دلکش اختراعین اور دل آویز اصلاحیں کیں حتیٰ کہ اپنا خانہ زاد، ہندوستان پرور بنا لیا۔ اُن کے قصور و ایوانات کے ساتھ پائیں باغ، خانہ باغ، کم از کم چمنِ صحن کا ہونا لازم و ملزوم تھا۔ فیروز شاہ تغلق جو باجماع مورخین منصف مزاج، خوش انتظام اور صاحب علم حکمراں گزرا ہے اور جس نے "فتوحاتِ فیروز شاہی" کے نام سے اپنے عہد کے مہمات کی تاریخ خود لکھی ہے، سینتیس سال کے قریب [۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء) سے لے کر ۷۹۰ھ (۱۳۸۸ء) تک، کچھ دن چھوڑ کر] فرماں روا رہا۔ اور فی الجملہ امن و عافیت کے ساتھ بسر کی۔ اس نے اپنے مستقر سلطنت میں جو دہلی سے زیادہ فیض آباد کے نام سے اُس وقت شہرت

---

[1] وفات ۱۵ شوال ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) مقام و مدفن الٰہ آباد۔ [2] سوانح عمری مولوی سمیع اللہ خاں۔ مصنفہ شمس العلماء محمد ذکاء اللہ، صفحہ ۱۴۱۔ [3] تاریخ جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرشاد، صفحہ ۲۴۰۔

رکھتا تھا، نصب باغ نصب کرائے تھے۔ زمانہ کا زبردست وتباہ کار ہاتھ ان سب کو مٹا چکا ہے۔ آج ایک کا نشان بھی نہیں بتاتا۔

اک نقش مٹ گیا ہے روتے نشان پر ہیں دل میں ہیں داغِ حسرت قصے زبان پر ہیں

سلطان سکندر لودی نے ۸۹۵ھ (۱۴۸۹ء) سے ۹۱۵ھ (۱۵۱۰ء) تک سلطنت کی۔ اس کا عہد بہت سی اصلاحات ملکی ومالی کے لئے شہرت رکھتا ہے، حتیٰ کہ سب سے پہلے اسی کے زمانہ میں ہندوؤں نے عربی فارسی شروع کی تھی[1]۔ ورنہ اُس وقت تک تو دھرم دان ہندو اس کو ملکش ودیا کہتے تھے[2]۔ اس نے ۹۱۵ھ یعنی مرنے سے کچھ پہلے آگرہ[3] سے دھول پور تک منزل بہ منزل محلات تعمیر کرائے اور باغات لگائے تھے[4]۔

مغلوں کے زمانہ کو لیجئے۔ بابر نے جب ہندوستان فتح کیا تو دہلی چھوڑ کر اُس نے بھی آگرہ کو مرکزِ حکومت بنایا۔ اپنے دل پسند، نواحات باغ، "باغِ وفا" واقع کابل کی یاد تازہ تھی، اُس کی نقل یہاں بھی کرنا چاہی۔ "چار باغ" یا "باغِ گل افشاں" کی بنیاد ڈالی[5]۔ اپنے مالوف وطن کے سوا، بخارا[6] اور بدخشاں اور بہت سے پہاڑی مقامات سے پھل پھول کے درخت اور بیج منگائے۔ نئے شکر کی پودھ، انار، سنگترے اور شفتالو آگائے۔ مگر کنکریلی زمین اور ناہموار سطح نے شکست دی۔ کوشش رائگاں گئی۔ بہادر ترک[7] پھر بھی ہمت نہ ہارا۔ جمنا کے

---

[1] بیلیس بیاگرفی کل ڈکشنری، صفحہ ۲۶۰۔ [2] دربار اکبری، صفحہ ۵۲۹۔ [3] آگرہ کو سب سے پیشتر اسی بادشاہ نے تخت گاہ بنایا (بلیس ڈکشنری، صفحہ ۲۶۰) اور یہی اصلی اور پرانا نام ہے۔ شاہ جہاں کے عہد سے اکبر آباد لکھا جانے لگا، ورنہ اس سے پہلے اکبر اور جہانگیر کے زمانہ کی تمام کتابوں، تاریخوں، تذکروں، اور فرمانوں حتیٰ کہ رقعوں میں بھی اس شہر کا نام آگرہ ہی لکھا ہے۔ تاریخ آگرہ از مولوی سید احمد، صفحہ ۱۵ و ۱۶ نوٹ۔ [4] مرقع اکبر آباد یا تاریخ آگرہ صفحہ ۱۱۵۔ [5] تزک بابری مترجمۂ او سکن، صفحہ ۲۳۴۔ و۔ تاریخ عمارت، مولفۂ فرگسن، جلد سوم، صفحہ ۱۷۵۔ اسی باغ کے ایک حصہ میں "چوچو برجی" کہلاتا ہے، کابل جانے سے پیشتر بابر کا تابوت دفن رہا تھا۔ تاریخ تاج از منشی معین الدین مرحوم، صفحہ ۱۴۴۔ و۔ معین الآثار، صفحات ۷۵، ۷۶۔ دکین صاحب کی آگرہ ہینڈ بک صفحہ ۷، چار باغ ایک شاہی ایوان بھی عہد بابری کا تھا۔ مذکور صفحہ ۷۔ [6] یہ تمام سلاطین چغتائی ملک موروثی کہہ کر بخارا اور سمرقند کے نام پر جان دیتے تھے اور عزیز وطن اور اُس کی چیزوں کی یاد سے دل کو یوں ہی خوش رکھتے تھے۔ (دربار اکبری، صفحہ ۱۲۰) [7] بابر کا اصلی نام ظہیر الدین محمد تھا۔ تیمور لنگ سے چھٹی پشت تھی۔ شیخ عمر بادشاہ فرغانہ کا بیٹا تھا۔ فرغانہ سمرقند کے پورب واقع ہے۔ چغتائی قبیلہ کا ترک تھا۔ اگرچہ مورخین نے اس کو اور اس کے اخلاف کو مغلوں میں شمار کیا ہے۔

پُرفضا کنارے، نیلگوں پانی کی موجوں سے دُھلنے والی ہواؤں سے معمور مقام پر "آرام باغ"[۱] آباد کیا۔ آزاد دہلوی لکھتے ہیں کہ پہلے اسے "چار باغ" کہتے تھے۔ پھر "ہشت بہشت" ہوا۔ بابُر نے نئی بنیاد ڈال کر "نور افشاں" کہلوایا۔ اب "رام باغ" کہلاتا ہے[۲]۔ اس کی اَنناس کی سالانہ پیداوار کسی وقت حد و شمار سے باہر تھی[۳]۔ اسی دل نشین سرزمین یعنی خاکِ نور افشاں نے بابُر کے جسمِ خاکی کو چھ مہینے تک اپنی آغوش میں رکھا تھا۔ بعد ازاں حسبِ وصیت یہ امانت کابُل کو منتقل کردی تھی[۴]۔

بابُر خوش نصیب و نیک نیت تھا کہ ساڑھے چار سو برس گزر جانے پر آج بھی اُس کی ایک اور دلپسند یادگار محفوظ اور "باغِ بابر"[۵] کے نام سے کابل کی موجودہ آبادی سے باہر ایک پہاڑ کے دامن میں موجود ہے۔ دامن میں باغ اور فوارے ہیں اور اُس سے اونچائی پر باغ کی عمارت ہے اور اُس سے اوپر پہاڑی کے بالکل نیچے وہ احاطہ ہے، جس میں شاہ بابُر کا کُھلا مزار ہے[۶]۔ بلدیہ (میونسپلٹی) کابُل کے تفریحی جلسے، امراء و عمائد کی پُر تکلف پارٹیاں اکثر اسی روح پرور و حیات افروز مقام پر ہوتی ہیں۔

میں نے یہ پورا حال اس لئے نقل کر دیا ہے تاکہ اہلِ نظر آگرہ یا ہندوستان کے کسی باغ کا کابُل سے مقابلہ کر سکیں اور اندازہ فرمالیں کہ باوجود اختلافِ نوعِ زمین، اور آب و ہوا، دونوں میں کس قدر یکسانی اور خوشنمائی پیدا کی جاتی تھی۔ پھر ایسے شخص کے ہاتھوں، جسے گھوڑے کی پیٹھ اور رزم و نبرد کے میدان کے سوا کبھی زمین پر قدم رکھنے کی بھی مہلت نہیں ملتی تھی۔

اکبرِ اعظم نے بھی اچھے سے اچھے باغ نصب کرائے تھے۔ کون بتا سکتا ہے کہ "باغِ فرح بخش" اور "باغِ

---

[۱] کین صاحب کی آگرہ ہینڈ بک صفحہ ۲۰۳۔ لیکن منشی صاحب کی تحقیق یہ ہے "آرام باغ" جہانگیر نے نورجہاں کے لئے نصب کرایا تھا۔ کابل کے باغِ نور افشاں کی نقل ہے۔ صفحہ ۱۴۰ مذکور۔ [۲] دربار اکبری، صفحہ ۳۳۲۔ [۳] تاریخ آگرہ از مولوی سعید احمد، صفحہ ۸۸۔ [۴] مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۱۸۔ دبیلس، ڈکشنری: صفحہ ۲۷۰ و آگرہ ہینڈبک مرتبہ کین و ڈنکن صاحبان، صفحہ ۲۰۳۔ [۵] مسٹر این بی نیویل فرماتے ہیں کہ "بابر دامنِ کوہ میں کابل کے پاس نشاط باغ میں مع اپنی وفا پرور رفیقۂ حیات کے محوِ خواب ہے۔ یہ وہی بابر ہے جس کی متعدد عظیم الشان تعمیرات فرشتہ نے گنائی ہیں۔" (قصص ہند، حصہ دوم، صفحہ ۷۲)۔ [۶] سفرِ افغانستان از مولانا سید سلیمان ندوی۔ رسالۂ معارف نمبر ۳، جلد ۳۳، صفحہ ۱۹۵۔

ارمِ آساس" کیا ہوگئے۔ آج صفحۂ کاغذ کے سوا ان کا نام کہیں باقی نہیں ہے[۱]۔

روتے ہیں ہمیں دیکھ کے دشمن بھی ہمارے — آتی ہے تباہی مگر ایسی نہیں آتی

احمد آباد کے پاس، جہاں سلطان مظفر گجراتی پر اکبری لشکر نے فتح پائی تھی، وہاں مرزا عبدالرحیم خانخاناں نے ایک باغ لگایا۔ "باغِ فتح" نام رکھا تھا[۲]۔ یہ مسلمان سلاطینِ ہندوستان کا قابلِ رشک کارنامہ تھا کہ ایران و توران میں جہاں فتح ہوتے وقت "کلّہ مینار" (مقتولوں کے سروں کے) بنائے جاتے تھے[۳]، یہاں سرسبز باغ نصب اور آباد ہونے لگے۔ جہانگیر نے بھی اس کو دیکھا تھا۔ لکھتا ہے کہ "جو باغ خانخاناں نے میدانِ کارزار پر بنایا ہے، دریائے سابرمتی[۴] کے کنارے پر ہے۔ عمارت عالی اور بارہ دری موزوں و مناسب چبوترہ کے ساتھ دریا کے رُخ پر تعمیر کی ہے۔ تمام باغ کے گرد پتھر اور چونے کی مضبوط دیوار کھنچی ہے ایک سو بیس جریب کا رقبہ ہے۔ خوب سیر گاہ ہے۔ دو لاکھ روپے خرچ ہوئے ہوں گے مجھے بہت پسند آیا۔ ایسا باغ تمام گجرات میں نہ ہوگا۔ دکن کے لوگ اسے "فتح باڑی" کہتے ہیں[۵]"

باغوں کے لگانے میں جہانگیر نے اپنے پردادا مرزا بابر سے کچھ کم سلیقہ، ذوق نہیں پایا تھا، بلکہ اطمینان اور امن و امان نصیب ہو جانے سے اس نے دل کھول کر اپنا شوق پورا کیا۔ کابل اور کشمیر کے بعض سرسبز و مسطح میدان اس کے لئے موزوں اور قدرتی طور پر مناسب تھے، جن کو اس نے سراپا بہار یا گلزارِ ارم بنا دیا تھا[۶]۔ وہ ۱۰۱۶ھ (۱۶۰۷ء) میں کابل گیا تھا۔ پردادا کی قبر کی زیارت کی حکم دیا کہ بڑا لمبا چوڑا باغ "شہر آرا باغ"[۷]

[۱] تذکرہ ہفت اقلیم۔ د۔ مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۴۹۔ [۲] پرائس صاحب Price نے اپنی تاریخ "جہانگیر" میں صفحہ ۱۵ پر اس کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ اس ضیافت کا حال بھی تحریر فرمایا ہے، جو خان خاناں کی بیٹی خیرالنساء نے جہانگیر کی اس باغ میں کی تھی۔ [۳] مسلمان تاجداران ہند، جلد اول، مطبوعہ ۱۹۲۶ء، صفحات ۱۳۵ و ۱۴۱۔ [۴] آج کل سابرمتی کہلاتی اور لکھی جاتی ہے۔ [۵] دربار اکبری، صفحہ ۶۸۱۔ و ترجمہ تزک از بیورج Beveridge جلد اول، صفحات ۴۲۹ و ۴۴۳ و نوٹ۔ [۶] تاریخ جہانگیر از گلیڈون Gladwin صفحہ ۳۹۔ [۷] الہ آباد کا شہر آرا باغ کبھی اسی کی ایک خوش نما نقل تھا۔ آج ایک نیم ویران محلہ اور چند درختوں کا نام ہے۔

کے متصل نصب کیا جائے اور "جہاں آرا باغ" نام رکھا جائے۔ دریائے کابل کاٹ کر نہر نکالی جائے۔ اس باغ کے خیابانوں میں ہو کر گزرے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

گردِ دامن بن گیا صحرا کا داماں، دیکھ کر　　پاؤں پھیلائے ہیں ہم نے بھی بیاباں دیکھ کر

اور یہ دونوں باغ "شاہ لالان" کے نام سے شہرت یاب ہوئے[۱]۔ راجہ کندن لال اشکی منتخب تنقیح الاخبار میں لکھتے ہیں کہ اس باغ "جہاں آرا" کی بنا ۱۰۱۵ھ یا سمبت ۱۶۶۲ میں پڑی تھی[۲]۔

کشمیر ایک تو قدرتِ کاملہ کی عطا و موہبت سے خود ہی گل و گلزار ہو رہا تھا، اُس پر جہانگیر کے زر پاش ہاتھ اور نکتہ آفریں دماغ کی بدولت کیا سے کیا ہو گیا۔ یہاں کے باغات میں پھل پھول کی وہ کثرت ہو گئی جس کی تفصیل سے میرا قلم عاجز اور کاغذ کا میدان تنگ ہے۔ باغچوں میں پھول، دولت خانوں میں پھول، جامع مسجدوں کے چھتوں پر پھول، غرض ہر طرف لالہ ہی لالہ نظر آتا تھا۔ بود و باش کے مکانات کی چھتیں تو حسبِ معمول لکڑی کی ہوتیں، لیکن اُن کو خاک پوش بنا کر سال بہ سال اُن پر گل کھلائے جاتے۔ ایک چنبیلی ہی خدا معلوم کتنے قسم اور رنگ کی ہوتی تھی، صندلی بھی، نیلی بھی، سفید بھی[۳]۔ اور نہایت خوشبودار۔ اسی طرح اور ہزاروں قسم کے پھول پھل اُگائے جاتے تھے۔ اکبر کے زمانہ سے پہلے ہندوستان میں شاہ آلو نہیں ہوتا تھا۔ نہ زرد آلو۔ محمد قلی افشار نے کابل سے لاکر پیوند لگا دئے۔ شہر آرائے کابل سے مرزائی نام ناشپاتی لگا کر لگائی گئی۔ کابل، بدخشاں، سمرقند سے منتخب چیزیں اور پودھیں لائی گئیں۔ شہتوت پر کرم پیلہ چڑھایا اور ریشم بنانے کا سامان کر دیا گیا[۴]۔ ایک بڑا خوبصورت باغچہ یہاں (کشمیر میں) اکبر نے لگایا تھا۔ جہانگیر نے اُس کی اصلاح و درستی کی نگہداشت کا اہتمام کیا۔ "نور افزا" نام رکھا[۵]۔ اُس نے بہت سی سیرگاہیں، عمارتیں اور حوض ان اطراف میں بنائے تھے، جن کا حصر و شمار آج کون کر سکتا ہے[۶]۔ پھولوں سے جہانگیر کے عشق کی نسبت مسٹر ہنری بیورج کا انڈین میگزین[۷] Indian Magazine میں ایک سیر حاصل آرٹکل نکل چکا ہے، اس پر اضافہ کی ضرورت نہیں۔

---

[۱] سیر المتاخرین (انتخاب مغول) صفحہ ۲۰۱، مطبوعہ الہ آباد۔ [۲] ادیاق مغول، صفحہ ۱۵۲-۱۵۳۔ [۳] مطبوعہ ۱۳۳۹ھ، سلطان المطابع صفحہ ۷۶۔ [۳] ترجمہ تزک جہانگیری، جلد اول صفحہ ۶۔ [۴] اقبال نامہ جہانگیری، صفحات ۲۴۴ و ۲۴۵۔ [۵] اقبال نامہ جہانگیری، صفحہ ۱۴۹۔ [۶] ایضاً، صفحہ ۱۵۵۔ [۷] بابتہ ماہ مئی ۱۹۰۰ء۔

جہانگیر کی مشہور ہنرمند و خوش سلیقہ ملکہ نور جہاں کے شوق اور نام کے انتساب سے بھی متعدد باغات، نور افشاں[1]، نور پری وغیرہ لگائے گئے تھے[2]۔ نور منزل یا ڈیرہ باغ ۱۰۲۸ھ (۱۶۱۹ء) میں نصب ہوا تھا[3]۔ بلند باغ یا بتیس کھمبہ نے پچپن بیگہ زمین گھیری تھی[4]۔ ان کے واسطے اُمرا دور دور سے عمدہ پھولوں اور پھلوں کے درخت تلاش کر کے بھیجتے تھے[5]۔ کشمیر کے اُس حصہ سے جہاں زعفران پیدا ہوتی ہے مٹی لا کر ڈالی جاتی تھی[6]۔

ایک دل پسند مقام کیرانہ (حال واقع ضلع مظفر نگر) میں جہانگیر کا ایک مقرب امیر مقرب[7] خاں نام، اچھی سرزمین اور سازگار آب و ہوا کو دیکھ کر منتخب و بے مثل آموں کا باغ نصب کرتا ہے۔ گجرات، دکن اور اور دور دست ممالک سے جہاں جہاں کے آموں کی تعریف سنتا ہے، بیج اور پیڑ منگا کر لگاتا ہے۔ ایک سو چالیس بیگہ رقبہ کے گرد پختہ دیوار کھینچتا ہے۔ کیاریوں اور خیابانوں کا فرش کراتا ہے۔ باغ کے وسط میں دو سو بیس گز لمبا، دو سو گز چوڑا، حوض بنواتا ہے۔ حوض کے اندر ماہتابی و صفہ بائیس گز مربع رکھتا ہے۔ سرد و سرد و گرم ہر قسم کے درخت لگاتا ہے تو اُس بے قدر و قیمت زمین کی یہ قدر و عظمت ہو جاتی ہے کہ شاہی روزنامچوں اور نیم سرکاری تاریخوں میں اُس کا اندراج کیا جاتا ہے[8]۔

---

[1] بابر کے گل افشاں باغ کی تقلید تھی۔ (صفحہ ۸۸) نور افشاں کا رقبہ چالیس بیگہ چار سو وہ پختہ یا بائیس ایکڑ تین روڈ بتیس پول تھا (مرقع اکبرآباد یعنی تاریخ آگرہ، از مولوی سعید احمد صفحہ ۹۷)۔ [2] ایضاً، صفحہ ۲۴۔ [3] ایضاً، صفحہ ۹۷۔ و۔ ترجمہ تزک جہانگیری از بیورِج، صفحات ۶۷ و ۹۵۔ [4] ایضاً۔ صفحہ ۹۶۔ و آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۲۰۵۔ [5] ایضاً، صفحہ ۸۸۔ [6] ایضاً، صفحہ ۸۷۔ [7] جہانگیر نے بزمانہ شاہزادگی خطاب دیا تھا (تزک، صفحہ ۱۲) اور اپنی کتاب میں متعدد جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ (صفحات ۶۸ و ۲۳۷)۔ مسٹر ہوجز Hodges انگریز سیاح (مصور) اسی کی صوبہ داری بہار کے زمانہ (جولائی ۱۶۲۰ء) میں پٹنہ آئے تھے۔ اس نے بہت اچھی طرح سے اُتارا۔ حسن سلوک کے ساتھ پیش آیا۔ ہوجز صاحب کے خطوط سے پایا جاتا ہے کہ اُن پر مقرب خاں کا رعب بہت غالب تھا۔ تاہم وہ شکریہ کے جذبات سے لبریز نظر آتے ہیں۔ اپنے خطوط میں نواب کے بہت سے حالات لکھے ہیں۔ [8] اقبال نامۂ جہانگیری، صفحہ ۱۲۵۔ لیکن ڈسٹرکٹ گزیٹیر مظفر نگر (جلد سوم، مطبوعہ ۱۹۰۳ء) صفحہ ۲۶۸ میں تحریر ہے کہ "حکیم مقرب خاں شاہجہاں کا طبیب خاص تھا۔ بادشاہ نے اس کو یہ کیرانہ جاگیر میں دیا تھا۔ یوں کہیے کہ اُسی وقت یعنی شاہ جہاں کے عہد سے کیرانہ کی ترقی اور رونق بڑھی ہے۔ حکیم

(باقی صفحہ ۵۰ پر ملاحظہ ہو)

خشک مزاج و خشک دماغ اورنگ زیب عالمگیر کے وقت کو بھی دیکھ لیجئے ایک ادنیٰ مثال فدائی خاں کا لگایا ہوا پنجور[1] کا باغ شملہ کے راستے (پٹیالہ کے علاقہ) میں موجود ہے۔ یہ امیر بادشاہ کا برادر رضاعی اور

بقیہ صفحہ ۳۸) نے یہاں بہت سی عمارتیں بنوائی تھیں اور یہ خوبصورت باغ بھی۔ جو اب بھی قصبہ کے شمال و شرق میں موجود ہے۔ اس میں اچھے سے اچھے میوہ دار درخت منگا کر لگائے تھے اور یہاں کے آم تو حسب روایت تاج المآثر مدتوں تک دہلی میں مشہور و مرغوب رہے۔ بارہ دری جو مقرب خاں نے باغ میں بنوائی تھی، اب بے مرمت ہو رہی ہے۔

[ہم کو اس سے مطلب! ناصح کو کیا شکایت! میرا مٹانے والا مجھ کو مٹا رہا ہے]

مقرب خاں نے نوے برس کی عمر پائی۔ یہ ہی امیر ملا سعد اللہ المتخلص بہ مسیحائے کیرانوی مشہور سخنور کا مربی تھا جنھوں نے رام اور سیتا کے سوانح عمری کے متعلق فارسی میں مثنوی لکھی تھی۔ مقرب خاں نے ان کو متبنیٰ کیا تھا (نیز ملاحظہ ہو، بیل صاحب کی ڈکشنری، صفحہ ۱۷۰)۔ دوسرے موقع پر (صفحہ ۵، گزیٹیر) اضافہ ہوتا ہے کہ مقرب خاں کا اصلی نام شیخ حسن یا حسّو تھا اور باپ کا نام شیخ بِنا یا بھنیا۔ پانی پت کے باشندے تھے۔ عہد جہانگیری میں شہرت و عزت پائی اسی کے ساتھ مقرب خاں خطاب ملا۔ باپ بیٹے دونوں سرجن یعنی جراحی پیشہ تھے۔ ۱۵۹۷ء میں اکبر کے ایک زخم کا علاج کیا تھا جو ہرنوں کی لڑائی میں پہنچا تھا۔ مقرب خاں پہلے شاہزادہ سلیم کا حکیم تھا، جس کو تخت نشینی کے بعد اس نے گجرات کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ ۱۶۱۸ء میں شاہزادہ شاہ جہاں وہاں بھیجا گیا تو یہ بہار پہنچا۔ ۱۶۲۱ء میں آگرہ کی حکومت پر سرفراز ہوا۔ شاہ جہاں تخت پر بیٹھا تو مقرب خاں کو پنشن دے دی اور کیرانہ یعنی خود اس کا مسکن مع اطراف کے پرگنوں کے جاگیر میں ملا۔ اس کا لڑکا رزق اللہ بھی شاہ جہاں کے زمانہ میں طبیب اور ہشت صدی منصب دار تھا۔ اورنگ زیب نے خطاب خانی مرحمت فرمایا تھا۔ ۱۶۶۳ء میں رزق اللہ نے وفات پائی۔

اس کی تائید سیر المتاخرین سے ہوتی ہے۔ کشمیر سے واپسی کے بعد لاہور کے قریب چاندنی رات میں اکبر ہرنوں کی لڑائی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ ناگہاں ایک آہو اپنے حریف کو چھوڑ کر اکبر کی طرف جھپٹا اور اس کی دونوں رانوں کے بیچ میں سینگھ مار دیا۔ زخم ہو گیا۔ آماس بھی۔ درد شدت سے ہوتا تھا۔ ابوالفضل کی رائے سے مقرب خاں معروف بہ شیخ بھینا جراح معالجہ میں مشغول ہوا۔ ایک مہینہ سات دن بعد پوری صحت ہو گئی۔ ابوالفضل اور مقرب خاں جنھوں نے ان دنوں بڑی خدمت کی تھی مورد عنایات و الطاف شاہی ہوئے (انتخاب مطبوعہ الٰہ آباد، صفحہ ۱۶۴)۔

صفحہ ہذا۔ [1] پنجور بڑا زبردست تاریخی مقام ہے۔ سلاطین خلجی کے عہد میں اس کی اہمیت اور شان خاص کر بہت بڑھی ہوئی تھی۔ منہاج سراج کی "طبقات ناصری" میں اس کو ہستانی جگہ کو خوب نمایاں کیا گیا ہے۔

لاہور کی شاہی مسجد[1] کا مہتمم تعمیر تھا۔ اس باغ کے نصب کرتے وقت اس کو جو دشواریاں پیش آئیں، وہ قدرتی موانع سے زیادہ انسانوں کے ہاتھ سے تھیں۔ راجاؤں نے ہوشیاری و چالاکی کے ساتھ مخالفت کی۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جسمانی امراض میں مبتلا کر کے بیکار باغباں اور کشاورز فراہم کئے جن کو دیکھ کر محل کی بیگمیں اور کنیزیں سہم گئیں۔ پھر آب و ہوا کی روائت و خرابی کے عجیب و غریب، مہیب قصے اور بے بنیاد افسانے سنا سنا کر دل برداشتہ و خوف زدہ بنا دیا۔

مسٹر فرنیچ[2] Mr. French نے دوران سفر سرکاری میں دہلی سے شملہ جاتے ہوئے اس کو دو مرتبہ ۱۸۳۸ء و ۱۸۳۹ء میں دیکھا تھا۔ اس کے احاطہ کی بلند دیواروں کی جو سنگ و خشت کی تھیں اور شاندار دروازہ کی تحسین کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ باغ مختلف حصوں میں منقسم ہے جو ایک دوسرے سے چھ چھ فٹ سے لے کر سولہ سولہ فٹ تک اونچے ہوں گے۔ زمین کا بڑا رقبہ گھیر رکھا ہے۔ حوض بھی ہیں، فوارے بھی۔ ہر ایک پر جدا جدا عمارتیں گنبد وا بنی ہیں۔ "چراغاں" کے لئے طاق ہیں۔ ایک عمارت قوس قزح کے رنگوں کی تیار کی گئی ہے۔[3]

یہ نمونۂ جنت باغ نزہت و لطافت کا ایک دُھندلا سا خاکہ، یا ایک بگڑا سا نقشہ رہ گیا ہے۔ سیلانی وہاں جاتے، حسرت و عبرت کے ساتھ دیکھتے اور یہ کہہ کر چلے آتے ہیں۔

---

[1] یہ مسجد لاہور کی بہترین عمارتوں میں سے ہے۔ ۱۰۸۴ھ (۱۶۷۳ء) میں چھ لاکھ روپئے کے صرف سے تعمیر ہوئی تھی۔ پتھر اور تمام سامان پہلے سے فراہم تھا۔ ان کی قیمت اس کے علاوہ۔ ۱۸۴۰ء کے شدید زلزلہ میں بعض برجیوں اور آخری منزلوں کو نقصان شدید پہنچا تھا۔ حتیٰ کہ اُن کو شہید کرنا پڑا۔ یہ عمارت بعض خصوصیات کے لحاظ سے بھی ممتاز ہے۔ اس کا نقشہ اس تکلف سے بنایا گیا اور یہ ایسے موقع پر اس اہتمام سے تیار کی گئی ہے کہ اگر مقبرۂ جہانگیر کے کسی مینار پر سے اس کے مناروں کو دیکھا جائے تو صرف تین منارے نظر آتے ہیں، چوتھا نگاہ سے اوجھل رہتا ہے۔ مسلمانوں کے کمال فن اور ترقی و سلیقۂ تعمیر کی بے مثال یادگار ہے۔

[2] مسٹر فرنیچ C. J. French اُس زمانہ میں رائٹ آنریبل ارل آف انگلینڈ Rt. Hon'ble Earl of Auckland جی سی بی، گورنر جنرل ہندوستان کے لشکر (کیمپ) میں متعین تھے۔ اسی حیثیت سے بالائی ہندوستان کا دورہ ۱۸۳۸ء و ۱۸۳۹ء میں کیا تھا، اور روزنامچہ لکھتے گئے تھے، جو معلومات تاریخی و مقامی سے مالا مال ہے۔ یہی سیاحت نامہ ۱۸۴۷ء میں شملہ سے شائع ہوا۔ اس کی لوح پر نکتہ چین و عیب جو حضرات کے ملاحظہ کے لئے ایک سبق آموز و عبرت افزا قطعہ انگریزی میں لکھا ہوا ہے۔

[3] سیاحت نامہ، صفحات ۳۸ و ۳۹۔

سُرمۂ بینش تھی گردِ راہ شاہوں کے لئے   خواب گاہِ ناز تھی تو کج کلاہوں کے لئے

آج ہیں تیری فضائیں سرد آہوں کے لئے

باغات کی نگہداشت، درستی حال و شادابی، درختوں کی آراستگی، پھلوں کی پرورش، نہروں کی حفاظت و روانی کے بارہ میں خود اورنگ زیب عالمگیر کو جس قدر قدغن تھا اُس کی تحریرات و خطوط سے ظاہر ہے۔ عمدۃ الملک امیر الامرا اسد خان مدار المہام کو دار الخلافہ کے متعدد باغوں کے نام لے لے کر تاکید کرتا اور حکم دیتا ہے کہ "روزانہ جا کر اُن کو دیکھ لیا کرو۔ نزہت و شادمانی کا خیال رکھو حوضوں کی صفائی پر بھی توجہ مبذول رہنا چاہئے۔ میں جب تک وہاں رہا ہوں ہر ایک کو خود دیکھتا اور منتظمین کو تاکید و تقیید کرتا رہتا تھا[1]"

دھول پور کے قریب، چولا سرائے سے دو میل پر موضع نور آباد کے متصل وہ خوشنما و پر فضا وسیع باغ موجود ہے جو عالمگیر نے تعمیر اور نصب کرایا تھا۔ پھاٹک کی پیشانی پر کتبہ لگا ہے۔ مادۂ تاریخ "دیدہ باغ جمال" سے اعداد ۱۱۰۰ نکلتے ہیں یہی سال ہجری تھا۔ ۱۶۸۸ء کے مطابق ہوتا ہے۔ بعد کو سنہ ۱۱۰۹ھ (۱۶۹۷ء) میں ایک شاہزادی گنا بیگم اس میں دفن ہوئی تھی مقبرہ یادگار ہے[2]

لطیف بود حکایت دراز تر گفتم۔ مغلوں کے باغات کا تاریخی حصہ، باوجود سعی اختصار، کسی قدر بڑھ گیا، اور پھر بھی یہ موضوع تشنہ رہا۔ ادبی و تاریخی، روایتی و اعتقادی اور مذہبی، (مختلف) پہلوؤں سے نگاہ نہ ڈالی جا سکی۔

جن حضرات نے عہدِ گزشتہ کے نیک نام اور بقائے دوام والے مغل بادشاہوں کے ویران باغوں کی رعنائیاں اور فردوس نظری دیکھی ہے، جن کو اُن کی ٹوٹی پھوٹی عمارتوں اور اینٹ پتھر میں کسی دلکشی کا سامان نظر آتا ہے، جو اِن عظیم الشان کھنڈروں کی ہیبت و جلالت سے متاثر ہوتے ہیں، جن کو اُن کے بچے کھچے، اُجاڑ گلزاروں کی مٹی ہوئی شان میں بھی حُسنِ مُطلق کا جلوہ دکھائی دیتا ہے، اُن کے دلوں سے پوچھا جائے۔ اُن کی آنکھوں سے دیکھا جائے۔ مغرب محض آرٹ جانتا اور تیار کر سکتا ہے، وہی اُس کا دین و ایمان ہے بلکہ معبود و مسجود۔ مصنوعی نیرنگی و خوش الوانی اُس کی زندگی کی روح ہے اور نشاطِ حیات۔ مشرق اس کو سراسر نمایش و تکلف سمجھتا ہے۔ ان پیچ در پیچ نقوش اور مخلوط الوان میں حقیقی دلربائی کی جھلک بھی نہیں پاتا۔ سچ یہ ہے کہ تخلیقِ حُسن اور جمال آفرینی کے اسباب بھی مغرب کے دسترس اور اُس کے تمام مصنوعات سے دور بلکہ یکسر مفقود ہوتے جاتے ہیں۔ اس فنِ شریف (باغبانی) کا عروج و کمال جس کو دیکھنا ہو، وہ کشمیر کو

---

[1] کلماتِ طیبات، معروف بہ رقعات عالمگیری، رقعہ ۱۱۷، مطبوعہ نولکشور، صفحہ ۳۰۔ [2] بلیس ڈکشنری، صفحہ ۹۸۔ و۔ گلگشت مقبول، صفحہ ۱۴۵۔

دیکھے۔ وہاں کے باغات (نشاط، شالی مار، چشمہ شاہی، ودی ناگ، وغیرہ) کو دیکھے۔ نورالدین جہانگیر اور نورجہاں کے حسنِ سلیقہ اور ذوقِ سلیم کی ستائش کرے۔ وہ ان کو حسنِ محض اور فردوس مکمل پائے گا۔

اور کچھ وسعت تقریر بڑھادے یارب   سننے آتا ہے ہر اک اب مرا افسانہ جدا

اگر اس قدر تصدیع یا زحمت نظر بھی گوارا نہ ہو تو مسز اسٹوارٹ Mrs. C. M. Villiers Stuart کی نہایت دلچسپ ونفیس کتاب "سلاطینِ مغل کے باغات" Gardens of the Great Moghals اور مسٹر نانالال مہتا کے فاضلانہ مقالہ۔ Contribution of Islam to Indian Culture "ہندوستان کے تمدن میں اسلام کی امداد" پر[1] ایک نگاہ ڈال لینا کافی ہوگا نیز پنڈت آنند کول کا دلچسپ رسالہ جو کشمیر کے باقیات ارضی (آثار قدیمہ) کے متعلق ہے اور اُس رسالہ کی تمہید، جو مسٹر وی این مہتا کے مشکبار قلم سے کشمیر کے باغات اور ہندو و مغل، روایات، پر نکلی ہے ملاحظہ طلب ہے۔

ہندوستان کے باغات میں خواہ وہ مسلمان بادشاہوں کے لگائے ہوں یا اُن کے حلقہ بگوش راجا مہاراجاؤں کے، چند خصوصیات ومزیات پائی جاتی ہیں۔ جاننے والے اُن کو بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ اوّلاً ایک مستحکم چار دیواری سے باغ کا محصور ہونا، خواہ مربع ہو خواہ مستطیل عظیم الشان مرتفع پھاٹک، شایانِ موقع، اور کھڑکیاں۔ دوسرے آبیاری وآبپاشی کا خودساختہ وخود اختیاری، دیرپا انتظام، باغ کے اندر بہتی ہوئی نہروں اور دیگر مصنوعی وغیر قدرتی ذرائع سے کیا جانا۔ ان کی تفصیل یوں کی جاسکتی ہے کہ باغ کا پانی کہیں درختوں میں سے ہوکر کہیں آبشاروں کی شکل میں گزرتا ہے کہیں صاف شفاف چادروں میں لپٹا ہوا آتا اور وسیع وعریض حوضوں میں گرتا ہے۔ تزک سے پایا جاتا ہے، کہ شہنشاہ بابر پانی کے بارہ میں بڑی کاوش اور توجہ رکھتا تھا۔ ہندوستان میں رواں پانی کے نہ ملنے کی اُس کو بڑی شکایت تھی۔ جگہ کا انتخاب اُس کا مخصوص واولین نقطۂ نظر تھا۔ اچھے سے اچھا اور بہتر سے بہتر موقع تلاش کرکے اپنی پسند واطمینان کے مطابق پانی کی بہ افراط بہم رسانی

---

[1] مطبوعہ اخبار لیڈر، ۲۴ جنوری ۱۹۳۵ء، صفحہ ۷۔ Archaeological Remains ۲ؔ in Kashmir by Pandit Anand Kaul and its Introduction by Mr. V. N. Mehta.

کا بندوبست کر لیتا، تب کام شروع کرنے دیتا تھا۔[۱]

اسی طرح شاہ جہاں نے جب اپنی استراحت دائمی کے لئے اسی سرزمین آگرہ کو پسند کیا، مہتاب باغ کی بنیاد ڈالی[۲]۔ شاہانہ تعمیرات، تکلفات[۳] و اہتمامات شروع ہوئے، تو پانی کا انتظام مقدم سمجھا۔ کنوؤں کا ایک سلسلہ بنا ڈالا۔ اس کے حوضوں، فواروں کے مقامات، نالیوں اور نہروں کے ساتھ ساتھ تو بڑے بڑے کنوئیں اب تک قائم و برقرار ہیں[۴]۔ ان دو کے بعد تیسرا تھا رنگ و بو کا تناسب اور لطیف امتزاج، حسین و جمیل ترتیب و ترکیبات کے ساتھ اُن کی آراستگی۔ درختوں کے لگانے میں یہ امر مدنظر رہتا تھا کہ طرفۃ العین میں باغ کی ہیئت و حیثیت مجموعی یا اُس کا نقشہ نگاہ کے سامنے آجائے۔ باغ کے تمام حصے اور ٹکڑے مربع اور بجائے خود مکمل ہوتے تھے۔ گرداگرد نہریں رواں ہوتیں ہر قسم کے پھلوں کے درخت بکثرت ہوتے تھے، بالخصوص ایوانوں کے قریب۔ بہشت بریں کی نقل یا قدرتِ مطلق کے عمل کی تبعیت و تقلید میں ان نمونۂ بہشت باغوں کے حصے بھی آٹھ رکھے جاتے تھے۔ یہ تعداد اگر کسی وجہ سے پوری نہ ہو سکتی، تو بھی مساوی و یکساں حصوں میں تقسیم کیا جانا لابد تھا۔

باغ کے وسط میں ورنہ کسی دوسرے موزوں محل پر ایک نفیس و خوبصورت بارہ دری یا کوشک کا تعمیر کیا جانا آرائش و آسائش کے لئے ناگزیر تھا۔ برسات میں اور گرمیوں میں بالخصوص، بیگمات اور شہزادیاں، سلاطین اور شہزادے اس بارہ دری میں، یا باغ کے سایہ دار ٹھنڈے ٹھنڈے مرمریں چبوتروں پر استراحت فرماتے، گرمی کی تپش و کلفت دور کرتے۔ نہروں کا خوشگوار، شیریں پانی کوثر و تسنیم کی طرح دنیاوی و فانی حوضوں سے نشاط انگیزیوں کا ضامن ہوتا، سیلِ آب اور فرحت بخش تموج لطف اندوز کرتا۔ فتح مند جنگ آزما بڑے بڑے معرکے جھیل کر سفر و تعب اور تحملِ مشاق و مصائب کے بعد سکون و راحت کا ٹھکانا یہاں پاتے۔ سرو و شمشاد کے درخت اپنے نیچے خوشنما زمردیں کیاریوں میں مختلف قسم کے پھولوں اور خوشبو غنچوں کو اکٹھا کر کے ایک فرشِ رنگ و بو بچھا دیتے۔

---

[۱] کین صاحب کی آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۸۷۔

[۲] تاریخ تاج وغیرہ از منشی معین الدین احمد، صفحہ ۵۴ و آگرہ کی ہینڈ بک، مؤلفہ کین صاحب، صفحہ ۱۸۸۔ [۳] منشی صاحب اسی تاریخ تاج (انگریزی) میں لکھتے ہیں کہ آگرہ کی اور شاہی عمارات کی طرح اس مہتاب باغ کی قیمتی چیزیں اور پتھر، جاٹوں نے ڈیگ اور بھرت پور بھیج دئے تھے۔ جو بچ رہے تھے بیچ ڈالے تھے۔ (صفحہ ۱۱۰)۔ [۴] تاریخ مذکور، صفحہ ۱۱۱۔ آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۲۰۵۔

قدرت کا رنگ و نور جلوہ فرما ہوتا۔ نکہت بیز کیف آور نسیم و صبا سے، تھکا ہوا دماغ معطر و تازہ ہو جاتا۔ سبزہ و گُل کے تختے نگاہ کو شاداب کر دیتے۔

مست کر دیتی ہے مجھ کو فصلِ گُل میں بوئے گُل — وجد میں لاتی ہے حالت سبزہ و اشجار کی
بھینی بھینی ہائے وہ نارنج کے پھولوں کی بو — جس پہ سو جانیں فدا ہوں طبلۂ عطار کی

دور کیوں جائیے۔ اپنے ہی صوبہ (متحدہ) میں ہندوستان کے پُرانے پایۂ تخت آگرہ کو دیکھیے۔ اس گئی گزری حالت میں بھی بہت سے باغات یا مٹے ہوؤں کے نشانات و آثار ملیں گے۔ (۱) آرام باغ[۱]، جو چار باغ سے ایک میل کے قریب جمنا کے ادھر ہے۔ مشہور ہے کہ بابر کے عہد میں لگایا گیا تھا۔ (۲) باغِ خانِ عالم[۲] (مرزا برخوردار) جو اکبر و جہانگیر کا معتمد اور مقرب امیر تھا۔ (۳) اعتماد الدولہ کے روضہ کا تین سو برس سے زائد ہوئے، نور جہاں نے لگایا تھا۔ (۴) مہتاب باغ، جس کو شاہ جہاں نے اپنی پسِ مرگ راحت کے لئے تجویز اور بنا کیا تھا[۳]۔ (۵) بہشت آباد سکندرہ کو ملاحظہ کیجئے۔ جس کا باغ اور صحنِ پیش باغ، جو تاروں سے گھرا ہوا ہے اور محفوظ ہے (اس قسم کے احاطے اور اضافے پُرانی دفتری اصطلاح میں "خاربندی" کہلاتے تھے)۔ محکمہ باغات کی تازہ ترین سرکاری رپورٹوں[۴] میں اس کا رقبہ ۵۰ر۱۰۱ ایکڑ لکھا ہے۔ مسٹر ڈنکن انجینیر ۱۲۳ ایکڑ کہتے[۵]، کرنیل ہیویل ۱۵۰ ایکڑ بتاتے ہیں، اور اس کی سنگین دیواروں کو چوبیس فیٹ بلند[۶]۔ منشی معین الدین باغ کی وسعت ڈیڑھ سو ایکڑ اور اُس کے جنوبی پھاٹک کی رفعت ستر فٹ سے زائد تحریر فرماتے ہیں[۷]۔ اس میں شک نہیں کہ اس پنج منزلہ عمارت کی

---

۱ عہد بابری کی یادگار اور آرام گاہ ہے۔ ہمایوں کا قیام بھی یہاں رہا تھا۔ منشی معین الدین کی تاریخ تاج، صفحات ۱۰۷ لغایۃ ۱۰۹۔

۲ اکبر، جہانگیر کا شجاع امیر، سپہ سالار اور سفیر تھا۔ شاہ جہاں نے ششش ہزاری منصب پر سرفراز کیا تھا۔ تاریخ تاج انگریزی از منشی معین الدین، صفحات ۹۷ لغایۃ ۱۰۰۔ ۳ تاریخ مذکور، صفحات ۱۱۰ و ۱۱۱ مآثر الامراء جلد اول، صفحات ۳۲ لغایۃ ۳۶۔ وبیلس ڈکشنری، صفحہ ۱۴۷۔ آگرہ ہینڈ بک مرتبہ کین صاحب صفحہ ۱۰۰۔ جنرل کننگھم اور مسٹر کارلیل Carlleyle نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ۴ صوبہ جات متحدہ کے سرکاری باغات کی رپورٹ، بابتہ سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء، ص ۱۱۔ ۵ آگرہ ہینڈ بک، ص ۲۱۵۔ ۶ آگرہ میں تین دن، صفحہ ۱۸۳۔

۷ تاریخ تاج وصنادید آگرہ (انگریزی)، صفحہ ۱۳۸۔

تکمیل کی نوبت ۱۶۱۳ء میں جہانگیر کے ہاتھوں پہنچی[۱]، اور اس نے ایک مرتبہ اس کا پورا نقشہ بھی بدل دیا تھا[۲]۔ مگر دراصل اکبر ہی[۳] نے اپنا مقبرہ اپنی زندگی میں تعمیر کرانا شروع کیا تھا[۴]۔ بے موقع سہی تاہم یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ تین ہزار سے زیادہ آدمی دس[۵] سال تک روزانہ لگے رہے[۶]۔ پندرہ لاکھ سے زیادہ صرف ہوا[۷]۔ یہ عمارت ہندوؤں کے طرز تعمیر سے مشابہ ہے، اور اس وسیع و عریض کشور کی تمام تعمیرات میں ہندوستانی وضع و شان کی نمود کے لحاظ سے بے مثل و بے نظیر مانی جاتی ہے۔ جہاں گرد سیاح مسٹر سُوارڈ W. H. Seward کا بیان ہے کہ یہ یادگار چوبیس[۸]

---

۱ تاریخ جہانگیر، از پروفیسر بینی پرشاد، صفحہ ۷۷، و تاریخ تاج از منشی معین الدین، صفحہ ۱۳۸۔ ۲ آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۲۱۴ بحوالہ تزک جہانگیری۔ ۳ مسٹر ڈبلیو ایچ سوارڈ کا دنیا کے گرد سفر، صفحات ۲۲۴ و ۲۲۵ Travels Around the World by W. H. Seward ۴ کین صاحب کی آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۲۱۴ و بیل صاحب کی اورینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری، صفحہ ۱۳۔ نیز سر ٹامس ہربرٹ کی تحریر Sir Thomas Herbert جنھوں نے ۱۶۲۶ء (عہد جہانگیری) میں اس کو دیکھا تھا۔ حال کے اکثر تاریخ نویسوں کی روایت یہ ہی ہے۔ لیکن موجودہ کتبوں اور تزک جہانگیری یا اسی عہد کی کسی فارسی تاریخ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی کہ اکبر نے اپنے مقبرہ کی بنیاد خود ڈالی تھی اور بہشت آباد نام بھی خود رکھا تھا۔ جہانگیر نے سنہ ۳ جلوس کے سوانح میں اس کی تعمیر کا حال لکھا ہے، نیز دیگر ترمیمات و اصلاحات و تصرفات جدیدہ کا، جو سنہ ۱۳ تک وقوع میں آئیں۔ البتہ اقبال نامۂ جہانگیری (صفحہ ۳۵) میں بہشت آباد روضۂ اکبر، اور پندرہ لاکھ روپیہ خرچ اور بعض ترمیمات تعمیر کا مذکور ہے۔ ۵ ڈنکن صاحب انجینیر لکھتے ہیں کہ آج کل کے حساب سے مصارف تعمیر کا اندازہ نوے لاکھ ہوتا ہے۔ ۶ کپتان ولیم ہاکنس Captain William Hawkins نے چودہ سال لکھے ہیں، جو ۱۶۰۸ء سے ۱۶۱۱ء تک آگرہ میں رہے تھے۔ ۷ تاریخ جہانگیر، ص ۷۷۔ نیز تحریر کپتان ولیم ہاکنس۔ ۸ تاریخ تاج، صفحہ ۱۳۸ و تزک جہانگیری، مطبوعہ علی گڑھ، صفحہ ۳۔ ۹ مصر کے تین منارے یا اہرام بہت زیادہ مشہور ہیں۔ یہ اہرام فراعنۂ مصر کی خوابگاہیں یا مقبرے ہیں، جن میں کبھی حنوط کی ہوئی لاشیں رہتی تھیں، جو اب یورپ کے عجائب خانوں کی زینت ہیں۔ یہ قدامت دراز کے باعث سے اہرام (پیران کہن سال) کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے چیوپس سب سے زیادہ شہرت رکھتا ہے۔ اس کے دو تلفظ اور بھی ہیں، یعنی آپس اور کیوپس۔ یہ ہی "ہرم اعظم" یا "ہرم اکبر" کہلاتا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۴۶ پر)

Cheops کے صندید سے بھی زیادہ قابلِ تحسین[۱] ہے۔

مقبرہ، اللہ اکبر! کیا عظیم الشان ہے — آستانہ پر جلالت آج تک دربان ہے

افسوس ہے کہ ۱۶۹۱ء میں جاٹوں کی وحشیانہ دست بُرد سے یہ بھی نہ بچی[۲] اور اس کا احترام اور پاکی کا لحاظ نہ کیا گیا۔

اس بارہ میں نکولا منوچی صاحب N. Manucci (ترجمہ مسٹر آیروین) پنڈت ایشر داس[۴] ناگر کی "فتوحاتِ عالمگیری" کا اپنے نوٹ میں حوالہ دیتے ہیں[۵]۔ مگر میرے سچے اور اچھے منوچی! تمھارے یقین دلانے سے کون ہندوستانی باور کرے گا کہ واقعی جاٹوں نے اکبر کی ہڈیاں باہر نکال کر پھینک نہیں، پھونک دی تھیں۔ وہ جیتے جی ہندؤں کے اکثر شعائر و رسوم کو مانتا، اور اُن کا ادب کرتا تھا۔ اگر تمھاری روایت سچ ہے تو مان لیجئے کہ اُس کی رہی سہی بعد مرگ کی آرزو بھی جاٹوں کی بدولت پوری ہوگئی۔ یہ صحیح ہے اور ڈاکٹر فوہرر بھی اپنی کتاب

بقیہ صفحہ (۴۵) رفعت و وسعت میں لاجواب ہے۔ خوبصورتی و عمدگی میں اس درجہ ممتاز ہے کہ ہفت عجائبِ عالم میں شمار ہوتا ہے۔ دریائے نیل سے پانچ میل اور مقام جیزہ کے سامنے دس میل پر شہر ممفس کے قریب واقع ہے۔ اس کو ملک خوفو فرعونِ مصر نے تعمیر کیا تھا، جو کم از کم حضرت عیسیٰ سے ۲۹۰۰ سال پیشتر گزرا ہے۔ بعض اس کا زمانہ اس سے بھی ایک ہزار برس پہلے بتاتے ہیں۔ سنگ خارا کے دو سو تین چبوترے نیچے اوپر بنا کر تعمیر کیا گیا ہے۔ سب سے نیچے کے چبوترہ کا ہر ضلع ۷۶۳ فیٹ لمبا اور چار فٹ آٹھ انچ بلند ہے۔ سب سے اوپر کے چبوترہ کا ہر پہلو تیس فٹ لمبا ہے۔ اس میں بڑے بڑے پتھر لگے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا پتھر تیس فٹ طول میں ہوگا۔ پتھروں اور دیواروں پر کتبے کھُدے ہیں گویا تاریخی واقعات کا مرقع ہے۔ چیوپس کی بلندی زمین سے لے کر چوٹی تک ۴۵۶ فٹ ہے۔ زمین پر کھڑے ہوکر دیکھنے سے چوٹی کی سطح ایک نقطہ کے برابر معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ اُس کی پیمائش بھی دس گز مربع ہے۔ اُس کی کرسی ساڑھے سولہ بیگہ زمین گھیرے ہوئے ہے۔ عربی کی مشہور و جامع کتاب "مستطرف" میں اس کے بانی کا نام سورید بن سراق بن سریاق لکھا ہے۔ محاضرات الادبا، مطبوعہ مصر، جزو ثانی، صفحہ ۲۶۵ بھی ملاحظہ طلب ہے۔ یہ تفصیل اس لئے لکھ دی گئی تاکہ آپ اپنے ملک و وطن کی ایک عمارت کا اس اعجوبۂ عالم سے مقابلہ کر سکیں اور اُس پر ایک جہاندیدہ غیر ملک و قوم کے سیاح کا فضیلت دینا!۔

صفحہ ہٰذا: [۱] دنیا کے گرد سفر، صفحہ ۲۳۵-۴۴۔ Travels Around the World [۲] تاریخ جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرشاد، ص ۷۷۔ [۳] آگرہ ہینڈ بک صفحہ ۲۱۹۔ [۴] ایشور داس مورخ، صفحہ ۱۳۳۔ [۵] منوچی مترجمہ آیروین صاحب Mr. William Irvine جلد اول، صفحہ ۱۵۹ و جلد دوم، صفحہ ۳۲۰۔

"آثار قدیمہ اور کتبات[1] میں تسلیم کرتے ہیں کہ[2] مقبرہ کا بالائی حصہ کھلا ہوا ہے، آسمان کا نیل گوں چتر اوپر۔ اس لئے پہلے اس پر کمخواب اور سونے چاندی کے ستونوں کا زرتار و زرکار شامیانہ سایہ گستر رہتا تھا۔ یہ چبوترے پر آویزاں کیا جاتا۔ ارد گرد کے تمام شہ نشینوں اور صحنچیوں میں اسی شان و اہتمام کے قیمتی پردے اور چلمنیں ہر طرف لٹکتی تھیں۔ ان کو اور بہت سی قیمتی اشیاء، و اسباب و زیورات کے ساتھ راجہ جواہر سنگھ جاٹ اُڑا لے گیا۔ اسی جواہر سنگھ نے سنگ مرمر کے تختے اور منقوشات اُکھاڑ کر ڈیگ کو بھیج دئے تھے۔" سُن، اے زبردست راجا سُن!!

ایک بیکس کی لحد سے یہ صدا آتی ہے ۔۔۔ یاد کر میری محبت کو، مجھے یاد نہ کر

مسٹر کین اور مسٹر ڈکنن نے بھی اس واقعہ کا دردناک ماتم کیا ہے[3]۔ [مقبرۂ خسرو کے چھپر کھٹ، شامیانے اور آرائشوں کے غائب ہونے کا ذکر اپنے موقع پر آئے گا۔]

باز آمدم آئیے، اور باقی آس پاس کے شاہی وقت کے بعض باغات اور مقبروں کی اراضی[4] و وسعت کو بھی ملاحظہ فرما لیجئے۔

آگرہ کا رام باغ بیس ۲۰ ایکڑ ۔۔۔ دراصل آرام باغ (نور افشاں) کا رقبہ ۱۳ بیگہ ۴ بسوہ پختہ یعنی ۸ ایکڑ ۳ روڈ ۳۲ پول ہے۔[5]

" اعتماد الدولہ ۳۳ر۷ ایکڑ

" تاج کا باغ اور اس کا مربع اکیس ایکڑ۔ مولوی سعید احمد مارہروی اس باغ کا رقبہ ۴۲ بیگہ پختہ تحریر فرماتے ہیں جو ۲۶ ایکڑ ۲ روڈ ۹ پول کے برابر ہوتا ہے۔[6]

اس کے بعد الٰہ آباد کو لیجئے، جس کے الفریڈ پارک نے حسب اندراج ڈسٹرکٹ گزیٹیر[7] ماہ ۱۳۳ ایکڑ ایک

---

[1] ممالک مغربی و شمالی و اودھ، صفحہ ۷۶۔ [2] آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۲۱۹۔ جاٹوں اور مرہٹوں کی لوٹ اور بعض انگریز حکام، جنرلوں اور گورنروں کی دستبرد کا بھی اس کتاب میں جا بجا ذکر آیا ہے۔ صفحات ۲۶۵، ۲۱۵، ۸۴، ۱۱۵، ۱۱۹، ۱۹۵، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۷ نوٹ، ۱۲۹، ۷۸، ۱۔ [3] رپورٹ انتظام باغات سرکاری، بابتہ ۳۰-۱۹۲۹ء، صفحات ۱۰ و ۱۱۔ [4] مرقع اکبرآباد یعنی تاریخ آگرہ، صفحہ ۲۴۔ [5] مرقع اکبرآباد یعنی تاریخ آگرہ، صفحہ ۸۵ نوٹ۔ [6] گزیٹیر سابق مطبوعہ ۱۸۸۴ء، صفحہ ۷۱۔ نیز[7] ٹامس ٹیبل رپورٹ، صفحہ ۲۱۵۔

روڈ ۹ء ۱ ہے اور بروے رپورٹ[1] سالانہ ۲۵ء ۱۸۸ ایکڑ رقبہ پایا ہے۔ مگر یہ بعدِ انقلاب کی عالی ہمتی اور وسیع حوصلگی تھی، یا حقیقتاً[2] اُن بدنصیب مسلمانوں کی یادگار، جنھوں نے ناعاقبت اندیشی سے سرکار انگریزی سے بغاوت کی۔ الزامات کہ براست۔ اس کی پاداش میں اپنے علاقہ و جائداد سے محروم ہوئے۔ گاؤں ویران کر دئے گئے۔ گھروں پر گدھے کا ہل چل گیا۔ البتہ دس بارہ برس بعد شاہزادۂ عالی تبار ڈیوک آف ایڈنبرا[3] کی بدولت ملنے والوں کو یہ فخر کرنے کا موقع ملا۔

نہ ہو قناعت شعار گلچیں، اسی سے قائم ہے شان تیری
وفورِ گل ہے اگر چمن میں، تو اور دامن دراز ہو جا

یہ تو زبانی اور مقامی روایات تھیں۔ سرکاری گزٹیر[4] کا بیان ہے کہ "جب ڈیوک نے اپنے قدموں سے سرزمین پریاگ کو عزت بخشی تو اس مبارک واقعہ کی یادگار میں ۱۸۷۰ء میں، اس پارک کی بنیاد ڈالی گئی۔ پہلے یہاں چھاؤنی تھی، مگر اس کی آب و ہوا ناقص اور خراب رہتی تھی۔"

یہ بھی ایک قابلِ آشکار حقیقت ہے کہ جس سال ایک حقیر متنفس یعنی راقم سطور[5] نے اس عالمِ آب و گل میں قدم رکھا تھا، اُسی سال اس نُزہت گاہ نے صفحۂ ہستی کو اپنے ظہور سے رونق بخشی تھی۔

خسرو باغ[6] کی بلند اور چوڑی چکلی مضبوط چار دیواری جو اس بڑے اور فراخ مربع[7] رقبہ کو گھیرے ہوئے ہے جہانگیر کے حوصلہ اور سلیقۂ تعمیر کی یادگار ہے۔ باغ کے ہر طرف پختہ سڑک کافی وسیع موجود ہے۔ مقامی روایات اور سٹربل کی تحریر[8] سے پایا جاتا ہے کہ یہ عظیم و عریض سنگین احاطہ، عہدِ شاہزادگی میں جہانگیر کے حکم سے قلعہ کے باقی ماندہ[9] مصالح سنگ و خشت اور چونے سے بنا تھا۔ مسلمان مورخ اس بارہ میں قطعاً خاموش ہیں۔ ایک باغی شہزادے کی،

---

[1] رپورٹ سالانہ باغات سرکاری بابتہ ۳۰-۱۹۲۹، صفحہ ۹۔ [2] گزٹیر سابق مطبوعہ ۱۸۸۴ء، صفحہ ۱۷۷۔ [3] گزٹیر سابق، مطبوعہ ۱۸۸۴ء، صفحہ ۱۷۷۔ [4] کلامِ منظور ملقب بہ مقبولِ احمد، مطبوعہ فتح گڑھ، ۱۲۹۰ھ، صفحہ ۲۰۲۔ [5] گزٹیر سابق، مطبوعہ ۱۸۸۴ء، صفحہ ۱۶۵۔ [6] ڈاکٹر فوہرر کی تاریخ یادگارہائے قدیمہ اور اُن کے کتبات، جلد دوم، صفحہ ۱۳۰۔ [7] مفتاح التواریخ، صفحہ ۳۲۵۔ [8] تاریخِ جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرشاد، صفحہ ۳۴۰۔ — پریاگ یا الہ آباد کی ہینڈ بک، مرتبۂ ماڈرن ریویو آفس، صفحہ ۵۰۔ [9] مفتاح التواریخ، صفحہ ۳۲۵۔

اگرچہ تقدیرات ایزدی سے وہ بعد کو شہنشاہ ہوگیا تھا، اُس کے عالمِ شباب کی سرمستی، شوریدہ سری اور سرکشی کی کسی مستقل یادگار کا اپنی کتاب میں ذکر کرنا زمانہ شناس جاہ طلب اہلِ قلم کی شان کے منافی اور اُس کے مقاصد کے سراسر مغائر تھا اور آئینِ مصلحت بینی کا ناقابلِ عفو سیاسی جرم۔

یہ ڈر لوگوں پہ غالب ہے کہ حالت میری ظالم سے سُنی کا ذکر کیا آنکھوں کی دیکھی بھی نہیں کہتے

اُس زمانہ کے یورپین سیاحوں کے نزدیک بھی یہ جگہ محض آنے، دیکھنے اور گزر جانے کی چیز رہی ہو گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سراپردگیان عصمت و عفاف سلطانی کی اقامت کی وجہ سے بے چاروں کا گزر بھی یہاں نہ ہونے پاتا ہو۔

ایک مشہور روایت یہ ہے کہ خسرو باغ سے قلعہ تک اندر اندر جانے آنے کے لئے زمین دوز راستہ بنا ہوا تھا۔ شاہزادۂ خسرو کی قبر کے قریب کی ایک کھڑکی اُس کا دہانہ بتائی جاتی ہے۔ یہ روایت خواہ کیسی ہی مقبولِ عام اور دیرینہ کیوں نہ ہو، مگر اس کی تصدیق نہ تو کسی تحریر سے ہوتی ہے، نہ پیرانِ کہن سال سے۔ نہ اُس کے نشان و آثار نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آگرہ و دہلی کی بعض عمارات کی طرح یہاں کے متعلق افواہ کی بھی کچھ بنیاد یا اصلیت رہی ہو مگر مجھے تو خسرو باغ کے اندر اور باہر ہر طرف گھوم پھر کر دیکھنے اور توجہ و غور کرنے سے کسی گہرے سُرنگ یا اندر اندر دور تک جانے والے راستہ کا پتہ اس وقت تک نہیں چلا۔

بحالت موجودہ یہ فرح بخش و مسرت خیز باغ ایشیا اور یورپ دونوں کے کمالِ فن اور باغبانی و چمن آرائی کا نفیس اور ستھرا نمونہ ہے۔ ایک طرف لہلہاتے ہوئے[1] شاداب و سرسبز قطعات بابر اور جہانگیر کی تختہ بندی اور گلکاریوں کی یاد دلاتے ہیں۔ دوسری طرف صنّاعانِ فرنگ کی ہنرمندی اور طرزِ جدید کی نظر فریب نخلبندی و سبزہ کاری و مرغزاری کے نمونے پیش کرتے ہیں۔ ان سب پر مستزاد واٹر ورکس کے لمبے چوڑے خوش قطع تالاب ہیں، جو صاف و شفاف اَمرت (پانی) سے لبالب بھرے ہوئے بہشتِ بریں[2] کی پاک و پاکیزہ نہروں اور حوضوں کی طرح موجیں مارتے اور باشندگانِ شہر و مضافات کے لئے آبِ خضر و آبِ حیوان کا کام دیتے ہیں۔

---

[1] پریاگ یا الہ آباد کی ہینڈ بک، مطبوعہ ماڈرن ریویو آفس، صفحہ ۵۰۔

[2] جوئے شہد و شیر و جوئے بادہ ہم دار د بہشت کفرِ نعمت ہاست تنہا دل بہ کوثر داشتن

ہمارے صوبہ کے نامور اُستاد اور انشا پرداز پنڈت منوہر لال زوتشی نے عہدہ دارانِ تعلیم کی مجلس میں اُن کی ضروریات و فرائض پر توجہ دلاتے ہوئے فرمایا تھا کہ "الہ آباد کے کتنے ایسے معلم ہیں جو خسرو باغ جاتے ہیں، جو عہدِ مغلیہ کی نہایت دلچسپ باقیات سے ہے۔ جو اُس کو دیکھتے اور اُس کی خوبصورتی سے لطف اُٹھاتے ہیں۔" [1]

زیرک و فرزانہ سیاح جو ابھی قلعۂ معلّٰی سے، وہ اکبری ایوان اور جہانگیری قصر جن میں تین سو سال کے قریب تیمورِ [2] صاحب قران کی آل اولاد اقامت پذیر و راحت گزیں رہی تھی، دیکھ کر آرہا ہے۔ انسانی فطرت کے اقتضاء اور کارگاہِ عالم کے مشاہدہ و تجربہ سے اُس کے دل میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے۔ وہ بے اختیار پوچھ اُٹھتا ہے۔

اے اہلِ شہر! مدفنِ ایں دودماں کجاست　　　　خاکم بہ فرق، خوابگہِ خسرواں کجاست؟

غریب الدیار کچھ جواب پاتا اور اُسی پتہ پر چل دیتا ہے۔ وہ قلعہ یا پورب کی سمت سے آرہا ہے۔ شہر کے باہر پرانے قبرستانوں، پھر شہر کے کچھ قدیم اور مقابلتہً کم آباد و بے رونق محلّوں سے گزرتا ہے۔ پھر شاندار و فلک بوس محلّات، اور لکھ پتی مہاجنوں کی کوٹھیوں اور دولت مند تاجروں کی دُو رویہ دُکانات، سیٹھ ساہوکاروں کے مالا مال ایوانات دیکھتا جا رہا ہے۔ بڑی اور خوب چوڑی و سیع سڑک سے کوتوالی پولیس اور متنوع و مختلف امراض اور شکایتوں کے متعدد شفاخانوں کے سامنے سے ہوتا ہوا ضلع آباد کے بڑے اور فراخ و کشادہ احاطہ میں داخل ہوتا ہے۔ جس کو اُنیسویں صدی مسیحی کی کاروباری و منتظم حکمران جماعتوں نے روپیہ کی ضرورت اور آمدنی کے لالچ سے ایک بڑے بازار یا بالفاظ [3] پروفیسر بینی پرشاد "مچھلی بازار" کی شکل میں منتقل کر رکھا ہے۔ اُسکے دونوں جانب بھاری بھاری پھاٹک موجود ہیں۔ پچھم والے پھاٹک کا کتبہ خود شاہد ہے [4] کہ اس کی تعمیر جہانگیر کے حکم سے ہوئی تھی۔

---

[1] اخبار لیڈر، ۸ر جنوری ۱۹۳۳ء۔ [2] ہندوستان کے مغل بادشاہ براہِ راست تیمور یا تمرلنگ کی نسل سے مانے جاتے ہیں جو فاتحِ ہند تھا، لیکن دراصل اُس کے پر پوتے بابر کو یہ خیال سب سے پہلے پیدا ہوا تھا کہ اُس نے اپنے ممالک و جاگیرات کو جو ازبک تاتاری (عرف توران) میں واقع تھیں چھوڑ کر اُس سے کم دشوار و زیادہ راحت بخش ہندوستان میں قیام اختیار فرمایا۔ [3] تاریخ جہانگیر، صفحہ ۳۴۰۔ [4] ڈسٹرکٹ گزیٹیر قدیم، صفحہ ۱۶۶۔ جدید، صفحہ ۲۰۲۔

بفرمانِ شہنشاہِ جہانگیر　　　　کہ زیبد ملکش از مہ تا بماہی
بناشد ایں سرائے آسماں قدر　　　　[کہ باد آباد خلد آباد شاہی]

آبادی شہر کا یہ حصّہ "خلد آباد" اِسی مناسبت سے کہلاتا ہے۔

چوتھے مصرع کے "باد آباد خلد آباد شاہی" سے عدد ۹۰۵ نکلتے ہیں۔ اگر "ک" کے عدد بیس اور اضافہ کر لئے جائیں جو فن تاریخ گوئی میں مذموم ہے تو ۹۹۵ ہو جائیں گے یہی خسرو کا سال ولادت ہے۔ اور "ہ" کے پانچ ملا کر ایک ہزار۔ جہانگیر اُس وقت تک نہ شہنشاہ ہوا تھا، نہ ملک کا حکمرانِ مطلق تھا۔ البتہ آگے چل کر باپ سے باغی و طاغی ہو کر اُس نے تمام شوکت و شانِ ملوکانہ[1] اختیار کر لی تھی۔ ممکن ہے کہ اسی رعایت سے یہ قطعہ کہا گیا ہو۔ [خلد آباد کا مزید تذکرہ اور اس نام کے متعلق بحث "مقبرۂ خسروؔ" کے ذیل میں کی جائیگی]

گرینڈ ٹرنک روڈ[2] یعنی بادشاہی عہد کی بڑی سڑک بھی خلد آباد[2] کے اندر سے ان ہی پھاٹکوں میں

۱؎ اکبر اور سلطنت مغلیہ کا عروج، از کرنیل می لیسن Malleson، صفحہ ۲۳۸؛ مطبوعہ آکسفورڈ، ۱۹۱۸ء۔ و۔ تاریخ جہانگیر، از گلیڈون، صفحہ ۹۔ و۔ گزیٹیر جدید، صفحہ ۱۶۹۔ ۲؎ شارع اعظم یا گرینڈ ٹرنک روڈ، شیر شاہ بانی سلطنت افغانیہ کی یادگار ہے۔ مورخین اس کا عہد دولت شوال ۹۴۸ھ (جنوری ۱۵۴۲ء) سے ربیع الاول ۹۵۲ھ (مئی ۱۵۴۵ء) تک شمار فرماتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس نے اٹھارہ سال میں اپنی سلطنت کا باغ آباد کیا تھا۔ پانچ برس سے کم اُس کا لطف اُٹھایا۔ اسی حال میں بنگالے سے لے کر رہتاس (پنجاب) تک کہ چار مہینے کی مسافت تھی اور آگرہ سے لے کر منڈو (شادی آباد، دار الامارۃ مالوہ) تک پختہ سڑکیں بنوائیں۔ اُن پر ڈاک چوکیاں بٹھائیں۔ خود پنجاب میں ہوتا تو بھی بنگالہ کی رپوٹیں اور خبریں اُس کو دوسرے دن پہنچ جاتی تھیں۔ عوام کی آرام کے لئے تین ہزار میل تک سڑک کے دونوں طرف آم اور کھرنی کے سایہ دار میووں سے لدے ہوئے درخت لگے تھے۔ کوس کوس بھر پر پختہ مسجدیں، کوئیں اور سرائیں موجود تھیں۔ ایک دروازے پر ہندو دوسرے پر مسلمان تعینات تھے جو وارد و صادر کو پانی پلاتے اور ہر قسم کی راحت پہنچاتے تھے۔ غریب مسافروں کے لئے دونوں وقت لنگر جاری رہتا تھا۔ انتظام و حفاظت کا یہ حال تھا کہ راستوں پر ایک بڑھیا بھی سونا اُچھالتی چلی جاتی تھی۔ جہاں چاہتی، اپنا مال و متاع رکھ کر سو جاتی۔ چور یا رہزن کی مجال نہ تھی کہ کبھی نیت میں فتور آجائے۔ (بیل صاحب کی ڈکشنری، صفحہ ۲۵۸۔ و۔ مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۲۷۔ و۔ دربار اکبری صفحہ ۱۵)۔ لیکن

(باقی صفحہ ۵۲ پر)

میں ہوتی ہوئی جاتی ہے۔ بحالت موجودہ یہ سڑک پھاٹک کی اصلی سطحِ ارضی یا فرش آستان سے نمایاں طور پر اونچی ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ دروازوں کی ابتدائی اور نظر پسند، بلندی میں اتنی ہی کمی ہوگئی ہے۔

خلد آباد کے یہ دونوں پھاٹک کم و بیش اب بھی اپنی اصلی حالت میں برقرار ہیں۔ ایک شرقی، باغ کے داہنے یعنی شہر و قلعہ کی طرف۔ دوسرا غربی، جو بائیں کو یعنی فتح پور، آگرہ و دہلی کی جانب ہے۔ یہ دُہری ڈاٹوں پر محرابی بنائے گئے تھے۔ ان کے بیرونی سمت یا بغل میں وہ اضافے بھی ہیں، جو بعض مقامات میں ڈیوڑھی اور بعض جگہ گھونگھٹ کہلاتے ہیں۔ ایک حصہ میں دوسرے سے گنجایش زیادہ ہے پتھر کے موٹے موٹے ٹکڑوں اور ڈھیلوں کو نہایت مضبوط اور دیرپا بنانے کے لئے چونے کی موٹی موٹی تہوں میں جڑا اور پیوست کر دیا ہے مگر اب ان میں شکستہ حالی نمودار ہے۔ جوڑ کھلتے جاتے اور ایک دوسرے کو چھوڑ رہے ہیں۔ بڑی بڑی جھاڑیاں اور اچھے خاصے درخت اُن پر کھڑے ہیں۔ گھانس بھی جمی ہوئی ہے۔ سارا بالائی حصہ سبز پوش اور پیپل زار بنا ہوا ہے۔ سڑک کے رفتہ رفتہ بلند ہوتے جانے سے اُن کی اونچائی میں بھی واضح فرق ہوگیا ہے۔ بادی النظر میں محسوس ہوتا ہے کہ باہر والا یعنی پچھم طرف کا دروازہ شہر کی طرف والے سے اونچا تو کسی قدر کم مگر چوڑا کچھ زیادہ ہوگیا ہے۔

ان دونوں پھاٹکوں پر خوبصورت، ہلکی پھلکی، کھلی ہوئی بُرجیاں (گلدستہ نما) دونوں طرف ایک ایک بنی ہیں مگر چاروں شکستہ اور بوسیدہ ہو رہی ہیں۔ پتھر نکل گئے ہیں۔ جھالر اور چھجوں کے تختے گر رہے ہیں۔ شہر والے دروازہ پر کوئی تحریر نہیں ہے۔ نہ ان دونوں میں سے کسی پر نقش و نگار یا اہتمام آرایش و تکلف کیا گیا تھا۔

خلد آباد کی سرا کا اصلی (آبادی کی سمت کا) پھاٹک اب باقی نہیں رہا۔ یہ باغ کے پھاٹک کے بالکل مقابل واقع تھا اور اُسی طرز و شان کا تعمیر ہوا تھا۔ کب گرا اور کیسے؟ چشم دید تو بوڑھے بوڑھے آدمی بھی نہیں بتا سکتے۔ اپنی یاد سے پہلے کی بات سُنی سُنائی کہتے ہیں کہ ہنگامۂ بغاوت کے فرو یا دربیش ہونے کے وقت باغیوں کے استیصال کے لئے فوجی و جنگی ضرورتوں یا مصلحتوں سے حکومت نے دستِ شفقت پھیرا تھا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ایسی بلند و

(بقیہ صفحہ ۵۱)
شیر شاہ سے پہلے بھی مسلمان بادشاہوں کو اس قسم کا شوق رہا ہے۔ سکندر لودی نے ۹۱۵ھ/۱۵۰۹ء میں آگرہ سے دھولپور تک منزل بہ منزل محلات اور باغات تعمیر کرائے تھے۔ (دربار اکبری، ص ۵۹۸۔ نیز اویماق مغل، صفحہ ۲۶۸)۔ ؎ ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، جلد ۲۳، صفحہ ۱۱۔ صفحہ ہٰذا: ؎ ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، جلد ۲۳، مطبوعہ ۱۹۱۱ء۔ صفحہ ۲۰۲۔

مستحکم عمارت کا گر جانا یا گرایا جانا آسان نہ تھا۔ بہر صورت

آپ کا تھا گناہ گار، میں نہ کہ ابر و باد کا   میرا مزار تھا جہاں، اب وہ زمین صاف ہے

شاید دُنیا اور اہل دنیا کا یہی دستور چلا آیا ہے۔ کلکٹری متھرا کی عمارت جس مقام پر بنائی گئی ہے یہاں جمال پور کا مشہور زبردست ٹیلا تھا۔ اور اس پر ایک چھوٹی سی مسجد بھی تھی۔ جس کی بدولت یہ جگہ ہمیشہ انہدام و بربادی سے محفوظ رہی تھی۔ لیکن بغاوت کے زمانہ میں فوجی اغراض سے یہ مسجد گرا دی گئی۔ اور بعد کو بنیادیں کھودنے پر ظاہر ہوا کہ مسجد بھی کسی تباہ شدہ مندر کے خرابہ پر تعمیر ہوئی تھی[1]۔

مگر اس دروازہ کے انہدام کے متعلق کوئی تحریر یا سند نہیں پائی جاتی۔ اس وقت یہ جگہ ایسی ہی صاف و ہموار ہو رہی ہے کہ کسی عظیم الشان عمارت کے کبھی یہاں ہونے کے آثار بھی باقی نہیں۔ ممکن ہے کہ خودرَو تعمیرات اور بے سلسلہ و بدقطع دُکانات کے نیچے دبے ہوئے ہوں۔ بشپ ہیبر صاحب کی تحریر اس کے موجود ہونے اور دیکھنے پر دلالت کرتی ہے۔ نئے ڈسٹرکٹ گزیٹیر نے اپنے ماخذ اور ذریعۂ علم و استناد کا حوالہ نہیں دیا۔ پُرانے گزیٹیر میں صاف لکھا ہے کہ "سرا کے دروازے پر یہ قطعۂ فارسی لگا تھا۔ جو خسرو باغ کے اصلی پھاٹک کے کتابہ کے بالکل سامنے تھا[2]۔" اسی کتاب میں اُس قطعہ (بفرمان والے) کا چوتھا مصرع بھی مندرج ہے[3]۔

خلد آباد کی سرا کو مہا پادری ہیبر صاحب نے ۱۸۲۵ء میں ایک گئی گزری بلکہ گری پڑی حالت میں دیکھا تھا۔ تاہم اس کی نسبت لکھتے ہیں[4] کہ "یہ ایک نوبل (عالیشان) مربع ہے۔ جس کے چار عمدہ گاتھک وضع کے پھاٹک ہیں۔ جس کے گرد قلعہ بند دیوار ہے۔ اور جس کے اندر وارد و صادر کے قیام و راحت کے لئے

---

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر متھرا، صفحہ ۲۰۹۔ [2] ڈسٹرکٹ گزیٹیر سابق، مطبوعہ ۱۸۸۴ء، صفحہ ۱۶۶۔ [3] ایضاً صفحہ ۱۶۶۔ [4] سیاحت نامہ، جلد اوّل، صفحہ ۴۴۳۔

Narrative of a journey through the Upper Provinces of India from Calcutta to Bombay in 1824-25, London, 1828, by Rt. Revd. Reginald Heber, D.D., Lord Bishop of Calcutta.

حجرے بنے ہیں۔"

ایک صدی اور گزرنے پر یہ حالت ہے کہ سرا کی پرانی سنگین دیوار تو تین سمت کی باقی ہے، مگر خود سرا جا بجا گرگئی ہے۔ زمانہ کی روش بدل جانے اور آیند و روند کی عارضی ضرورتِ قیام باقی نہ رہنے کی وجہ سے اس فرودگاہِ عوام کا اصلی مقصود بھی مفقود ہو چکا ہے۔ کاروانسرا کا کچھ حصہ جو بھٹیاروں کے تصرف میں پرانے وقتوں سے چلا آتا تھا، اب بھی ہے۔ جس طرح شاہی زمانہ سے معافی تھی، بدستور ہے۔ ان کوٹھریوں کی نگہداشت و مرمت بھی انھیں کے ذمہ ہے۔ باقی جو کچھ ہے، نزول اور سرکاری مقبوضہ ہے، وہ میونسپلٹی کے متعلق ہے۔ بلدیہ کے زیرِ اہتمام سرا کے وسط (صحن) میں کھانے پینے کی چیزوں اور موسمی پھلوں اور پیداواروں کی ہاٹ لگتی ہے۔ اس (بازار) کی آمدنی چار ہزار سالانہ ہوتی ہے، جو میونسپلٹی لیتی ہے۔ سرا کے وسیع و فراخ صحن میں موقع و بے موقع مختلف قسم و وضع کی کچھ خوشنما اور کچھ نازیب عمارتیں اور دُکانیں بن گئی ہیں، اور بنتی جاتی ہیں۔ سڑک والا دروازہ پشت کی جانب سادہ اور پُرانا ہے۔ خسرو باغ کی طرف اس وقت کوئی دروازہ نہیں ہے۔ نہ دیوار ہے، نہ کوئی روک ہے۔ سرا کا یہ رُخ کھلا ہوا ہے۔ بڑی سڑک رواں ہے۔ سڑک کے اُس سمت جدھر کبھی سرا کا بڑا پھاٹک رہا ہوگا، کچھ معمولی طرز کی دُکانیں باغ کے رُخ جا بجا بن گئی ہیں۔ جو باغ کی دلفریبی، پھاٹک کی شان اور اربابِ حل و عقد کے سلیقۂ والتفات پر بدنما داغ ہیں۔

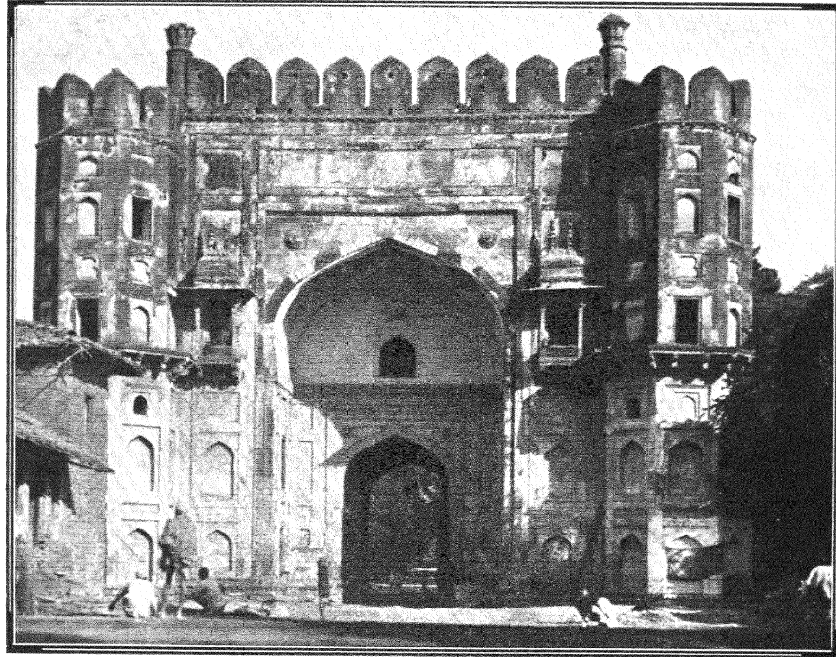
اسی گزرنے والی سڑک کے پورب پچھم دونوں جانب دروازے ہیں، جو خلد آباد کے پھاٹک کہلاتے ہیں، جن کا ذکر ابھی کر چکا ہوں۔ قطعۂ تاریخ کے صرف تین مصرعے اس وقت کھلے ہوئے ہیں۔ چوتھا (یعنی آخر کا) غائب ہے۔ کبھی مجھ سے ایک برخود غلط مدعیِ واقف کاری نے کہا تھا کہ ایک بڑے حاکم کی آمد کے ہنگامے یا گرمیِ محفل کے وقت درستی کی ضرورت سمجھی گئی تھی۔ حُسنِ اتفاق سے معمولی مرمت کی نوبت بھی پہنچی تھی۔ لیکن اس طرح کہ اس ٹکڑے پر بدنما استر کرنے میں پورا ایک مصرعہ غائب ہو گیا۔

ہم دل میں خوش کہ سبزۂ تربت ہرا ہوا   وہ اس ادا سے روئے کہ پلکیں بھی نم نہیں

اُس بدگمان نااندیش کا یہ کہنا کہ یہ چاروں مصرعے ایک سیدھی لائن میں ایک بڑے لمبے پتھر پر کُھدے ہوئے تھے صریحاً غلط ہے۔ پہلے ہی نظر ڈالنے سے اس نظریہ کی لغویت روشن ہو جاتی ہے۔ پہلے تینوں مصرعے

(۲)

خسرو باغ کا بڑا پھاٹک



مقبول صمدنی

(ایفرمان۔ یاکہ زیبد۔ ۳ بناشد) ایک بڑے اور لمبے مگر کم چوڑے تختے پر پتھر کے، نہایت خوش قلم، جلی، اُبھرے ہوئے حروف میں، بخط نستعلیق کندہ ہیں۔ درست حالت میں ہیں۔ کچھ فاصلہ سے بھی صاف پڑھے جاتے ہیں۔ ہر مصرع ایک جداگانہ خوشنما جدول کے اندر محصور ہے، جس کے دائیں بائیں دونوں پہلوؤں پر بیل بنا کر ایک لطف پیدا کر دیا گیا ہے۔ ان کی ایک لائن ہے۔ طرز تحریر گنجان ہے۔ چپ و راست مساوی، ہاتھ ہاتھ بھر کے قریب جگہ چھٹی ہوئی ہے۔ بیچ والا یعنی دوسرا مصرع ٹھیک محراب کی نوک پر، دروازہ کے پھول کے اوپر، وسط میں آیا ہے۔ اس مکتوب و منقوش پتھر کے نیچے ایک سادہ اور کچھ کم لمبی پٹری پتھر کی لگی ہے۔ جس کی ہیئت و کیفیت گواہ ہے کہ یہ بھی اسی وقت کی ہے۔ بعد کو بدلی یا لگائی نہیں گئی ہے۔ نہ اُس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ نہ ان دونوں پتھروں پر کوئی استر کاری ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ سرا کے گرائے ہوئے پھاٹک پر ثبت رہا ہو مگر اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مصرع اخیر یہاں شروع ہی سے نہیں لکھا گیا تھا، ورنہ مصرعوں کی ترتیب اور تحریر کی نشست کلیتہً جدا ہوتی۔ آخر کیوں چھوڑ دیا گیا۔ کون سی ضرورت یا مصلحت اس کی داعی تھی، ایک حل طلب معمّا ہے۔ بدیہی طور پر اس کے متعدد و مختلف وجوہ ہو سکتے ہیں۔ ایک فلسفی چاہے تو اُن پر طبع آزمائی کرے۔ مورخ کا کام صرف گزرے ہوئے ملشت از بام واقعات کو بے کم و کاست راست راست نقل کر دینا ہے۔ ماہیت اشیاء کا تجسّس اور رازہائے سربستہ کی جستجو اور اُن کا ادراک، اُس کے دائرۂ عمل سے خارج ہے۔ وہ کہہ دے گا کہ چوتھا مصرع بخوبی معروف و مقبول عوام ہے۔ اس کو یاد رکھنے کے لئے اب قلم و سیاہی کی مدد درکار نہیں۔ جس طرح ساڑھے تین سو برس سے سینہ بہ سینہ محفوظ چلا آتا ہے۔ ابھی صدیوں تک زبان پر رہے گا۔

سرا کے سامنے وسط میں پہنچتے ہی شمالی جانب خسرو باغ کا بلند بادشاہی پھاٹک پیش نظر ہوتا ہے۔ اس عمارت کا انداز تعمیر، خوش وضعی و خوش نمائی، یورپ کے نامور سیاحوں اور انجینروں سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔[۱]

میں نے دیکھا ہے کہ یہاں پہنچ کر صاحب نظر سیاح متحیر ہو جاتا ہے۔ پھاٹک کی رفعت و عظمت، بلندی و شان، اُس کو مبہوت بنا دیتی ہے۔ اب نہ وہ جہانگیر باقی ہے، جو کبھی بلند ارادہ شاہزادہ تھا۔ جو شاہانہ تمکنت،

---

[۱] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، صفات ۲۰۲-و-۲۰۳-و- پریاگ یا الہ آباد کی ہینڈ بک، صفحہ ۵۰۔

احتشام وجلالت سے الٰہ آباد میں وقت گزارتا، اور ہندوستان کے تاج وتخت کے خالی ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ نہ وُہ اولوالعزم حوصلہ مند خسروسلطان نظر آتا ہے، جو مرتے دم بھی سلطنت اور حکومت کا سودا اپنے سر میں لے گیا۔ اس وقت ہرطرف خاموشی وسکون چھایا ہوا ہے۔ لیکن دیکھنے والا اگر لرزہ براندام نہیں ہوجاتا، تاہم یہاں کی مجموعی کیفیت سے متاثر ومرعوب ہوتا، اور اُس کے جزو وکل پر بڑی عبرت وحسرت کی نگاہ ڈالتا ہے۔

یاد ہے وُہ مبارک صبح جب میں پہلے پہل اس موقع پر پہنچا تھا۔ دروازہ کی شان وعظمت سے نظرافروز اور نیم ویرانۂ باغ کی نسیم وصبا کے جھونکوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ یہ اشعار بے اختیار میری زبان پر آگئے تھے۔

اے بادِ بامدادی! خوش آمدی بہ شادی — پیوندِ روح کردی، پیغامِ عیش دادی

بر بوستاں گزشتی یا در بہشت بودی — شاد آمدی وخرّم، فرخندہ بخت بادی

تا من دریں سرایم ایں در ندیدہ بودم — کامروز پیش چشمم، در بوستاں کشادی

اس رفیع ومنیع پھاٹک کے مقابلہ میں عہدِ مغلیہ کے دو دروازے پیش کئے جاسکتے ہیں، ایک فتح پورسیکری کا بلند دروازہ۔ جو اکبری تعمیرات میں خاص شرف وفضیلت کا مالک ہے اور فتوحاتِ دکن کی یادگار میں بنا تھا۔ مسٹر فرگوسن کہتے ہیں کہ شاہانہ عظمت وجلالت رکھتا ہے اور دنیا کے بڑے سے بڑے دروازوں میں اس کا درجہ ممتاز ہے[۲]۔ جس کی نسبت مسٹر فرینچ لکھتے ہیں کہ "جنوب میں ایک عجیب وغریب چیز ہے۔ یہ ایک عظیم الشان پھاٹک ہے، جو دنیا بھر کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ جلالت والے پھاٹکوں میں ہے...... تمام پھاٹکوں سے زیادہ عظیم الشان ہے"۔ بقول مسٹر بیل[۳] یہ پھاٹک "بلند دروازہ" یا "دروازہ کلاں" کے نام سے بالکل بجا مشہور ہے[۴]۔ محقق ومورخ منشی معین الدین کا بیان ہے کہ "بلند دروازہ" خوشنمائی

[۱] دُور کر زنی سے پیشتر۔ [۲] آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۲۴۸۔ خواجہ ابوالحسن معتمد خاں نے جہانگیر نامہ میں صفحہ ۱۱۹ پر پوری تفصیل اور بڑی تعریف لکھی ہے۔ مسٹر ایڈمنڈ اسمتھ Edmund Smith نے اپنی کتاب "فتح پور سیکری" میں اور مسٹر بیورِیج نے ترجمۂ تزکِ جہانگیری، مطبوعہ ۱۹۱۴ء حصہ دوم، صفحہ ۲، نوٹ، میں موجودہ حالات وتفصیلات نقل فرمائے ہیں۔ یہی دہلی دروازہ بھی کہلاتا ہے۔ [۳] ۱۰۰۹ھ (۱۶۰۱ء) کی تعمیر ہے۔ [۴] سیاحت نامہ بالائی ہند، صفحہ ۱۲۱۔ [۵] مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۶۳۔

رفعت و منزلت میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ اُس کے ارتفاع اور شان کو دیکھ کر

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے   زمیں جس کی چہارم آسماں ہے

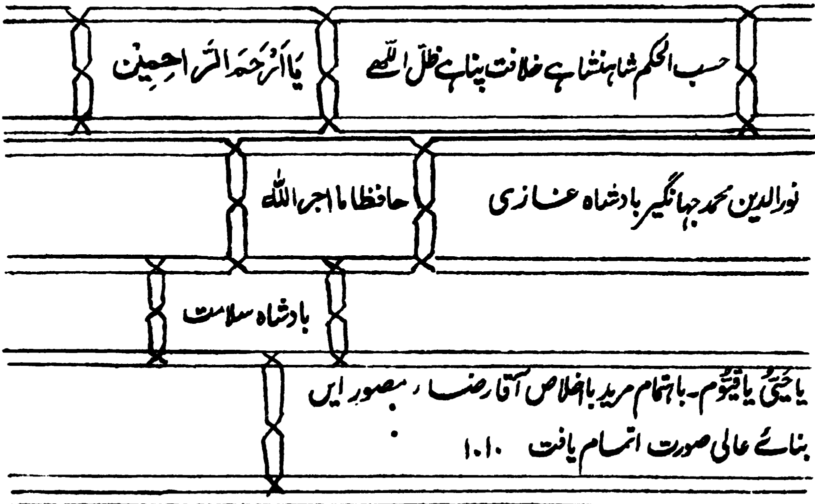
بے ساختہ زباں سے نکل جاتا ہے۔ فی الواقع یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا قدرت نے ایک پہاڑ پر دوسرا پہاڑ کھڑا کر دیا ہے"۔ [۱]

دوسرا شادی آباد مانڈو (مالوہ) کا عالمگیری دروازہ۔ عہد اورنگ زیب میں جب شہر پناہ کی مرمت و درستی ہوئی تو یہ دروازہ بڑھایا گیا تھا۔ پروفیسر عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں کہ بلندی و خوبصورتی میں یہ بھی فتح پور والے دروازے سے کسی طرح کم نہیں۔ [۲]

شاہی شارع اعظم اس پھاٹک کے سامنے گزرتا ہے۔ مگر اس وقت سطح آستان اور باغ کی زمین سے بہت اونچا ہو رہا ہے، جس سے دروازہ کی شان و رفعت اور کسی قدر خوبی و خوش نمائی میں فرق آگیا ہے۔

یہ ٹھوس عمارت ابتدائی زمانہ مغول کی عمارات کی وضع پر ہے، جس میں افغانی اور ہندوانہ طرز تعمیر کی آمیزش نمایاں ہے۔ جو خصوصیات اکبری و جہانگیری عہد کی تعمیرات کے ساتھ وابستہ ہیں، یہاں بھی کافی و وافی موجود ہیں۔

پھاٹک پر یہ پتھر نصب ہے۔ جس سے واضح ہے کہ اس کا اہتمام تعمیر آقا رضا اُس عہد کا شاہی معمار تھا۔ پوری تحریر تو ایک ہی سطر میں ہے مگر جا بجا نقوش و جداول بنا دینے سے کئی ٹکڑے ہو گئے ہیں۔



[۱] معین الآثار، صفحہ ۲۶۔ [۲] سالانہ کاروان، ۱۹۳۴ء، صفحہ ۱۲۶۔

جدید گزیٹیر کا مؤلف لکھتا ہے کہ اس پھاٹک کا تعمیر کنندہ شاہی معمار آغا رضا کا شاگرد تھا۔[۵]

"مُرید با اخلاص آقا رضا" کے اور کیا معنی کوئی بتا سکے گا؟ مگر فی الواقع یہ ذی علم کرنیل (نیویل) کی ذہانت نہیں، بلکہ اُس بااِستعداد دفتر کے اہلکار یا بابو کی خوش فہمی و لیاقت ہو گی۔ جو فارسی کے کتابوں کو پڑھنے اور اُن کے ترجمے کے لئے مامور ہوا ہوگا۔

آقا رضا مصور و نقشہ ساز تھا۔ مہندس و معمار نہیں۔ تاہم اپنی ذہانت و کمال فن و دستکاری کی ایسی یادگار چھوڑ گیا ہے جو ابھی صدیوں تک اُس کے بقائے نام کی ضامن رہے گی۔ لیکن باغ کے آنے جانے والوں میں سے کتنے ایسے شخص نکلیں گے۔ جن کو اس باکمال کے حالات سے آگاہی ہو، یا جاننے کے خواہشمند ہوں!

نہ عالم ہم سے واقف ہے، نہ ہم واقف ہیں عالم سے
وہ بیکس ہیں ہمیں دُنیا نے چھوڑا، ہم نے دنیا کو

اس لئے خسرو باغ کی تاریخ لکھنے والے کا اولین فرض ہے کہ اس ہنرمند کو تخصیص و تقدیم کے ساتھ یاد کرے۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ اس کے حالات ہماری متداول و متعارف تاریخوں میں نہیں ملتے۔ بہت سی فارسی اور انگریزی کی کتابوں اور رسالوں کی ورق گردانی کے بعد اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایک مصور تھا، جہانگیر کے دامنِ دولت کا ممتاز وابستہ اور عہدِ شاہزادگی کا مقرب رُکن۔ اپنے خاندانی جوہر اور کمال سے بھی مالا مال تھا۔[۶]

اس کا باپ، یہ خود، اس کا بیٹا تینوں اپنے اپنے زمانہ کے لحاظ سے نامور و صاحبِ فن گزرے ہیں تعجب خیز اسی قدر ہے کہ خود اس کے تذکرہ سے زیادہ آقا رضا کے باپ اور بیٹے، دونوں، کا ذکر مختلف تاریخوں میں موجود

---

[۱] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، ۱۹۱۱ء، صفحہ ۲۰۲۔ [۲] اورینٹل کالج میگزین۔ اگست ۱۹۳۴ء۔ [۲] ایضاً اگست ۱۹۳۵ء۔

3. Laurence Binyon's "The court painters of the Grand Moguls."

4. Laurence Binyon's "The Persian Painting".

6. Journal of the Royal Asiatic Society. for April, 1935.

محفوظ ہے۔ آقا رضا کے باپ مولانا علی اصغر کاشی تھے۔ جن کی نسبت مرزا سکندر (منشی شاہ عباس بزرگ) نے عالم آرائے عباسی میں تحریر فرمایا ہے کہ وہ سلطان ابراہیم مرزا کے ملتزم خدمت تھے۔ اسماعیل مرزا نے کتب خانہ کی نگہداشت سپرد کی تھی۔ وہ بے مثل استاد اور پاکیزہ ساخت مصور تھے۔ تصویروں کے درست کرنے اور رنگ بھرنے میں یکتا تھے۔ پہاڑوں اور درختوں کے بنانے میں تمام برابر والوں سے بڑھے ہوئے تھے [۱]

آقا رضا کا بیٹا ابوالحسن بھی مصور تھا۔ جس نے جہانگیر کے دربار تخت نشینی کی تصویر بنا کر پیش کی تھی۔ اور نادر الزمانی خطاب پایا تھا۔ جہانگیر نے اس تصویر اور اس مصور کی جس قدر توصیف و تحسین کی ہے اُس کی مثال کسی دوسری جگہ پائی نہیں جاتی۔ اُس زمانہ تک کے ماضی و موجود نامور ترین مصوروں میں سب سے برتر بتایا ہے، حتیٰ کہ باپ (آقا رضا) کی ہنرمندی کی حقیقت بھی کھول دی ہے۔ لکھا ہے کہ ابوالحسن کا باپ آقا رضای مروی زمانہ شاہزادگی میں میری ملازمت میں داخل ہوا تھا، اس لئے ابوالحسن کو میری درگاہ کی خانہ زادگی کا شرف حاصل ہے۔ لیکن بیٹے کو باپ کے کام اور ہنر سے قطعاً کوئی مناسبت حاصل نہیں، یہاں تک کہ دونوں کو ایک عالم سے شمار نہیں کیا جا سکتا۔ [۲]

تزک کے اصل فقرہ "پدرش آقا رضائی مروی در زمان شاہزادگی من بخدمت من پیوستہ" میں ایک لفظ "مروی" میں اختلاف ہے سید احمد خان مرحوم نے اس کو مروی (مرو کا) پڑھا اور چھاپا ہے [۳]۔ مسٹر ہنری بیورج Henry Beveridge تزک کے انگریزی ترجمہ میں فرماتے ہیں کہ قلمی نسخوں میں "ہروی" (ہرات کا) لکھا ہے [۴]۔ جامع اوراق کے آبائی کتاب خانہ کے مخطوطہ میں "مردے" (ایک مرد) پڑھا جاتا ہے [۵]۔

بہر حال، باپ کاشان کا رہا ہو، خود آقا رضا اصفہان کا؛ وہ دارالسلطنت میں مرد سے پہنچا ہو یا ہرات سے؛ اُس کی اصل و نسل کا کہیں مذکور نہیں۔ ہندوستان آنے سے پہلے اُس کی حالت اور گزران کیسی تھی؟ مولف عالم آرائی کا بیان ہے کہ آقا رضا نے فن تصویر و صورت کشی و یکہ (سنگل) سازی اور چہرہ کشائی میں بڑی ترقی

---

[۱] جلد اول، صفحہ ۱۲۸۔ [۲] مطبوعہ علی گڑھ صفحہ ۲۳۵۔ و۔ ترجمہ الیگزینڈر راجرس Alexander Rogers صفحہ ۲۰۔ [۳] مطبوعہ علی گڑھ، صفحہ ۲۳۵۔ [۴] مطبوعہ لندن، ۱۹۱۴، حصہ دوم، صفحہ ۲۰، نوٹ۔
[۵] موجودہ قصبہ صمدن ضلع فرخ آباد۔

کی ہے۔ وہ اعجوبۂ وقت ہوگیا ہے اور اس دور و زمانہ میں مسلم الثبوت ہے۔ اُفتادِ طبع سے مجبور ہے۔ باوجود نزاکت قلم ہمیشہ زور آزمائی اور ورزش گیری میں مصروف رہتا اور اسی طرح کی باتوں سے محظوظ ہوتا ہے۔ اہلِ علم و فن کی صحبت اور استعداد والوں سے دور رہنے اور بیہوادوں سے میل جول اور ارتباط رکھنے کا خوگر ہے۔ بدمزاجی، تنگ حوصلگی، سر و اختلاطی اس کا شیوہ ہے۔ طبیعت میں استغنا بھرا ہوا ہے۔ اس طرف کچھ دن سے اپنی ہرزہ درآئی و بے ہودگی سے توباز آگیا ہے، تاہم کام کی طرف توجہ کم ہے۔ بارگاہِ شاہی (والیِ ایران) میں پہنچ کر مورد عواطف بھی ہوا اور بڑے اعزاز و مراتب پائے تھے۔ لیکن اپنے ناہنجار اطوار کی بدولت رسوخ و اعتبار حاصل نہ کر سکا ہمیشہ مفلس و پریشان رہا۔ ایران کے قیام سے دل برداشتہ اور شاکی رہتا ہے۔

طالبِ من ہمہ شاہانِ جہانند و مرا　　　　در صفاہان جگر از بہرِ معیشت خون شد[1]

اس کے ہندوستان چلے آنے کا سبب ظاہر ہے۔ وہ اسی ملک میں کہیں پیوند خاک ہوا ہوگا، جس کے بتانے سے صفحات تاریخ قاصر ہیں۔

آقا رضا کے متعلق، رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے عالمانہ مقالہ[2] میں مسٹر نکوس ان مارٹنووچ Nicholas N Martinovitch کی تحریر کے بعض اجزا مزید تحقیق و صحت کے محتاج ہیں۔ فاضل مستشرق کو کیا خبر تھی کہ ۱۰۰۱ھ میں یہ چابک دست نقاش (آقا رضا) الٰہ آباد میں وارد تھا۔ وہ موقلم صورت کشی اور رنگ افروزی و روغن آرائی چھوڑ کر سنگ و خشت سے سر مار رہا اور معماری و استوکاری میں مشغول و مصروف تھا۔ وہ ۱۰۰۱ھ کو ۱۰۰۱ لکھنے کے بجائے ہندسوں میں پورا لکھتا تھا۔ وہ جہانگیر کے تیرھویں سال جلوس سے پہلے دنیا اور اہلِ دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ ۱۰۴۲ھ یا اس کے قریب کی تصویریں اس کے قلم کی نہیں ہوسکتیں۔ یہ صحیح ہے کہ کم از کم سات مصور و خطاط اس زمانہ میں رضا نام کے گزرے ہیں۔

خسرو باغ کے بیرونی جانب فصیل یا چار دیواری سے ملحق، پھاٹک کے دونوں طرف سنگین دکانیں

---

[1] تاریخ عالم آرائے عباسی، جلد اول، صفحہ ۱۲۸۔ [2] جورنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن، بابتہ ماہ اپریل ۱۹۳۵ء، صفحات ۲۹۰ تا نہایتہ ۲۹۸۔

برابر بنی ہوئی تھیں، جو کسی نہ کسی حال میں اب بھی موجود ہیں۔ ان کی وضع و ساخت سے پایا جاتا ہے کہ باغ کے متعلق تھیں۔ سرائے ضلد آباد کا جزو نہ رہی ہوں گی۔ یہ دکانیں یا دہرے حجرے شہر کی آبادی کے اندر ہونے سے کم و بیش اب تک آباد ہیں۔ پہلی سی رونق البتہ باقی نہیں۔ نہ ان میں کوئی اعلیٰ قسم کا سامان تجارت یا عمدہ مال و اسباب رکھا جاتا ہے۔ جائے سکونت کے طور پر محنتی پیشہ وروں کے مصرف میں ہیں۔ اس لئے صفائی اور ستھرا پن مفقود ہے، خرابی و شکستہ حالی نمودار۔

اے سبزۂ سرِرہ از جورِ پا چہ نالی؟ درکیشِ روزگاراں گُل ہم بہا ندارد

پھاٹک کی عظیم الرفعت عمارت سراپا یا یوں کہئے کہ زیادہ تر معمولی سنگ سرخ کی ہے، جو کم و بیش ان اطراف میں بآسانی دستیاب ہو جاتا ہو گا۔ کہیں کہیں کچھ تختے مٹیلے رنگ کے یا خاکی بھی پائے جاتے ہیں۔ سنگ کھٹو یا زرد مرمر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ان سب کی مقدار و تعداد مل کر ضرور قابل لحاظ ہو جاتی ہے۔ عمارت سادہ ہے، یعنی ہر قسم کے تکلفات و نمائش و آرائش سے مُعرا۔ نہ اس میں سنگ مرمر کی جدولیں ہیں، نہ سیاہ پتھر کی تحریریں۔ نہ منبت کاری ہے نہ پچی سازی۔ شروع سے باغ تھا، اور باغ ہی رہا۔ اس لئے گورستانوں کا سا اہتمام و انتساق یہاں نہیں پایا جاتا۔ نہ تسبیح خانہ ہے نہ مسجد کا نظارہ۔ نہ کہیں اسمائے حسنیٰ لکھے ہیں، نہ آیاتِ قرآنی کندہ ہیں۔ نہ فلک پیمائی کے لئے منارے ہیں۔ غرضکہ اکثر اسلامی خصوصیات یہاں ناپید ہیں۔

دروازہ میں داخل ہونے پر دونوں جانب وسیع شہ نشین ملتے ہیں۔ چھ سات برس پہلے ان بغلی دالانوں میں نیچے اوپر دونوں طرف، پولیس کی چوکی تھی۔ اب خالی رہتے ہیں۔ اوپر جانے کے لئے دائیں بائیں دو طرفہ زینے ہیں۔ سیڑھیاں کسی قدر تنگ ہیں مگر تکلیف دِہ اور بدنما نہیں۔ اُن کے دروازے مقفل رہتے ہیں۔ تیسری منزل پر پہنچ کر دیکھنے والا سارا شہر، بلکہ اُس کا گوشہ گوشہ اپنی آنکھوں کے سامنے پاتا ہے۔ اوپر یعنی بالائی منزل پر بہت سی عمارت بنی ہے۔ اب بھی کافی گنجائش ہے۔ گو کمین ہیں نہ زنانہ مکانات ہیں۔ دالان ہیں۔ کوٹھریاں ہیں۔ کبھی بردگیانِ حرم سرائے سلطانی ان میں فروکش و راحت گزیں ہوتی ہوں گی۔ پھر حجلہ نشینانِ نگار خانۂ پولیس کے اعتکاف کے لئے وقف رہیں۔ اب وہ صورت بھی باقی نہیں۔ پھاٹک میں آخر قدم پر بائیں ہاتھ ایک کمرہ کا سائن بورڈ اوپر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس میں "محافظ آثارِ قدیمہ کا دفتر" یعنی آرکیالوجی کل

آفس ہے جس نے پولیس کو بے دخل کر کے یہ جگہ حاصل کی ہے۔ کبھی یہاں نوبت خانہ بھی رہا ہوگا۔ پانچ وقت نوبت بجتی ہوگی۔ مگر اب

پردہ داری می کند بر قصرِ کسریٰ عنکبوت　　　بُوم نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

اَحدی اور شاہی باڈی گارڈ اور یہاں کے سامان و اسباب و مراتب کے محافظ و نگراں اُن کوٹھریوں میں رہتے تھے، جو پھاٹک کے باہر دونوں جانب بنی ہیں۔ عملۂ باغ اور باغبانوں کے رہنے سہنے کے واسطے بھی وافر جگہ تھی۔ لکھ چکا ہوں کہ یہ کوٹھریاں اب بھی کسی نہ کسی تعداد میں باقی ہیں، مگران کی حالت زبون و شکستہ ہے۔ بعض اہلِ حرفہ یا غربا سالانہ کرایہ پر میونسپلٹی سے لئے ہوئے ہیں۔

پھاٹک کے استحکام و استواری نے ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء کے عظیم شرق گیر زلزلہ کا بھی مقابلہ کیا تھا۔ مگر ایک آدھ کہن سال بُرجیوں کی شکست کے سوا شکست کھائی۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ نے مناسب و مضبوط درستی کرادی ہے۔

مسلّم ہے کہ یہ سب تعمیرات جہانگیر کے زمانۂ قیام اور گورنری و ولی عہدی کے دَور کی یادگار ہیں۔ وہ تخت پر جمادی الثانی ۱۴ ۱۰۱۴ھ (۵ اکتوبر ۱۶۰۵ء) میں بیٹھا تھا[۱]۔

ڈاکٹر فوہرر اپنی عالمانہ تاریخ صنادیدِ قدیمہ[۲] میں لکھتے ہیں کہ "الٰہ آباد میں عہدِ مسلمانوں کی باقیات صرف چند ہیں۔ وہ بھی چنداں اہم نہیں۔ سب سے ممتاز عمارت خسرو باغ محلہ خلد آباد میں ہے۔ یہ ایک مربع ہے جس کو قلعہ نما دیوار احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہ ۱۰۱۰ھ (۱۶۰۱-۲ء) میں تعمیر ہوا تھا۔" آیئے اس کو بھی دیکھ لیجئے۔

لکھ چکا ہوں کہ تاریخوں سے "خسرو باغ" نام رکھے جانے کی وجہ یا نام رکھنے والے کا پتہ نہیں چلتا، مگر قیاس غالب ہے کہ یہ نام عہدِ جہانگیر میں بھی مشہور اور زبانوں پر رواں تھا۔ اس لئے کہ پیٹر منڈی صاحب نے شاہزادہ کی موت و تدفین کے متعلق ۱۶۲۲ء میں یا اُس کے قریب لکھا تھا کہ "خسرو آگرہ میں سپردِ خاک کر دیا گیا تھا، مگر نورجہاں کے ابرام و لجاج سے وہاں سے ہٹا کر "مردہ آباد" یا "گزرو آباد" Gazrooabad یا حقیقتہً الٰہ آباد اس کو منتقل کر دیا گیا ہے[۳]۔" ہندوستان کے پُرانے جغرافیہ اور الٰہ آباد کے نواحی و اطراف میں کوئی

---

[۱] بیل صاحب کی ڈکشنری، صفحہ ۱۲۸۔ [۲] جلد دوم، ممالک مغربی و شمالی و اودھ، صفحہ ۱۳۰۔ [۳] سیاحت نامہ، جلد دوم، صفحات ۱۰۵ و ۱۰۶ Travels of Peter Mundy, Vol. II, pp. 105 & 106.

مقام ان دونوں ناموں سے شہرت نہیں رکھتا۔ ہوسکتا ہے کہ ایک غیر ملک کے باشندے نے ناواقفیتِ زبان وعدم صحت سے "خلد آباد" کو "مروہ آباد" لکھ دیا ہو۔ اور "کزرو" تو صاف طور پر "خسرو" کا انگریزی املا اور تلفظ اور "باد" "باغ" کی تحریف یا اُس کا بدل معلوم ہوتا ہے۔

شاہ بیگم اور خسرو کے مرنے اور یہاں دفن ہونے کے بعد خسرو باغ کا نام بدل جانا چاہئے تھا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ شاید بدشگونی مانع آئی۔ اورنگ آباد دکن میں عالمگیر کی مشہور ملکہ رابعہ دورانی کا مقبرہ ہے۔ اہلِ تاریخ نے اس کا تذکرہ "باغ بیگم" کے نام سے کیا ہے۔ قرینہ وقیاس مقتضی ہے کہ ملکہ کے دفن سے پیشتر یہ اُس کا باغ رہا ہوگا۔ اس لئے اُس کے پیوندِ خاک ہونے کے بعد بھی وُہی نام قائم رہا۔ لیکن لالہ سیتا رام فانی "آصف جاہی" کی "مآثرِ نظامی"[1] سے پتہ چلتا ہے کہ اُس کا نام بھی کسی وقت "بیگم کا مقبرہ" پڑ گیا تھا۔ نواب آصف جاہ نے ایک روز "بیگم کے باغ" کی سیر کے لئے تشریف لے جانا چاہا۔ مناسبِ حال تیاریاں کی گئیں۔ انتظام مکمل ہوگیا تو دارو غۂ دیوان خانہ نے عرض کیا کہ حسبِ ارشاد "بیگم کے مقبرہ" میں اہتمام ہوگیا ہے۔ معلوم نہیں کہ نواب اُس وقت کس خیال میں تھے۔ برہم ہوکر فرمایا کہ "مقبرہ تمھیں کو مبارک ہو۔ تم ہی وہاں جاؤ"۔ تشریف بری موقوف کردی۔ سامانِ آسایش وآرایش جو بھیجا گیا تھا، واپس منگالیا۔ اُسی دن سے یہ لازم ہوگیا کہ حضور میں اس جگہ کا نام جب کبھی آتا تو مقربین ہمیشہ "باغ بیگم" ہی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اسی کتاب سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ آصف جاہ کے حضور میں کسی کے مرنے کی فوراً اطلاع نہیں کی جاتی تھی۔ بلکہ تیسرے دن (مرجانے کے بعد) عرض کیا جاتا کہ فلاں امیر یا درباری نے صحتِ کلّی پائی۔ جو شخص کہ نمازِ جنازہ میں شریک رہا ہو، تین روز تک نواب کے سامنے جانے نہیں پاتا تھا۔ اور اب بھی بقول میر شوکت بلگرامی "فرماں روائے دکن کی عظمت وجلالت کی شان اس سے بہت ارفع اور اعلیٰ ہے کہ کسی مقرب اور عزیز کی رحلت پر بھی اُس کی جانب سے تعزیت کی جائے۔ جہاں موت کی اطلاع بھی اگر بہت ضروری ہوتی ہے تو اِن لفظوں میں کی جاتی ہے کہ "فلاں شخص کو دوا کارگر نہیں ہوئی"[2]۔ سلاطینِ مغلیہ اور شاہانِ اودھ کے یہاں بھی یہی دستور تھا کسی کے مرنے کی اطلاع دی جاتی تو عرض کیا جاتا کہ فلاں شخص تصدق ہوگیا۔

---

[1] قلمی کتب خانہ آصفیہ دکن۔ [2] رسالہ "الناظر" لکھنؤ، نمبر ۱۵، صفحہ ۴۸۔

موت اور مرنے کا منحوس لفظ محلات کے اندر اور درباروں میں آنے نہیں پاتا تھا۔ اسی طرح چغتائیوں کا آئین یہ تھا کہ جب کسی شاہزادہ یا امیر کی وفات کی اطلاع دینا ہوتی تو اُس کا سرکاری وکیل اپنے بازو پر نیلا رومال باندھ کر دربار میں حاضر ہوتا تھا[1] اور کورنش بجا لاتا تھا۔ کہنے پر کوئی آمادہ نہ ہوتا تھا۔ (ابوالفضل کے مارے جانے کی اطلاع بھی اسی طریق سے اکبر کو دی گئی تھی[2]۔ حاجی دبیر آصفی اُلغ خانی اپنی تاریخ گجرات موسوم بہ ظفر الوالہ بمظفر وآلہ میں لکھتے ہیں کہ غیاث الدین خلجی موت کی خبر ملنے سے بہت دور رہتا تھا[3] کہ تمام عمر کوئی ایسی خبر نہیں سُنی۔ جب اُس کا داماد مر گیا تو اُولو القرب نے اطلاع دینے کے لئے حیلہ اختیار کیا یعنی شاہزادی سفید لباس پہن کر سامنے آئی، جیسا کہ اہلِ ہند کی عورتوں کا دستور ہے۔ بادشاہ نے دیکھا تو کہا کہ شاید اس کا شوہر فوت[4] ہو گیا ہے۔ ان حالات اور ایسے خیالات کے ہوتے ہوئے خسرو باغ کا تبادلہ نام کیسے ہو سکتا تھا؟

اسی قدر نہیں، بلکہ بعض امرا و رؤسا نے اس سے شگون نیک لیا اور یہی نام رکھا ہے۔ نواب کلب علی خاں کی تعمیر کردہ کوٹھی نہایت شاندار اور رام پور میں 'خسرو باغ' کے نام سے یادگار[5] ہے۔

مسٹر کین بحوالہ فرگوسن صاحب[6] ناقل ہیں کہ ہندوستان کے مغل اہلِ تاتار کی نسل ہیں۔ "تاتار والے اپنے مقبروں کو اس طرز سے بناتے تھے کہ اُن کی زندگی بھر تو خود اُن کے اور اُن کے دوستوں کے لئے جائے سُرور و سرور رہتا ...... بادشاہ یا امیر جو اپنے واسطے قبر کا انتظام کرنا چاہتا اُس کے لئے طریق معمول یہ تھا کہ دیوارِ شہر کے باہر ایک باغ کا حصار کھینچتا۔ اُس کے وسط میں .... ایک بلند مربع چبوترہ پر .... ایک .... عمارت بناتا جس پر گنبد ہوتا۔ بانی کے جیتے جی یہ مرکزی عمارت 'بارہ دری' کہلاتی اور خود اُس کے نیز یار و احباب

---

[1] تاریخ جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرشاد، صفحہ ۵۴۔ [2] ترجمۂ انگریزی مآثر الامراء از ہنری بیوریج، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۱۱ء، صفحہ ۱۲۳۔

[3] دفتر اول، مطبوعہ لیڈن، مطبع بریل ۱۹۰۱ء، صفحہ ۱۰۹۔ [4] آبِ بقا، صفحہ ۱۳۰، مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ۔ [5] مسٹر جیمس فرگوسن James Fergusson نے ۱۸۸۶ء میں وفات پائی۔ اُن کی تعریف میں مسٹر ڈنکن کا ایک ہی فقرہ نقل کر دینا کافی ہے کہ وہ عصرِ حاضرہ کے سب سے بڑے ماہر آثار قدیمہ و مستند شخص تھے۔ ان کی "تاریخ تعمیر" لاجواب اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔ اس سے بھی زیادہ بیش بہا اور نفیس اُن کی "ہندوستانی اور مشرقی تعمیرات کی تاریخ" ہے جو ۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی۔ [آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۷۰، نوٹ]

کے لئے سیر و تفریح اور دعوت و ضیافت کی جگہ رہتی۔ بعد وفات اُس کا مصرف و مقصود بدل جاتا۔ بنانے والے کی میت اسی مرکزی گنبد کے نیچے دفن کی جاتی ...... البتہ جب ایک مرتبہ مدفن قرار پا جاتا تو اس کے اندر مسرت و ابتہاج کی صدا بلند ہونا تو درکنار، کان میں بھی پڑنے نہیں پاتی تھی۔'' [1]

اس تجویز یا عندیہ کا حدِ تکمیل تک پہنچنا تو پایا نہیں جاتا۔ نہ خسرو باغ کی صورت ابتدائی یا وجہ بنا کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن خود باغ، اُس کے حوالی کی چیزوں اور مقبروں کے کتبوں اور سنین وغیرہ کے بغور مقابلہ سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ باغ کی تکمیل و ترتیب یقیناً پہلے ہو چکی تھی؛ جس کا موقع اور مرکزیت شاہدِ ناطق ہے۔
خلد آباد کے پھاٹک ۹۹۵ھ (۱۵۸۷ء) میں بنائے گئے۔ باغ کا پھاٹک ۱۰۱۰ھ (۱۶۰۱ء) میں تعمیر ہوا۔
شاہ بیگم کا انتقال بروایتِ جہانگیر آخر ۱۰۱۳ھ (وسط ۱۶۰۵ء) اور حسب تحریرِ لوحِ مزار ۱۰۱۲ھ (۱۶۰۴ء) میں ثابت ہوتا ہے۔ جہانگیر اُس وقت الٰہ آباد میں موجود بھی نہ تھا، شکار کو گیا تھا۔ باغ تیار تھا۔ بیگم اُس میں دفن کر دی گئی۔ مقبرہ ایک دو سال بعد تیار ہوا ہوگا۔

خُدا معلوم، اس آغاز کا انجام کیا ہوتا،
چھڑا تھا سازِ ہستی مبتدا بے خبر ہو کر



[1] آگرہ ہینڈ بک، مرتبہ ڈنکن صاحب، صفحہ ۱۴۹۔

خسرو باغ کے مقبرے وغیرہ

سنگِ آستاں پر (پھاٹک میں) قدم رکھتے ہی[1] سامنے چار مقبرے نظر آئیں گے، مگر اُن تک پہنچنے میں تین سو قدم کے قریب فاصلہ طے کرنا ہوگا۔

ان کا منظر مجموعاً نہایت دلکش، دلآویز و نگہ فریب ہے۔ مسٹر نیویل[2] Neville اور اور دیدہ ور اہلِ قلم کا قول ہے کہ یہ عمارات انتہا درجہ کی خوبصورت اور مغلوں کے عہد مصوری و رنگ آمیزی کا بہترین نمونہ ہیں۔ مسٹر اسٹیل Steel ایک موقع پر لکھتے ہیں[3] کہ "یہ مقبرے الہ آباد کے عمدہ آثار و صنادید قدیمہ میں بڑے نمود کی چیزیں ہیں"۔

اس فن کے ایک نو آموز و کم آشنا کی حیثیت سے مجھے بھی اس بارہ میں غور کرنے اور ان چیزوں کو اپنی نظرِ استعداد سے مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان مبصرین کی رائے سے کون اختلاف کر سکتا ہے! یہ صحیح ہے کہ خسرو کا مقبرہ اکبر کے مقبرہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ دونوں عمارتیں ایک ہی شخص کے حکم سے بنی ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ الہ آباد والا گنبد اُن فرسودہ و بوسیدہ ہڈیوں کو آغوش میں لئے ہے جو باپ سے بگڑ کر ہمیشہ گرفتارِ بلا رہنے والے بیٹے، اور بھائی (شاہجہاں) کے محسود بھائی کی تھیں۔ جو برہان پور دکن سے اُکھاڑ کر یہاں لائی اور دفن کی گئی تھیں۔ سکندرہ کا بے مثل مقبرہ ایک نیک نام و عظیم الشان شہنشاہ کی دائمی دُنیوی یادگار کے طور پر ہے، جو اُس ہی جیسے اُولوالعزم و منّت شناس شہنشاہ نے بنوایا تھا۔ دادا اور پوتے میں جتنا قدرتی فرق ہوتا اور ہو سکتا ہے یہاں بھی نمایاں ہے۔

مغلوں[4] کے ابتدائی زمانہ کی تعمیرات میں، جس میں اکبر اور جہانگیر کے عہد کی عمارتیں بھی داخل ہیں، بعض خصوصیات ہوتی تھیں، جو کچھ نہ کچھ ان مقبروں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ یعنی بلند اونچے[5] گردنوں پر ایرانی

---

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر سابق، صفحہ ۱۶۹۔ [2] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، صفحہ ۲۰۳۔ [3] ڈسٹرکٹ گزیٹیر سابق، صفحہ ۱۳۸۔ [4] ڈنکن صاحب کی آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۲۹۰۔ [5] ایضاً۔ صفحہ ۲۹۰۔

وضع کے گنبد۔ اس طرز کی عمارتیں بیشتر کی بنی ہوئیں عمارتوں سے دو باتوں میں بالخصوص ممتاز و متباین پائی جاتی ہیں (۱) اس امر کی صاف و صریح کوشش کہ ہندوؤں کے مختلف منتخب طرز تعمیر نیز مسلمانوں کے مخصوص طریقے اور وضعیں متحد و یکجا کر دی جائیں۔ (۲) زیادہ کھلتے ہوئے رنگ دینا۔ اس کے لئے عام طور پر سفید سنگ مرمر زیادہ استعمال ہوتا تھا۔ پھر حسب موقع و ضرورت بیش قیمت رنگین پتھروں کا افراط کے ساتھ خرچ اور کھپت۔ بے شبہ بعض عمارتوں کے متعلق محض اندرونی ساخت سے یہ تمیز (حاصل) کر لینا دشوار ہوتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ چیزیں جن کے مکانات و محلات میں موجود ہونے یا نہ ہونے سے بعض باتوں کا فیصلہ یا امتیاز ہو سکتا ہے مقبروں اور روضوں میں اکثر نہیں ہوتی ہیں۔ مثلاً لکڑی کا قطعاً استعمال میں نہ آنا یا سیدھے سادے نمونہ کی محرابیں کم بنانا، وغیرہ۔ مجھے اعتراف ہے کہ خسرو باغ کے مقبرے بے مثل و بے نظیر نہیں ہیں۔ نہ ان میں ہمایوں کے مقبرے (متصل دہلی) کی سی شان اور لطافت و نزاکت تعمیر و نقاشی پائی جاتی ہے۔ نہ مقبرۂ اعتماد الدولہ واقع آگرہ کی سی پرچین سازی اور منبّت کاری۔ نہ مقبرۂ شیخ سلیم چشتی (قصبۂ فتح پور سیکری) کی طرح سنگ مرمر پر سرتاپا باریک، نازک اور بے نظیر نقاشی و شجرکاری نظر آتی ہے۔ نہ کوئی خاص قابل ذکر حسن وضع و تعمیر ہے۔ نہ مقبرۂ اکبر (سکندرہ) کی رفعت و عظمت اور ہیبت و جلالت پیدا کرنے والی شان نمایاں ہے۔ تاہم چار مختلف الوضع عمارتوں کا ایک سیدھی لائن اور ایک ہی محاذ میں بہ یک نظر، نظر آنا، ایک کیفیت خاص پیدا کر دیتا اور عجب دلکشی رکھتا ہے۔

نامور فرگسن[1] سلطان التمش کے روضہ واقع پرانی دہلی کو ہندوستان کا سب سے پرانا مقبرہ بتاتا اور لکھتا ہے کہ یہ مختصر تو ضرور ہے لیکن اس میں ہندوؤں کی صنعت کے نفیس و بہترین نمونے جہاں تک کہ اسلامی شعائر، خصائص اور شوکت کے مغائر و منافی نہ تھے مناسب حال و شایان شان صرف کر دئے گئے ہیں جن سے یہ نہایت درجہ خوبصورت و دلآویز ہو گیا ہے۔ راقم سطور بلکہ یقیناً ہر ہوشمند دیکھنے والا بہ یک نگہ کہہ سکتا ہے کہ خسرو باغ کے مقبرے بھی اگرچہ مختصر ہیں، لیکن ان کی مجموعی کیفیت، مختلف وضع و متنوع طرز عمارت ایک خاص قسم کی

---

[1] ہندوستانی اور مشرقی تعمیرات کی تاریخ ۱۸۷۶ء۔ History of Indian and Eastern Architecture by Fergusson, 1876.

دلکشی اور جذبِ نظر اپنے اندر رکھتی ہے۔ اور ہر ایک میں کمال سادگی کے ساتھ ساتھ کمالِ فن و ہنر بھی نمودار ہے۔

سب سے پہلے جس فرض شناس حکمران نے ہمارے صوبہ کی عماراتِ قدیمہ کی طرف توجہ مبذول فرمائی، وہ (ممالک مغربی و شمالی کے لفٹننٹ گورنر) سر جان اسٹریچی Sir John Strachey تھے۔ تو اول اول ۱۸۶۸ء میں روضۂ ممتاز محل پر عنایت کی اور مرمت کرادی۔[1] پھر آگرہ اور الہ آباد کی دیگر بادشاہی یادگاروں پر نگاہ التفات ڈالی۔ اپنے صوبہ کی آمدنی و مالیہ سے بہت سا روپیہ دے کر ستھرا کے پرانے گرتے ہوئے مندر کو سنبھال لیا، درست کرادیا۔[2] خسرو باغ اُن کے دار الحکومت میں ایک ممتاز مقام تھا اور پبلک کے کام کی چیز۔ بقدر ضرورت اُس کی مرمت و درستی بھی ہوگئی۔ دلکش باغ اُس وقت بھی اپنے گزرے ہوئے دنوں کی دست بُرد اور امتدادِ زمانہ کی تاخت و تاراج کو ناقدری و حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ جو اپنی جوئبہائے شیریں یعنی میٹھے پانی کے حوضوں اور بڑے بڑے کنوؤں اور چشمۂ فیض باؤلی سے سارے شہر کو سیراب کر رہا تھا۔ جس کے ستھرے اندازِ چمن بندی و تناسبِ اجزا کی اُس وقت بھی داد مل رہی تھی۔ جس کا ایک ایک پھول اور ایک ایک پتا، جس کے مقبروں کا ہر ریختہ و شکستہ پتھر اپنے شاہانہ تکلفات اور نازک ترتیبات کا آئینہ دار تھا۔ عروس البلاد الہ آباد میں گرمی کی شدت و تابش،[3] اور بعض اوقات سردی کی افسردگی و انجماد بھی، کائنات کی حسین و جمیل چیزوں کو مردہ کر دیتی ہے، مگر خسرو باغ کی معطر ہواؤں کے حیات بداماں جھونکے اُس وقت بھی تازہ زندگی پھونک دیتے تھے۔

دُنیا بدل گئی ہے، وہ ہیں ہمیں کہ اب تک   اپنے مقام پر ہیں، اپنے مکان پر ہیں

---

[1] ہینڈ بک آگرہ و تاج، از مسٹر ہیویل، صفحہ ۴۶۔ [2] ڈسٹرکٹ گزیٹیر متھرا ۱۹۱۱ء، صفحہ ۲۴۴۔ [3] الہ آباد اور الہ آباد کی گرمی کو بعض شعرانے بھی اپنے اپنے طرزِ خاص سے یاد کیا ہے۔ ایک بذلہ سنج کہتا ہے

زگرمیِ محبت ایں شرف زار   الہ آباد، گشتہ آذر آباد

مرزا غالب ایک قصیدۂ منقبت میں فرماتے ہیں

نفس بہ لرزہ ز بادِ نہیبِ کلکتہ   نگاہ خیرہ ز ہنگامۂ الہ آباد

(کلیات، مطبوعۂ لکھنؤ ۱۸۷۲ء، صفحہ ۱۹۷)۔

اس کے چھبیس ستائیس برس بعد "مغل اعظم" کے صحیح جانشین اور اُس کی عظمت و سطوت رفتہ کے وارث و قابض لارڈ کرزن آنجہانی نے دیرینہ سال عمارات کے ابقاء و پرداخت میں وہ سعیِ مشکور فرمائی جس کے لئے ہندوستان کے باشندے، بالخصوص احسان شناس مسلمان ہمیشہ زیرِ بارِ منت و شکر گزار رہیں گے۔ تمبولن بیگم کے گنبد کا خالی کرا دینا، اور اُس کے عوض میں[۱] سوپرنٹنڈنٹ باغاتِ الٰہ آباد کے لئے ایک قصرِ پرتکلف مہیا کرا دینا اسی بلند حوصلہ امیر کا کام تھا۔ جس کا ذکر مناسب موقع پر عنقریب آئے گا۔

تم نے نگاہِ لطف سے رکھ لی ادب کی شرم ورنہ لبوں تک آ ہی چکا تھا گلا ابھی

مقبروں کی نگہداشت اور خسرو باغ کی آبیاری و آراستگی اِس وقت حکومت کے دستِ کرم کی ممنون ہے[۲]۔ باغ کے مصارف معقول نفع کے ساتھ خود اُس کی پیداوار سے پورے ہو جاتے ہیں۔ پھل پھول، پودوں، ہر قسم کے درختوں اور قلموں سے اچھی خاصی آمدنی ہوتی ہے۔ یہاں[۳] کے گلاب اور گلاب کی قلمیں مشہور اور بڑی قدر کی چیزیں ہیں۔ الٰہ آبادی امرودوں کی پودھ اس باغ کی قابلِ اعتبار اور اچھی سمجھی جاتی ہے۔ منتظمین نے تین تین[۴] ایکڑ کے دو قطعے میوہ کے درختوں اور پودھ کی پرورش گاہ اور پھل پھول کی بہار دکھانے کے لئے محفوظ رکھے ہیں۔

انگریزی پیمائش سے باغ کا کُل رقبہ ۴۰.۶۷ ایکڑ ہوتا ہے۔ انتظامی ضرورتوں اور سہولتِ کارروائی کے لئے اس کی تقسیم دو حصوں میں کر دی گئی ہے۔ ایک قطعہ ۳.۶۷ ایکڑ کا محکمۂ آثار قدیمہ یعنی آرکیالوجی کل ڈیپارٹمنٹ[۵] کے نام سے ہے۔ دوسرا سینتیس ایکڑ کا زیرِ اہتمام و انتظام محکمۂ زراعت[۶] ہے۔ عملی طور پر دونوں قطعے اور ان کی نگرانی محکمۂ زراعت کے ایک ذمہ دار افسر کے ہاتھ میں ہے۔ اور محکمۂ مذکور کی سالانہ رپورٹوں میں دونوں کے بقدرِ ضرورت حالات اور درستی و ترقی کی کیفیت مندرج و شائع ہوتی رہتی ہے۔ دونوں ٹکڑوں یعنے آرکیالوجی کل اور زراعتی کا تذکرہ جداگانہ حصوں میں ہوتا ہے۔ آرکیالوجی[۷] کل حصہ کی ترتیبِ جدید حال میں

---

۱ ڈسٹرکٹ گزٹیر جدید، صفحہ ۲۰۳۔ ۲ ڈسٹرکٹ گزٹیر جدید، صفحہ ۲۰۲۔ ۳ رپورٹ باغات سرکاری بابتہ ۳۰-۱۹۲۹ء صفحہ ۹۔ ۴ ایضاً، صفحہ ۹۔ ۵ ایضاً، صفحہ ۱۰۔ ۶ ایضاً، صفحہ ۹۔ ۷ رپورٹ انتظامی باغات سرکاری، صوبجات متحدہ، بابتہ ۲۹-۱۹۲۸۔ صفحہ ۱۰۔

عمل میں آئی ہے اور چار پانچ سال ہوئے ختم ہوئی ہے۔ پرانی سڑک جو فاصل تھی دور کردی گئی، جس کی نسبت کہا جاتا تھا۔

مقبروں کے درمیاں سے پیچ و خم کھاتی ہوئی   راہ ہے افسانۂ ماضی کو دہراتی ہوئی

نئی سڑک ایک دلکش روش پر ہموار اور سطح کے برابر، نئی ترتیب کے مناسب حال بنائی گئی ہے۔ پائپ کی لائن نئی قائم کی گئی ہے۔ فوارے لگائے گئے ہیں۔ تاریخی عمارات کے لئے موزوں و مناسب ترصیع کی گئی ہے اور نہایت دلکش و دلآویز ماحول مہیا کردیا گیا ہے۔ پرانی باؤلی کے متصل دیواروں پر بیلیں چڑھائی گئی ہیں۔ اس کے لانوں کے شکستہ حال ٹکڑوں کی مرمت کردی گئی ہے۔ خسرو کے مرکزی مقبرہ کے گرد جو کبھی پھولوں کی کیاریاں تھیں، ان میں اب سر سبز و شاداب، سدا بہار پھلواڑی لگادی گئی ہے۔ باغ کے گلگشت و نظارۂ و تفریح سے حکمراں اور محکوم جماعتیں اور اعلیٰ اور ادنیٰ طبقے دونوں یکساں متمتع ہوتے ہیں۔ اس محکمہ کی رپورٹ انتظامی میں اس کا اندراج "تاریخی یادگاروں کے باغ واقع خسرو باغ"[1] کے نام سے کیا جاتا ہے۔ زراعتی حصہ ۷۳ ایکڑ کا ہے، اس کا شمار "پراونشیل گارڈنیس" کی مد میں ہوتا ہے[2]۔ اس کی آراستگی و وسائل آمدنی کا ابھی تذکرہ کرچکا ہوں۔ اس کے لانوں پر نئی گھانس نئے قسم کی لگائی گئی ہے۔

اس سبزہ زار یا ہرے بھرے گھانس کے لمبے چوڑے قطعات پر پہنچ کر مجھ ایسے پریشان خیال سیلانی کا دھیان خود بخود ایک دوسری طرف منعطف ہوجاتا ہے۔ یہاں دو اکبر گزرے ہیں۔ ایک اکبرِ اعظم، دوسرا اکبرِ اکبر۔ اکبرِ اعظم نے اس شہر کی بنیاد ڈالی۔ بسایا۔ اور اللہ باس یا الہ آباد بنایا تھا۔ یہ تو تونگری و حشمت، دولت کی فراوانی اور شوکت و قوتِ سلطانی کا کرشمہ تھا۔ اس کو پونے چار سو برس ہوئے۔ دوسرے یعنی اکبرِ اکبر نے اپنی سخن سنجی و شیریں کلامی اور ذہنی و دماغی کمال سے اس کی دائمی شہرت و بقا کی ضمانت فرمائی۔ یہ ہماری آنکھوں کے سامنے کی بات ہے۔ مرحوم اکبر جب اس جگہ پہنچا ہے تو بے اختیار چیخ اٹھا تھا۔

ساتھ سبزہ کے ہجومِ گل و سوسن نہ رہا   لان ٹینس کے لئے بن گئے شاہی گلزار

سب سے پہلے جس یورپین سیاح کے قدم یہاں آئے اور جس نے کم و بیش یہاں کے حالات قلمبند

---

[1] باغات سرکاری، صوبجات متحدہ، بابتہ ۲۹-۱۹۲۸، صفحہ ۱۱۔ [2] ایضاً بابتہ ۳۰-۱۹۲۹، صفحہ ۹۔

گئے وہ پادری پیٹر منڈے Peter Mundy ہیں۔ انھوں نے ۱۶۳۲ء میں اس مقام کو دیکھا تھا اور شاہزادۂ خسرو کے مقبرے اور اُس کی ترتیب و تزیین کا ذکر کیا ہے[1]۔ اُن کے دو سو برس بعد ۱۸۲۵ء میں بشپ ہیبر Rt-Revd. Reginald Heber, D.D. تشریف لائے اور وہ باتیں صفحاتِ تاریخ پر چھوڑ گئے،[2] جن کا بتانے والا نہ اُن سے پہلے کوئی گزرا تھا، نہ اُن کے بعد آیا۔ مشہور انگریزی صناع اور آرٹسٹ مسٹر ٹامس ڈانیال[3] Thomas Daniell بھی مستحق صد شکر و ستایش ہیں، جنھوں نے اپنے دورانِ سفر و سیاحت میں یہاں کی[4] بعض عمارتوں کے خریطے اور نقشے تیار کئے۔ یہ ۱۸۰۱ء میں یا اُس کے قریب خوش رنگ شائع ہوئے تھے، اور آج بھی بڑے بڑے کتب خانوں اور اُمرا کے ایوانات و قصور کی زیب و زینت ہیں۔ ادب و فضل کی دیوی، حسین و جمیل اشیاء کی شیدا، لفظوں میں تصویر کھینچ دینے والی فینی پارکس[5] Fanny Parkes بھی یہاں[6] آئی تھی اور "وانڈرنگس آف اے

---

[1] سفرنامہ، جلد دوم، صفحہ ۱۰۱۔ [2] ہندوستان کے بالائی ممالک کا کلکتہ سے بمبئی تک کا روزنامچۂ سیاحت مطبوعہ لندن، ۱۸۲۸ء، جلد اول، صفحہ ۲۴۳۔ Narrative of a journey through the Upper Provinces of India from Calcutta to Bombay in 1824-25. London. 1828. [3] اٹھارہویں صدی مسیحی کے رُبعِ اخیر میں دو صناع ٹامس ڈانیال اور اس کا بھتیجا ولیم Thomas Daniell and William ہندوستان آئے تھے اور سارے ملک کا دورہ کیا تھا۔ تمام قابل دید عمارتوں اور چیزوں کی تصویریں تیار کی تھیں۔ ولیم ساتھ ساتھ روزنامچہ بھی لکھتا جاتا تھا جو افسوس ہے کہ اب تک شائع نہیں ہوا۔ ورنہ بہت سی قابل آگاہی باتیں خسرو باغ اور الٰہ آباد کے متعلق اُس سے معلوم ہو جاتیں۔ اُس کے بعض انتخابات اور ٹکڑے متفرق طور پر چھپے ہیں۔ "بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ" Bengal Past & Present میں سر ایوان کاٹن Sir Evan Cotton نے دونوں کا مفصل حال بھی لکھا ہے۔ قُربِ دریا کی مقامات کی تصویریں دریا سے کھینچی جاتی تھیں (فتح گڑھ کیمپ از مسٹر سی ایل وولیس، صفحہ ۲۲۶ Fatehgarh Camp by Mr. C. L. Wallace۔ [4] امیر الدولہ گورنمنٹ لائبریری لکھنؤ میں، شاہ بیگم کے مقبرے، دیوار اور گنبدوں کا رنگین نقشہ وغیرہ۔ [5] مسز فینی پارکس بڑی وسیع النظر اور ہوشمند ذی استعداد تھیں۔ قلم و کاغذ کے ساتھ مشغولی اپنے صاحبِ

(بقیہ صفحہ ۷۲ پر)

بلگرم[1] میں بقدر قلیل حال لکھ گئی ہے۔

فارسی میں سب سے پہلے جن صاحب نے خسرو باغ کے حالات (مختصر سہی مگر) قلمبند کئے وہ مسٹر بیل مؤلف مفتاح التواریخ[2] ہیں۔ موصوف نے اس باغ اور مقبرہ کا ذکر سلطان خسرو کے ذیل میں اپنی انگریزی کتاب میں بھی فرمایا ہے[3]۔ مگر اس کو برائے نام کہنا چاہئے۔ پھر انگریزی میں جہانگیری سوانح کے سلسلہ میں ذی علم مستشرق بلاک مین J. H. Blochmann صاحب کا دلچسپ آرٹیکل اکتوبر ۱۸۶۹ء کے کلکتہ ریویو میں نکلا۔ اس کے بعد مسٹر ایسٹ وک Eastwick نے کتبوں کی طرف بھی توجہ فرمائی اور اُن کا منظوم متن[4] ترجمہ کر دیا، جو مرے صاحب کی ہینڈ بک صوبہ بنگالہ[5] Murray's Handbook for Bengal etc. میں موجود ہے۔ صاحب موصوف نے تحریر نہیں فرمایا کہ ان قطعات کی

(بقیہ صفحہ ۱۷) سیف وقلم روشن خیال باپ میجر ای سی آرچر E. C. Archer, Major سے ارث میں پائی تھی۔ وہ لارڈ کومبرمیر Lord Combermere کے اے ڈی سی رہے تھے ۱۸۳۳ء میں ان کا سفرنامہ "ٹورس ان اپر انڈیا" Tours in Upper India کے نام سے دو جلدوں میں چھپا تھا۔ اُن کے اُس دورہ میں جو ۱۸۳۸ء میں لارڈ آکلینڈ کے ساتھ ہوا تھا بیم صاحبہ بھی ہمرکاب تھیں۔ بیم صاحبہ کے شوہر مسٹر سی سی پارکس C. C. Parkes بنگال سیول سروس کے تعلق سے ۱۸۱۷ء سے ۱۸۴۶ء تک ہندوستان میں رہے تھے۔ وہ ۱۸۳۲ء میں الہ آباد میں کسٹم کے کلکٹر تھے۔ بیم صاحبہ اپنے چھوٹے سے خوش نما بجرے پر گنگا اور جمنا کا دریائی سفر اسی جگہ سے کیا کرتی تھیں۔ انھوں نے تمام اہم اور ضروری مقامات کو بڑی توجہ اور دلچسپی سے دیکھا تھا۔ مشہور و ممتاز لوگوں سے ملی بھی تھیں۔ انھوں نے اپنے سیاحت نامہ میں جو کچھ لکھا ہے اُس کی نسبت متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ہندوستان کی زندگی کے متعلق جتنی کتابیں اب تک شائع ہوئی ہیں ان میں سب سے اچھا اور قابل دید ہے۔ اس میں تمام حالات پوری تفصیل سے لکھے ہیں۔ اسی کی بدولت بیم صاحبہ کو بڑی شہرت و عزت نصیب ہوئی ہے۔ (ماخوذ از فتح گڑھ کیمپ، مؤلفہ مسٹر ولیس آئی سی ایس)

[1] پریاگ یا الہ آباد کی ہینڈ بک، مرتبہ ماڈرن ریویو آفس، صفحہ ۱۷۸۔ صفحہ ہذا:- [2] دو جلد میں ۱۸۲۲ء سے ۱۸۴۲ء تک۔ Wanderings of a Pilgrim [3] مطبوعہ ۱۸۴۹ء، صفحات ۳۴۴ وغیرہ [4] بیلس بیاگرافی کل ڈکشنری، صفحہ ۱۵۲۔ [5] وغیرہ، مطبوعہ ۱۸۹۲ء، صفحات ۳۶۳، ۳۶۴۔

نقلیں اُن کو کہاں سے دستیاب ہوئی تھیں مگر ترجمہ کی حالت اور اصل سے مطابقت کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ بیل صاحب کی کتاب سے لئے گئے ہیں۔ سب سے آخر ہمارے زمانہ کے مشہور علم دوست مسٹر ہنری بیورج Henry Beveridge نے اس طرف التفات فرمایا اور رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالہ جولائی ۱۹۰۷ء[1] میں ایک عالمانہ مقالہ شاہزادۂ خسرو اور اُس کے مدفن اور متصل کے مقبروں کی نسبت تحریر کیا۔ یہ لندن میں بیٹھ کر لکھا گیا تھا۔ اشعار و قطعات کی نقلیں ہندوستان سے سر رچارڈ برن Richard Burn کی معرفت حاصل کی گئی تھیں۔ سرمایۂ علم و واقفیت کافی اور ذرائع آگاہی و صحت قابلِ اطمینان نہ تھے، اس لئے غلطیوں کا رہ جانا ناگزیر تھا۔ خود اُن کو اعتراف تھا کہ ان قطعات (تاریخ) کی زبان کسی قدر مشکل ہے۔ اس وجہ سے اپنے ترجموں پر چنداں اعتماد و اعتبار بھی نہ رکھتے تھے۔ اطمینان خاطر کے لئے ہمہ دان و ہمہ زبان سر چارلیس لایل[2] Sir Charles Lyall کو دکھالیا تھا۔ انھوں نے پوری توجہ اور قابل قدر اعانت فرمائی تھی۔ زبان و مفہوم کا جہاں تک تعلق تھا ترجمہ تو درست ہو گیا مگر بیل صاحب اور سر رچارڈ برن کے کاتب کی غلطیوں کا ازالہ کیسے ہوتا۔ دور حاضر کے عدیم النظیر فاضل و زبان داں مسٹر ڈیوہرسٹ[3]

---

[1] صفحات ۵۹۷ لغایتہ ۶۰۲۔ [2] سر چارلس جے لائل بڑے نامور مستشرق اور عربی کے متبحر فاضل گزرے ہیں۔ عبید اسدی اور عامر کے دو قدیم و نایاب دیوانوں کو تلاش کر کے بڑے تحقیق و تدقیق سے مدون کیا اور ۱۹۱۳ء میں لیڈن میں چھپوایا تھا۔ حکومت کے دست و بازو اور ہندوستان کے قابل و زمانہ شناس منتظمین سے تھے۔ [3] اس جلیل القدر و عظیم المرتبت شخص نے ۲۸ دسمبر ۱۹۳۵ء کو انتقال فرمایا۔ چھیاسٹھ سال عمر تھی۔ چالیس سال ہوئے میرے وطن فرخ آباد میں حاکم ضلع تھے۔ علمی مناسبت و تعلق سے اس ہیچ مدان پر بے حد لطف و کرم فرماتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء کے جورنل (رسالہ) میں، رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کی استدعا پر، میری کتاب "حیات جلیل" پر تنقید فرمائی تو کمال عزت و احترام سے یاد کیا اور میرا اور میرے خاندان کا ذکر لکھا۔ حالانکہ میں ایک مدت سے سلسلہ مراسلت قطع کر کے خاموش ہو چکا تھا۔ وہ اُس زمانہ میں بھی عربی، فارسی، سنسکرت وغیرہ کے مختلف و متعدد مدارج و امتحانات میں سند فراغت حاصل کر چکے تھے۔ تاہم بلند تر نصابوں کے طے کرنے کا شوق و ولولہ دامن گیر تھا، جن کی تیاریوں میں برابر مشغول و منہمک رہتے تھے۔ حتیٰ کہ علوم و فنون مشرق کا یہ سرجوش چشمہ جلد سے جلد بڑھ کر فضل و کمال کا ایک مواج و زخار سمندر بن گیا۔ ان کا حافظہ قوی تھا۔ قوےٰ مضبوط تھے۔ جن کو مشقت و

R. P. Dewhurst نے جب ممدوح محسن اتفاق سے الٰہ آباد میں قیام گزیں تھے، اُن پر نظر ڈالی اور سوسائٹی مذکور کے رسالۂ جولائی ۱۹۰۹ء میں[1] اُن کی تصحیح اور بحالت ضرورت جابجا توضیح کر دی۔ بعض غلطیاں تو فاش تھیں، محض ٹائپ کی، مثلاً "سلمی" کی جگہ "معلی"۔ ان کے نقل یا بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

یادش بخیر، مسٹر طامس ولیم بیل T. W. Beale سب سے پہلے مورخ ہیں، جنھوں نے اپنے زمانہ کی ایک رائج ملک زبان (فارسی) میں خسرو باغ[2] اور اُس کے مقابر کا ذکر مفتاح التواریخ میں لکھا اور اُس کے بعد ایک اور کارآمد، جامع اور مفید کتاب "اورینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری" تحریر فرمائی۔ جس میں مشاہیر شرق کے ضروری اور پُر از معلومات مآثر[3] انگریزی میں لکھ دئے ہیں۔ مسٹر بیوریج کو اس کمی کا احساس ہے، "کہ مسٹر کین نے بیل صاحب کی کتاب (ڈکشنری) کو ترجمہ اور ایڈٹ تو کیا مگر تاریخوں کو چھوڑ دیا ہے"۔ "ان کو افسوس ہے کہ بیل صاحب کی کتاب پھر ۱۸۸۱ء کے بعد طبع نہیں ہوئی۔ مسٹر بیوریج کا خیال ہے کہ "مسٹر بیل یوریشین رہے ہوں گے، اور ضرور فارسی کے بڑے فاضل ہوں گے"۔ مسٹر کین H. G. Keene لکھتے ہیں کہ یہ بہت بڑی عمر پاکر ۱۸۷۵ء کے موسم گرما میں بمقام آگرہ فوت ہوئے۔ جہاں صدر بورڈ

(صفحہ ۷۳) ریاضتِ جسمانی سے قوی تر بنائے رہتے تھے۔ سولہ سال ہوئے سرکاری منصب اور ہمارے ملک کو خیرباد کہہ کر انگلستان چلے گئے۔ آکسفورڈ میں قیام اختیار فرمایا، جہاں آغاز شباب اور طالب علمی کا کچھ وقت ریاضیات کی تکمیل میں گزرا تھا۔ مسٹر ڈیوہرسٹ کی سی قابلیتیں اور فضل و کمال کسی فرد واحد میں کم جمع پائے گئے ہیں۔ شرقیات کے جملہ شعبوں میں ان کا کمال مُسَلَّم اور عدیم المثال تھا۔ یہ تمام آریائی اور سامی زبانوں پر یکساں عبور و تبحر رکھتے تھے۔ سنسکرت اور اَوَستا پر ان کی قدرت اگر غیر معمولی اور تعجب انگیز نظر آتی تھی تو عربی و عبرانی کے فضلا اور اہل زبان اُن کے تبحر سے متحیر و ششدر ہو جاتے تھے۔ تلامذہ کی کثرت، درس و تدریس کی حالت بھی ویسی ہی حیرت افزا تھی۔ ایک طرف، ہندوستان کی سیول سروس کے لئے انگریز نوجوانوں کو "ہندوستانی" کی تعلیم دیتے تھے، تو دوسری طرف، سوڈان کی ملازمت کے خواہشمندوں کو عربی کے امتحانات کے واسطے تیار فرماتے۔ السنۂ مشرقیہ کے اسکول میں متعلمین کو "آزر" کے قابل، قابل بناتے تھے۔

صفحہ ہٰذا:۔ [1] صفحات ۴۴۶، لغایۃ ۴۴۹۔ [2] صفحات ۴۴۳ لغایۃ ۴۴۴۔ [3] رسالہ رایل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۷ء، صفحہ ۶۰۳۔

مال کے دفتر میں محض ایک کلرک کی حیثیت سے ملازم تھے[۱]۔ لیکن ڈھاکہ کے ٹیلر صاحب Taylor بہار کے کرسچین صاحب Christian اور مانشیر ایمان (معروف بہ حاجی مصطفیٰ۔ M Raymond مترجم سیر المتاخرین) کی طرح کتنے[۲] ایسے زندۂ جاوید نام ملیں گے جو بہت سی مستقل اور ہمیشہ رہنے والی کارآمد اور مفید تالیفات چھوڑ گئے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں بہت سے بلند مرتبہ یورپین افسروں کی کیا عزت ہو سکتی ہے۔ سر ہنری ایلیٹ صاحب کی تاریخ کا اختتام بیل صاحب کی تاریخ کے ذکر اور ان کی قلمی اعانت کے اعتراف پر ہوا اور بالکل بجا ہوا ہے۔ اُمید ہے کہ ان کے مدفن کا پتہ اور علم ہوگا، اور اس پر پتھر بھی ہوگا۔ نامور فاضل مسٹر ای بی ایسٹ وک (سی۔ بی) نے مرے کی ہینڈ بک Eastwick in Murray's Handbook میں کیتھرائن بیل Catherine Beale کی قبر کا ذکر کیا ہے، جو اگست ۱۸۵۷ء میں فوت ہوئی تھیں۔"

پروفیسر ڈوسن Dowson نے بھی اپنی تاریخ ہند کی آٹھویں جلد میں ان کا تذکرہ کیا ہے[۳]۔ مسٹر بیل کے اس تذکرہ پر بعض مغرب پرست حضرات چین بہ جبیں ہوں گے اور یہاں شاید بے محل قرار دیں گے۔ راقم ہیچمداں کے خیال میں کسی علمی یا تاریخی تحریر کو محض پٹواری کی کھتونی نہ بنانا چاہئے جس کی خانہ پری بلا از دیاد حرف کافی و وافی سمجھی جائے اور خلاف ورزی مستوجب باز پرس متصور ہو۔ جس زندہ جاوداں شخص نے اپنی جنبش قلم سے خسرو باغ کو صفحاتِ کاغذ پر حیاتِ تازہ بخشی، کیا وہ اس قدر اعتنا و التفات کا بھی مستحق نہیں ہے۔ وہ جو نہ صرف خسرو باغ، نہ صرف الٰہ آباد، نہ صرف ہندوستان، بلکہ پورے مشرق، براعظم ایشیا سے بھی کچھ زیادہ کا محسن و خدمت گزار ہے!

افسوس ہے کہ ان مقبروں کے حالات تفصیل کے ساتھ درکنار، برائے نام بھی کسی پرانی کتاب میں

---

[۱] اورنیٹل بیاگرفی کل ڈکشنری، مطبوعہ ۱۸۸۱ء۔ تمہید، صفحہ اوّل۔ [۲] یہ تینوں صاحب مخلوط النسل تھے اور کسی بڑے عہدہ تک نہیں پہنچے، مگر علمی و ادبی سرمایہ کثیر چھوڑ گئے ہیں۔ سیر المتاخرین کے ترجمہ سے زیادہ اُس کی تمہید اور شیریں زبان قابل مطالعہ و تحسین ہے۔ ایک پیوندی فرانسیسی اور ایسی پیاری انگریزی! وہ جس کی عمر ہندوستان میں گزری تھی یا کچھ برس حجاز وعرب میں!! [۳] "تاریخ ہند خود اہل ہند مورضین کے قلم سے" مطبوعہ ۱۸۷۷ء۔ ٹرنبر کمپنی۔

نہیں ملتے۔ اور مسٹر بیل نے جس قدر تحریر[1] کئے ہیں، اُن سے کسی تشنۂ تحقیق وتجسس کی تسکین نہیں ہوتی۔ اُن کی مختصر تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں چار روضے ہیں جن پر عالیشان گنبد بنے ہیں :-

(۱) چھوٹا سا، پچھم طرف، معلوم نہیں کون دفن ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ بی بی تمبولن کا روضہ ہے۔

(۲) عمارت سنگین وگنبد، مادر خسرو کا مزار ہے۔

(۳) روضہ وسط باغ میں، بڑے دروازے کے مقابل۔ سلطان خسرو کی ہمشیر نے ۱۰۳۴ھ میں اپنے دفن ہونے کے لئے یہ عمارت بنوائی تھی کہیں اور مر کر خالی رہی۔ شعر بہت سے لکھے ہیں۔

(۴) روضہ سمت مشرق، مرقد خسرو۔

گزیٹیر سابق کے ذی علم مؤلفین کی جماعت نے جو مسٹر اسٹیل، مسٹر فشر اور مسٹر (حال سر) جان پرسکوٹ ہیوٹ C. D. Steel, J. H. Fisher & J. P. Hewett پر مشتمل تھی صرف امور ذیل کے لکھنے پر قناعت کی۔

(۱) اس[2] راجپوت ملکہ کی قبر مع اس کی بیٹی اور بیٹے خسرو کے مقبروں کے خسرو باغ میں واقع ہے۔

(۲) سڑک کے دوسری[3] طرف وہ مکان ہے جس میں سوپرنٹنڈنٹ باغ کی بود وباش ہے۔ عام روایات کے مطابق تمبولی بیگم کا مکان کہلاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ وہی شاہزادی ہو جو فتح پور سیکری میں استامبولی بیگم کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔

جدید گزیٹیر میں کرنیل نیویل نے اسی قدر[4] لکھا ہے کہ "خسرو کی ماں" "رانی" نے افیون کھائی۔ وہ اس باغ میں دفن ہے۔ اسی جگہ خسرو اور اُس کی بہن کے بھی مقبرے ہیں۔" دوسرے موقع پر اضافہ[5] فرماتے ہیں:-

۱۔ خسرو یہاں کے چاروں مقبروں میں سے بالکل اخیر، پورب کے مقبرہ میں دفن ہے۔

۲۔ دوسرا مقبرہ، خسرو کی بہن کا ہے جو ۱۶۲۵ء میں مری تھی۔ اس میں بہت سے کتبے ہیں، مگر اکثر اب

---

[1] مفتاح التواریخ، صفحات ۳۳۵ لغایۃ ۳۳۷۔ [2] ڈسٹرکٹ گزیٹیر سابق، صفحہ ۱۳۰۔ [3] ایضاً صفحہ ۱۲۵۔ [4] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، صفحہ ۱۶۹۔ [5] ایضاً صفحہ ۲۰۳۔

شکستہ حالت میں ہیں۔

۳۔ تیسرا، خسرو کی ماں کا ہے۔

۴۔ باغ کے عین وسط میں چوتھا مقبرہ ہے، جو تمبولن کا کہلاتا ہے۔ کچھ عرصہ تک افسر منتظم باغ کا مسکن بنا تھا۔

ان صاحبوں نے اور جو دو ایک باتیں، کام کی لکھی ہیں، وہ ہر مقبرہ کے جداگانہ حالات میں نقل کی جائیں گی۔

ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر Dr. W. W. Hunter ڈائرکٹر جنرل امپیریل گزیٹیر آف انڈیا نے بھی صرف چند لفظوں میں خسرو باغ کا تذکرہ ختم کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں[1] کہ "یہ باغ اور روضۂ شاہزادۂ خسرو، ریلوے اسٹیشن کے متصل ہے۔ مقبرہ پر ایک خوبصورت گنبد دار عمارت تاج کے طرز کی بنی ہے، اس کے اندر پھولوں اور چڑیوں کی تصویریں ہیں۔ دو اور چھوٹے چھوٹے مقبرے اُس کے متعلق ہیں۔"

تاج کی نظیر شاید اُس کی بے نظیر شہرت و نام کے سبب سے آپ نے پیش کی ہے، ورنہ وہ تو سالہائے دراز کے بعد بنا ہے۔

آپ نے دیکھا گزیٹیر والوں نے کس اختصار سے کام لیا ہے! مفتاح التواریخ ہو یا کوئی ہینڈ بک گزیٹیر۔ ان کی تحریروں میں فرق محض طرزِ ادا کا ہے۔ بیل صاحب لکھتے تو داہنی طرف سے اور فارسی ہی میں ہیں، مگر مغربی انداز پر پہلے بائیں جانب نظر ڈالتے اور بائیں ہی سے شروع کرتے ہیں۔ مسٹر اسٹیل باوجود اپنی مغربی و افرنگی جبلت و وضع کے پہلے داہنی سمت دیکھتے اور اُسی طرف سے لکھنے لگتے ہیں۔ کرنیل نیویل نے جو قلم اور تلوار دونوں پر یکساں قدرت و قوت رکھتے ہیں، اس مہم میں جادۂ کہن یعنی اسٹیل صاحب کی مختصر نگاری کی فرسودہ روش سے ہٹنا گوارا نہیں فرمایا۔ ایک متبع یا مقلد کی طرح قدم بہ قدم چلے اور ایک ناقل کے طور پر انھیں کے الفاظ کم و بیش دُہرا دئے ہیں۔

ڈاکٹر فوہرر اپنی کتاب "صنادید ہند"[2] میں اتنا لکھ کر خاموش ہو گئے کہ "یہاں خسرو، اُس کی ماں اور بہن کے مقبرے اور تمبولن بیگم کا مکان ہے۔" اس تحریر میں نہ کوئی سلسلہ ہے نہ ترتیب۔ نہ اچھا کہتے ہیں نہ بُرا۔ پھر کوئی کیا کہہ سکے گا!

مسٹر ہیوریچ[3]، ایسٹ وک صاحب کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ نور جہاں کا بھی ایک خالی مقبرہ

---

[1] مطبوعہ ۱۸۸۳ء کے صفحہ ۱۹۸، جلد اول۔ اور صفحہ ۸۳ پر بھی ذکر ہے، مطبوعہ ۱۸۸۹ء۔ [2] جلد دوم بابتہ ممالک مغربی و شمالی و اودھ، صفحہ ۱۳۰۔ [3] جورنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۷ء، صفحہ ۶۰۷، نوٹ ۲۔

یاسینوطاف[1] Cenotaph خسرو باغ میں تھا۔ موصوف نے خیال نہیں فرمایا کہ نور جہاں کب اور کہاں مری ہے۔ اُس کا تاجدار رفیق کتنے دن پہلے دُنیا سے رُخصت ہو چکا تھا، اور کون ایسا دردمند و منت شناس باقی تھا جو کوئی یادگار تعمیر کرتا۔ پھر الہ آباد سے نور جہاں کو تعلق کیا تھا؟

ایک کارآمد و راحت رساں چیز جو اگلے زمانہ کی اہم اور ضروری تعمیرات میں داخل تھی اور یہاں بھی موجود تھی، ایک شاندار باؤلی تھی۔ حال کے مورخین نے وطنی ہوں یا مسافر، اُس کے بارہ میں کچھ نہیں لکھا۔ صرف پیٹر منڈے صاحب نے جو ۱۶۳۲ء میں یہاں آئے تھے تحریر فرمایا ہے[2]:۔

"خود باغ کے پاس ہی ایک خوبصورت باؤلی یا کنواں ہے۔ اس میں ایک سو بیس[120] سے زیادہ سیڑھیاں ہیں۔ خوشنما شہ نشین اور محرابیں ہیں۔ چیونٹی کے درخت ہیں۔ گرمی میں رہنے سہنے کے لئے سرد خانے اور ٹھنڈے ٹھنڈے ہوادار مکان ہیں۔ جن کی دیواروں (کے تازہ تازہ پلاسٹر/فریسکو) پر تصاویر اور نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ اوپر سے نیچے تک پہنچنے کا راستہ اندر ہی اندر ہے۔ یہ راستہ وسیع، کشادہ، آسان گزار اور خوب روشن ہے۔ حتیٰ کہ ایک چھوٹا سا بچہ بھی نیچے چلا جاتا اور اپنے ہاتھ سے پانی لے لیتا ہے۔ ٹھیک اسی مقام کے اوپر جہاں کہ پانی ہے ایک کنوئیں کا اچھا سا منہ ہے۔ یہاں سے لوگ اپنے برتنوں، بیلوں اور اور طریقوں سے پانی کھینچ لیتے ہیں۔"

مسٹر ڈانیل نے اپنے نقشہ[3] میں ایک موقع رانی یا شاہ بیگم کے مقبرہ کے متصل بھی ہم کو دکھایا ہے۔ جس میں بلند چبوترہ اور ٹن وغیرہ بھی صاف نمایاں ہیں۔ بہت سے تماشائی، نیز حاجت مند، مرد و عورت، پانی لے جانے کے مختلف برتنوں اور جانوروں کے ساتھ، کھڑے، بیٹھے، چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ مگر یہ جگہ باؤلی کی نہیں، بلکہ باغ کے اندر کے کنوئیں کی معلوم ہوتی ہے۔ باؤلی کا انجام اُس کے مقام پر تحریر کیا جائے گا۔

پریاگ یا الہ آباد کی ہینڈ بک مرتبہ ماڈرن ریویو آفس میں اسی قدر لکھا ہے[4] کہ "پرانا کنواں اور پانی کی نہریں اور نالیاں ایسی خوبصورت ہیں کہ اُن کی تصویریں پیش کی جاتی ہیں۔"

---

[1] خالی مقبرہ جو کسی شخص کی یادگار میں جو کہیں اور دفن ہو، بنا دیا جائے۔ [2] سفرنامہ پیٹر منڈے، جلد دوم صفحہ ۱۰۱۔ اور مرے صاحب کی بنگالہ کی ہینڈ بک، صفحہ ۲۶۴۔ نیز پروفیسر بینی پرشاد کی تاریخ جہانگیر، صفحہ ۳۴۰۔ [3] موجودہ امیر الدولہ گورنمنٹ لائبریری لکھنؤ۔ [4] صفحہ ۵۰۔

بیوریج صاحب فرماتے ہیں[1] "کہا جاتا ہے کہ خسرو کے دو بیٹے بھی خسرو باغ میں دفن ہیں"۔

سلطان خسرو اور شاہ بیگم کے پہلوؤں میں متعدد چھوٹی بڑی قبریں موجود ہیں۔ کوئی کتابہ نہیں نہ کسی تاریخ میں تذکرہ ہے۔ اس لئے ان شاہزادوں کے مرقد کا وثوق وصحت کے ساتھ تعین کرنا اس وقت دشوار ہے۔ آج کل کے بعض کم محنت آسان پسند لوگوں کا شیوہ بلاتحقیق وتلاش ہر بات میں دخل در معقولات کرنا اور اپنی ہمہ دانی کے اظہار کے لئے کچھ نہ کچھ لکھ دینا ہے۔ میرے نزدیک یہ کوئی مستحسن اور پسندیدہ روش نہیں۔ ورنہ یہ کہہ دینا سہل نیز قرین قیاس ہوتا کہ خسرو کی قبر کی بغلوں میں جو لڑکے دفن ہیں، یہی شاہزادے ہیں۔ کب مرے اور کس عمر میں۔ خسرو سے کتنے دن بعد۔ کیا نام تھا۔ آج ان سوالات کا جواب شافی کون دے سکتا ہے؟

باغ کے اندر داخل ہونے کے بعد، بلکہ پھاٹک میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی، ان عمارات پر میری نگاہ دفعتہً جس سلسلہ وترتیب سے پڑی تھی حوالۂ قلم کرتا ہوں اور وہ کرنیل نیویل کی تحریر کے مطابق ہے۔

داہنی طرف سے سڑک کے ایک جانب،

پہلا خسرو کا مقبرہ۔ گنبد دار، رفیع ووسیع۔ کواڑ بھی ہیں۔ بغلوں میں دو لڑکے۔ پھر کچھ ہٹ کر سنگین حوض ہشت پہل مع فوارہ۔ ویران وخشک اُسی لائن میں۔

دوسرا۔ (حسب روایات زبانی ونا قابل اعتماد بلکہ لغو) خسرو کی بی بی کا۔ بلند گنبد لیلیٰ بیگم کہلاتی ہے۔ قبر کا نشان ندارد ہے۔ مسٹر بیل اور گزیٹیر والے اس کو خسرو کی بہن، سلطان النسا یا سلطان بہار بیگم کا لکھتے ہیں، اور یہی قرینِ قیاس وقابلِ قبول ہے۔

پھر ویسا ہی ہشت پہل سنگین حوض اور فوارہ۔

تیسرا شاہ بیگم کا۔ سہ منزلہ مختصر قبہ اوپر ہے بیگم کی داہنی طرف، دو قبریں۔ بائیں جانب دو پہلو کی صحنچیوں میں بھی قبریں ہیں۔ کواڑوں سے محفوظ ہے۔

ان مقبروں کے پیچھے حوض کی پشت پر قدِ آدم پردہ کی دیوار۔ جس سے کبھی پانی کے جھرنے اور آبشار رواں رہے ہوں گے۔

دوسرے قطعہ میں پچھم طرف۔ اس قطار سے علیٰحدہ، تمبولن یا تبولن بیگم کا۔

---

[1] جونل رایل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۵ء، صفحہ ۶۰۰۔

ان کی تیسری ترتیب تو قدرتی یعنی تعمیروزمانۂ تعمیر کے لحاظ سے یہ ہونا چاہئے تھی۔

۱۔ شاہ بیگم۔ ۱۰۱۲ھ

۲۔ خسرو۔ ۱۰۳۱ھ

۳۔ سلطان بہار بیگم۔ ۱۰۳۴ھ

۴۔ تمبولن کا۔ لامعلوم

پہلی قبر بناتے وقت کس کو خیال ہوگا کہ یہاں اور شاہزادے اور بیگمیں بھی کبھی دفن ہوں گی۔ بعد کی تعمیرات میں بھی سوء اتفاق سے کوئی سلسلۂ ترتیب ملحوظ نہ رکھا گیا۔ محض گنجایش پر نظر ڈالی گئی۔ جہاں جگہ پائی آباد کر دیا۔

دو چیزیں اور باقی رہ جاتی ہیں:۔

ایک، شاہزادۂ خسرو کے مقبرہ کے پائین، مستطیل چبوترہ۔ جہاں مرزا جہانگیر مرنے کے بعد دفن رہے تھے، پھر لاش دہلی بھیجی گئی تھی۔ عوام کالانعام کی حماقت وجہالت سے یہ جگہ اب خسرو کے گھوڑے کی قبر کہلاتی ہے۔ اس کے بارہ میں مناسب موقع پر تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے گی۔

دوسرا، ہشت پہل چبوترہ، جو سلطان بہار کے گنبد اور خسرو کے مقبرے کے سامنے، روش کے اُس طرف، دوسرے قطعہ میں "بینڈ اسٹینڈ" بنا ہوا ہے۔ یہاں والوں کی زبان میں "باجا جگہ" کہلاتا ہے۔ تین چار برس پہلے تک یہاں بڑے دن (دسمبر) کے سلسلہ میں اور بعض اور موقعوں پر سیر و تفریح کے جلسے اور کھیل تماشے ہوا کرتے تھے۔ اسی چبوترہ پر باجا بجتا تھا۔

زبانی روایت ہے کہ یہ چبوترہ بھیں کے مصالح اور پتھروں سے بنا تھا۔ اس کی سنگتراشی اور نقاشی کی یکسانی بھی، شاہد حال ہے۔ اب یہ انگریزی کھیل تماشے دوسری دوسری جگہ ہونے لگے ہیں، تو گورستانو کے ایسا سکوت اور سناٹا اس محل خاموشاں میں بھی ہمہ وقت وہمہ حال چھایا رہتا ہے۔ منفرد و متفرق زائر وسیاح یا شہر کے بعض بے فکرے کبھی کبھی آنکلتے ہیں۔ اب نہ کوئی چہل پہل ہونے پاتی ہے نہ زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ تاہم

اے عروسِ شرق! سیرِ شب کو جب آتا ہوں میں

محوِ نازش اپنے جلووں میں تجھے پاتا ہوں میں

(۳)

رانی مان بائی - ''شاہ بیگم''

(شاہنشاہ جہانگیر کی پہلی بیگم - جےپوری)



عمل آقا رضا مصور جہانگیری -

فردوس نشین شیخ محمد حسین رئیس قنوج کے ذخیرۂ نوادر سے حاصل کی گئی

[illegible]

شاہ بیگم

پرسکوں حُسن و محبت کا یہ اک طوفان دیکھ ‏‏ جس کے حُسن و عشق دو عنواں ہیں وہ رومان دیکھ

سب سے پہلا جنازہ جو اس گل زمین[51] پر اُتارا گیا، وہ شاہ بیگم کا تھا۔ شاہ بیگم جے پور کی راجکماری جہانگیر کی پہلی بی بی اور شاہزادۂ خسرو کی ماں تھی۔ شاہ بیگم کا اصلی نام کسی پُرانے مورخ نے نہیں لکھا۔ مسٹر بیل جودہ بائی بتاتے ہیں[52]۔ لیکن اُنھوں نے خسرو کے چند مختصر حالات لکھنے میں بھی چنداں تحقیق اور کاوش و احتیاط سے کام نہیں لیا۔ پروفیسر کونسل کشور نے "بڑی بیگم" اور "رحمت آرا بیگم" لکھا ہے[53]۔ بڑی بیگم مالکہ کا ہندوانہ نام نہیں ہو سکتا۔ مزید براں "بڑی" کا لفظ اُس وقت تک حرم سرائے سلطانی میں داخل نہیں ہوا تھا۔ "زنِ کلاں" رائج تھا اور تاریخوں میں یہی ملتا ہے[54]۔ ابوالفضل نے "آئینِ الوُس مغول" میں "حرم کلاں" لکھا ہے[55] اور محمد شفیع نگینوی نے اپنی کتاب مرأتِ واردات میں "سرخیل زوجات"[56]۔ رحمت آرا بیگم کسی ترکیب سے نہ زندوں کا نام ہو سکتا ہے نہ مُردوں کا لقب۔ رحمت کی آرایش کیا معنی رکھتی ہے۔ رحمت النسا تک لکھتے تو ماننا پڑتا، کیونکہ عالمگیر کی ملکہ نواب بائی راجپُوتا جو والی ریاست رجوری، ملک کشمیر کی بیٹی کا نام تھا[57]۔

---

۵۱ تاریخ جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرشاد، صفحہ ۶۴۔

۵۲ مفتاح التواریخ، صفحہ ۳۳۵۔

۵۳ آرٹیکل مندرجۂ اخبار لیڈر مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء بعنوان تصاویر، اخبار مذکور ۱۱ اکتوبر۔

۵۴ آگرہ ہینڈ بک از ڈنکن صاحب، صفحات ۱۹ و ۴۱۷ سلطانہ رقیہ بیگم زنِ کلاں و تزک صفحہ ۱۸۴۔

۵۵ اکبرنامہ، جلد سوم، صفحہ ۵۸۲۔ ۵۶ مرأتِ واردات، برٹش میوزیم، نمبر ۶۵۷۹ Add ورق ۶۵۔ ممتاز محل دختر آصف خاں کہ سرخیل زوجات آں خسرو شیریں کردار بود۔ ۵۷ مقدمۂ رقعاتِ عالمگیر مطبوعۂ دار المصنفین صفحہ ۱۵۵۔

ڈاکٹر بینی پرشاد نے "مان بائی" تحریر کیا ہے[۵۱]۔ وہ مان سنگھ کی بہن تھی۔ اس لئے قرین قیاس ہے۔ اُن کی تحریر راجپوتانہ کی تاریخوں اور روایات پر مبنی ہے مسٹر فرانسیس گلیڈون Francis Gladwin نے بھی مان بائی لکھا ہے[۵۱]، اور دو بار لکھا ہے۔ اُن کی تاریخ ۱۷۸۸ء کی تصنیف ہے۔ لارڈ کارنوالس کی سرپرستی میں شائع ہوئی مسٹر ونسنٹ اسمتھ اس کی بڑی تعریف کرتے اور اُس کو عہد جہانگیر کا سنجیدہ، صحیح اور حسب واقع احوال، بتاتے ہیں۔ پرنسپل رنگا سوامی اینگر جہانگیر کے متعلق بہت سی باتوں میں گلیڈون صاحب کی تحقیقات اور تحریرات کو قابلِ ستائش، اور اُن کی تاریخی وقعت بے حد لکھتے ہیں[۵۲]۔ یہاں کے سابق حاضر باش خادموں کی حالت یہ ہے کہ جتنے مُنہ اُتنی بات۔ کوئی جودھا بائی کہتا ہے کوئی جیا رانی، کوئی پربیا۔ اگر ان کا کہنا اپنی موروثی معلومات اور پشتینی روایات پر مبنی ہوتا تو یقیناً آج کل کے بعض غیر محقق مورخوں سے ان کی بات زیادہ ماننے کے قابل ہوتی۔ مگر شاید جیا رانی اس کی پھوپھی اور ساس ملکۂ مریم زمانی کا عرف تھا۔ اسی طرح جودھ بائی اسکی چھوٹی سوت جگت گوشائیں یا بالمتی (شاہ جہاں کی

---

۵۱ تاریخ جہانگیر، صفحات ۲۸و۲۹و۳۰ و انڈکس صفحہ ۴۹۹ ۵۲ تاریخ جہانگیر، صفحہ ۳۔ نوٹ۔

۵۳ تمہید تاریخ جہانگیر، صفحات ۱و۱۱ ۵۴ جودھ بائی کی اس پہلی اولاد کی نسبت نواب نصیر حسین خان لکھتے ہیں :۔
وہ خوم کی پیدائش پر جوجشن ہوا اور حرم سرا میں جو خوشیاں منائی گئیں وہ ترکانہ نہیں، ہندوانہ تھیں۔ یہ پیدا ہوا تو ساری رجپوتی ریت رسمیں برتی گیئں۔ زچہ خانہ تک گایا اور ہندی سُروں سے جی بہلایا گیا سوائی جی شہزادے کو گود میں لئے ہوئے ہیں مگر ہاتھ نہیں لگاتیں۔ موتیوں کے تھال سامنے ہیں۔ مگر ان کی بھاویں نہیں لگتا۔ ایک ادا اور بڑے ناز سے سنا سنا کر کہتی ہیں کہ

مانگے ہے جودھا جی کا راج	لَلّا جی کا نال نہ چھوا ـــــئے
	شہزادہ
تھال بھر موتی جودھا رانی لائیں	وہ بھی نہ لیوے یہ دا ـــــئے

یعنی میں تو جب تک رانی جی کا آدھا راج پاٹ لکھا نہ لوں گی، ماننے والی اور شہزادے (لَلّاجی) کا نال کاٹنے والی نہیں۔ میرے آگے یہ تھال بڑا مال نہیں۔ اسے اٹھا رکھو۔ (مغل اور اردو صفحہ ۱۴)۔

کی ماں) کا عرفی نام ثابت ہوتا ہے[51] "رہا پرمیا"۔ ممکن ہے کہ کبھی پریا کہلاتی ہو مگر کسی تاریخ میں نظر سے نہیں گزرا۔ یہ لفظ ان اطراف میں، بہترین خاتون کے معنی میں مستعمل ضرور ہے اور عورتوں میں عزت و ادب کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔

صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کا مآثر الامرا میں یہ لکھنا کہ "سلطان خسرو اودے سنگھ عرف موٹا راجہ کی تان ستی' نامی لڑکی کے بطن سے متولد ہوا تھا"[52] ایک فاش بلکہ فاحش غلطی ہے۔ مان ستی' یقیناً بال متی کی کتابت کی عالم آشکار خرابی ہے جو ہی اودے سنگھ فرمانروائے مارواڑ کی بیٹی تھی۔ جس سے خسرو نہیں، خورم پیدا ہوا تھا[53]۔ معاف رکھئے سوانح نویسوں، اور اُس مقہور و بے بس بندۂ سلیم کو جو کہنے کو اُس وقت بھی ولی عہد اور کشور ہند کا آیندہ شہنشاہ تھا، جس پر عہد شباب میں معصیت کوشی، ہوس رانی اور ہوا پرستی کا الزام یار و اغیار ناحق لگاتے ہیں[54]۔ جو حقیقۃً بیچارہ و مجبور، محض معذور تھا۔ جس کی عافیت اور اُٹھتی جوانی بلکہ زندگی ہر سال مصالح ملکی، تعدیلاتِ سیاسی و انتظامی، تدابیرِ مملکت و جہانداری کی قربان گاہوں پر نذر چڑھائی جاتی تھی۔ جس کو اپنے بے ترس و ناخدا شناس باپ کی حکمت عملی، مرضی و خواہش پر روز روز تصدق ہونا پڑتا تھا۔ جس کے لئے کم عمری و حداثت سن میں بھی خود کام اُمرائے دولت کے عجز و نیاز، اعاظم سلطنت کی جاہ طلبی اور نمایشِ ایثار پر بی بیوں کی بھرتی جاری رہتی تھی[55]۔

---

۵۱ اورینٹل بیاگرفیکل ڈکشنری، صفحہ ۳۰۵۔ ڈونکن کی آگرہ ہینڈ بک، صفحات ۱۹ و ۲۷۔
۵۲ جلد دوم، صفحہ ۱۸۱۔ ۵۳ سیر المتاخرین (سلطنت مغلیہ)، صفحہ ۱۲۹۔

۵۴ یورپ کے درباروں اور بادشاہوں کی عشرت کوشی و عیش طلبی اور وہاں کے امرا اور درباریوں کی عصمت فروشی اور طمع جاہ و مال کے سامنے یہ الزام و اتہام کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتا۔ [نوٹ چہارم ملاحظہ ہو نیز صفحات ۱۱۳ و ۱۱۵۔]

۵۵ اکبری عہد کی تاریخوں میں اس کے متعلق بہت سی تفصیلات ملتی ہیں۔ ایک اکبرنامہ جلد سوم کو لیجیے۔

لایا تھا گو مرا دلِ وحشی مصیبتیں　　　لیکن تری نگاہ کو بھی اس میں دخل تھا

جو تخت و تاج اور کامل اقتدار و اختیار پاکر ایک[۱] اور صرف ایک' نورجہاں کا ہو کر رہا[۲]

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

(۱) حکیم مرزا کی حقیقی ہمشیر سے شاہزادہ سلیم کا عقد' صفحہ ۲۰۹۔

(۲) سعید خاں گکھر کی لڑکی۔ جس سے شاہزادی عفت بانو پیدا ہوئی تھی' صفحات ۵۰۹ و ۵۶۱۔

(۳) رائے رائے سنگھ کی لڑکی سے شادی۔ جس میں خود اکبر راجہ کے یہاں گیا تھا' صفحہ ۵۰۹۔

(۴) خواجہ حسن عم زین خاں کوکلتاش کی دختر' روشن ستارہ' پرویز کی ماں' صفحہ ۵۹۴۔

(۵) شاہزادی دولت نسا کی ماں' صفحہ ۵۹۷۔

(۶) کیشو داس راٹھور کی لڑکی' بہار بانو کی ماں' صفحہ ۶۰۶۔

(۷) موٹا راجہ کی لڑکی۔ جس سے بیگم سلطان پیدا ہوئی' صفحہ ۶۰۶۔

" " " خورم پیدا ہوا' صفحہ ۶۳۲۔

" " " ایک اور بیٹی پیدا ہوئی' صفحہ ۶۸۴۔

(۸) مرزبان تبت کا اپنی دختر کو بھیجنا اور شادی' صفحہ ۶۳۲۔

(۹ و ۱۰) مبارک خاں اور حسین چک کی بیٹیوں کا شاہزادے کے محل میں داخل ہونا' صفحہ ۶۵۹۔

(۱۱) راجہ علی خاں کی بیٹی کا شاہزادے سے بیاہا جانا' صفحہ ۶۸۰۔

(۱۲) عبداللہ بلوچ کی بیٹی' ایک شاہزادی کی ماں' صفحہ ۷۰۴۔

(۱۳) ابراہیم حسین مرزا کی بیٹی' یہ بھی ایک شاہزادی کی ماں تھی' صفحہ ۷۱۵۔
(۱۴) زین خاں کوکہ لڑکی' صفحہ ۷۵۶۔
(۱۵) رام چندر والی اور چھہ کی لڑکی۔ تزک جہانگیری' صفحہ ۷۷۔ و ترجمہ مآثر الامرا' از بیوریج' صفحہ ۴۰۷۔

صفحہ ۱۰۷ ملہ قرونِ وسطےٰ از مسٹر اسٹینلے لین پول' صفحہ ۳۱۷ بحوالہ سیاحت نامہ پیٹر وڈی لاویلے و سیاحت نامہ سر ولیم ہاکنس' جلد اول' صفحہ ۲۹۷ و ڈنکن صاحب کی ہینڈ بک' صفحہ ۳۰۔ او یماقِ مغل' صفحات ۴۲۳' ۴۴۴' ۴۵۳۔

لیکن ایام شاہزادگی میں اسی کی شبستانِ عشرت میں سات (تو صرف) رانیاں داخل کی گئی تھیں۔ اُن کا پتہ چلانا، نام و نشان بتانا کیا آسان بات ہے؟ تنہا صمصام الدولہ اور مسٹر بیل ہی نہیں بلکہ بہت سے لکھنے والے ایسی ہی غلط فہمی و غلط انکاری کا شکار ہوئے ہیں۔ کاش! تاریخ کے کسی ہوشیار مطالعہ کرنے والے کو توفیق رفیق ہو اور وہ دامانِ گورگان کی حریم۔ عشوہ و ناز، سراپردۂ خلوت و ناموس میں باریابی۔ تاکہ ان درونِ پردہ، محرمانِ رازِ سلطنت ازواج رانیوں کا تذکرہ لکھے اور معمولی معمولی غلطیوں کا ازالہ کر دے۔

خسرو باغ کی خاموش مگر مستقل آبادی کی بنیاد اسی عالی نژاد، نیک نہاد شاہزادی کے دم قدم سے پڑی، اس لئے اس باغ کی تاریخ میں اُس کی شادی اور آمد کے تزک و احتشام نیز اندوہناک انجام کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر ہونا لازم ہے۔

غوغائے عشق و شورِ جنون ماجرائے عقل　　افسانہ تو قصہ تو داستانِ تست

عصر جہانگیری کے تمام مورخ اس بارے میں متفق ہیں کہ جہانگیر کی پہلی شادی پندرہ سولہ سال کی عمر میں ہوئی۔ اور بڑے اہتمام اور تزک و احتشام کے ساتھ رچائی گئی تھی۔

(بقیہ صفحۂ گزشتہ) نمبر۵" نور جہاں بیگم حسنِ صوری کے ساتھ خوبی ہائے معنوی بھی بے شمار رکھتی تھی۔ اس کی رسائی طبع و درستی سلیقہ و شعور تند اور فکر بریدہ یگانۂ زمانہ تھیں۔ بادشاہ کہا کرتا تھا کہ جب تک وہ میرے گھر میں نہیں آئی تھی، میں زینت خانہ اور کدخدائی کے معنے سمجھتا ہی نہ تھا۔ اکثر زیور اور لباس اور اسباب تزیین و تقطیع کہ جو ہندوستان میں سو ڈیڑھ سو برس پیشتر رائج و معمول تھے اسی کی اختراع ہیں، جیسے دو دامنی پشواز کے لئے اور پنج تولیہ اوڑھنی کے لئے، اور بادلہ و کناری، اور عطرِ گلاب جو عطرِ جہانگیری سے موسوم ہے، اور چاندنی کا فرش۔ یہ بھی اُسی کا وضع کیا ہوا ہے" مرزا عبدالقادر خاں اوپناقِ مغل (صفحہ ۴۵۶) میں نور جہاں کی دستکاری، ہنرمندی و ذہانت کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔

حقیقتہً تفصیلات کے بیان میں بھی کچھ فرق نہیں کرتے۔ جو کچھ فرق ہے وہ طرزِ ادا، سخن طرازی اور انشاپردازی کا پایا جاتا ہے۔ ہر اہلِ قلم اپنے معاصر یا متقدم سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا اور ایک نقشِ رنگین آراستہ و پیراستہ کرنا چاہتا ہے۔

شاہنشاہی تاریخ نویس ابوالفضل علامی نے "آراستہ شدن بزمِ کدخدائی شاہزادہ سلیم" کے عنوان سے اس مبارک تقریب، اس کی مصلحتوں اور اس کے اہتمام کو مع ضروری تفصیلات کے اپنے شاندار طرز اور لاجواب انداز سے اکبرنامہ میں خوب لکھا ہے۔

"دسمہ ۲۹ جلوس ۹۹۲ھ ہلالی۔ دریں ہنگام بعرض ہمایوں رسید راجہ بھگونت داس کچھواہہ کہ از عقیدتمندی بہ پایۂ والاے امارت برآمدہ و باگزینِ نسب شرائفِ حسب را کہ ستودۂ خواہست فراہم آوردہ دخترے دارد گوہرِ پارسائی بہ پیرایۂ بزرگ تبرادی اوست بسیرت و صورت آراستہ۔ آرزومے ایں خاندان آنکہ آں پاک سرشت بداں مشکوئے مینومثال پیوندِ جاودانی یابد بشہریارِ قدردان خواہش پذیرفت و گردہے را شادی آمود گردانید و از آنجاکہ پیشینان ایں رازِ نہانی برملا اندازند و ہنگامہ آرایند و ننگ نشینِ اقبال برائے جشن آرائی کارشناسانِ جدگزیں نامزد فرمود۔ در کمتر زمانے دولت خانۂ خاص و عام را آئین بستند و نظارگیانِ دشوار پسند را دل از دست رفت جشن ہاے شوق افزود مجلس ہاے غم زدا انتظام گرفت و بخشش و بخشایش را روز بازار شد۔ عشرت و شادمانی را پایہ بلند گشت رسوم و ساچق و نثار و دیگر نیک عادت ہا بروشِ بزرگان والا ہمت پدید آمد۔ پنجم اسفندار فرکشور سرانِ ملک و بزرگانِ دولت منزل راجہ بفروغ قدسی لزوم روشنی افزود و پیوند یک جہتی بگزیدہ آئین انجام گرفت و ہماں روز آں پیکر قدسی را بشبستان اقبال آوردہ طرب کدۂ زفاف آراستند۔۔۔ امید کہ ایں پیوند جسمانی فروغ افزاے اقبال گردد و فرزندانِ والاخرد برخیزند"[۵۱]

---

[۵۱] اکبرنامہ جلد سوم، صفحات ۴۵۵ و ۴۵۶۔

ایک دوسرے جلیل المرتبت مُورخ مُلّا نظام الدین ہروی صاحبِ طبقاتِ اکبری سنہ [illegible]ھ یا آخر سنہ ۹۹۳ھ کے احوال میں فرماتے ہیں۔

"دریں اثنا ارادۂ جشنِ طوے حضرتِ شاہزادۂ سلطان سلیم از خاطرِ عاطرِ حضرتِ بادشاہِ جہاں بہرہ وجہت ایں نسبتِ عظیم پرتوِ آفتابِ عنایت پادشاہانہ بحال راجہ بھگوانداس تافت صبیۂ اورا لائق ومناسب ایں رابطۂ عظیم دانستند وحسب الحکم مجلس نشان بہشت بریں آرایش یافت وجہت اہتمام ایں آں حضرت خود بہ نفسِ نفیس در منزل راجہ بھگوانداس تشریف قدوم ارزانی داشتہ مجلسِ عقد در ہماں خانہ بحضورِ قضات و اشرافت منعقد گردید و مبلغ دو کرور تنکہ مہر صبیۂ راجہ مقرر شد۔ واز خانۂ راجہ بھگونداس گردو گوہر افشاندہ نثار می کردند۔

زبس گوہر و زر کہ افشاندہ شد   زبر چیدنش دستہا ماندہ شد

وراجہ بھگوانداس از اقسام جہیز از طلا آلات و پارچہائے نفیس واقمشہ وطویلہائے اسپاں وبکصد زنجیر فیل و غلامان وکنیزکانِ حبشی و چرکس و ہندوستانی چنداں بہ نظرِ اشرف گزرانید کہ محاسبانِ وہم اندیشہ از احصاء آں عاجز آمدند۔ مجلسِ بزرگانہ وجشنِ خسروانہ آراستہ شد"[51]

شریف الملک معتمد خاں تزک کے دیباچے[52] میں لکھتے ہیں کہ انتیسویں سالِ جلوسِ اکبری میں شاہزادہ کی عمر جب پندرہ سال کی ہوئی تو ۹۹۳ ہجری (۱۵۸۵ء)[53] میں راجہ بھگوانداس کی بیٹی (مان سنگھ کی بہن) سے اُس کی خواستگاری ونسبت

---

[51] طبقات اکبری، صفحہ ۳۶۶۔

[52] صفحہ ۹۰۱۔

[53] مسٹر ایچ جی کین نے "مغل ایمپائر" صفحہ ۱۱۱ میں ۱۵۸۶ لکھا ہے۔ فارسی تاریخوں سے ہجری کا ماہ دیوم تحقیق ہونے کے بغیر میں اس کی مطابقت وتصدیق سے قاصر ہوں۔

کی گئی[۵۱]۔ راجہ نے بھی اس موقع پر نیاز و پیشکش کے تمام لوازم ختم کروا لیے اور اس قرابت و شادی کو اپنے اسلاف و اخلاف کے اعزاز و افتخار کا وسیلہ سمجھا۔ تمام شاہزادوں اور بیگمات اور امرا و سرداران شاہی اور ملتزمانِ خدمت کو اُن کے شایانِ شان سامانِ ضیافت بھیجا۔ شاگرد پیشہ اور احدیوں (باڈی گارڈ) کو نام بنام سراپا (خلعت) بھیجے۔ اس تقریب کی عظمت و جلالت اور مورخ کی تحریر کا اندازِ شوکت خود اُسی کا مختصر نویس قلم ظاہر کرسکتا ہے[۵۲]۔

"صبیۂ قدسیۂ راجہ بھگوانداس را کہ از اعاظمِ امرائے ایں دولت ابد مقرون بود و در زمرۂ راجہائے نامدار بہ مزید شوکت و اعتبار اختصاص داشت، بجہتِ آں حضرت خواستگاری نمودند و در دولت خانۂ خاص و عام را آئین بستہ جشن بادشاہانہ ترتیب دادند... حضرتِ عرش آشیانی[۵۳] بورود مقدمِ اقبال تو ام منزلِ راجہ را پایۂ آسمانی بخشیدند و آں بانوئے مجلۂ عصمت و عفت را بگوہر یکتائے خلافت و سلطنت عقدِ ازدواجِ خجستہ امتیاز (امتزاج؟) بستہ بدولت سرائے جاوید آوردند۔"

خلاصہ۔ راجہ بھگوانداس سلطنت کے بڑے امیروں میں سے تھا۔ نامور راجاؤں میں شمار ہوتا بلکہ اُس کی خصوصیت اور اُس کا اعتبار اوروں سے زیادہ تھا۔ راجا کی بیٹی جہانگیر کے لئے مانگی گئی۔ دولت خانۂ خاص و عام کی آئینہ بندی کی گئی۔ بادشاہانہ جشن منایا گیا۔ خود اکبر

---

۵۱ دربار اکبری، صفحہ ۵۵۲۔ تاریخ فرشتہ، جلد اوّل، صفحہ ۲۲۶۔ سیر المتاخرین، جلد اول، صفحہ ۱۸۶۔ مسٹر ڈنکن، آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۲۶۔ کرنیل مَی لس[illegible] اکبر اور سلطنتِ مغلیہ کا عروج، صفحہ ۱۲۸۔ تاریخ تاج از منشی معین الدین، صفحہ ۴ نوٹ۔

۵۲ دیباچہ تزک جہانگیری، صفحہ ۵۔ نیز مآثر الامرا، ج ۲، ص ۱۳۰۔

۵۳ مرنے کے بعد اکبر بادشاہ کا لقب قرار پایا تھا۔

سے نے راجہ کے گھر جا کر اُس کی عزت بڑھائی اور لڑکی کا بیاہ شاہزادہ سے کر کے اپنے یہاں لے آیا۔"

اسی شادی کا تذکرہ خافی خاں، نظام الملکی، ان الفاظ میں کرتے ہیں[۵۱]:-

"بعد کہ پانزدہ سال از نشو و نمائے نہالِ عمر شریف درگلشن جاہ و جلال گزشت، صبیۂ راجا بھگوانداس راکہ از راجہائے نامدار دیار ہند گفتہ می شد برائے شاہزادۂ جوان بخت خواستگاری نمودند۔ وخود بدولت واقبال درجشنِ طوئے بخانۂ راجہ تشریف ارزانی فرمودہ آں بانوئے حجلۂ عصمت رابعقد درآوردہ بدولت خانۂ ابد پیوند درآوردند۔"

خلاصہ: "شاہزادے کی عمر جب پندرہ سال کی ہوئی تو راجہ بھگوانداس جو ہندوستان کے نامی گرامی راجاؤں میں مانا جاتا تھا، اُس کی لڑکی کے ساتھ شاہزادہ کی منگنی کی گئی خود بادشاہ سلامت اس شادی کے جشن میں راجہ کے گھر تشریف لے گئے اور عقد کر کے لڑکی کو اپنے دولت خانے پر لے آئے۔"

خافی خاں ایک مستند و محتاط مورخ ہیں مگر سالِ عقد کے بارے میں یا تو اُن کے قلم نے لغزش کی ہے یا شیخ عبدالقادر بدایونی کے خامۂ معجز نگار نے۔ خافی خاں کے بیان[۵۲] سے پایا جاتا ہے۔ کہ اسی سال جلوس اکبری یعنی ۹۹۴ھ میں شاہزادہ محمد سلیم کا جشن طوئے راجہ بھگوانداس کی بیٹی سے (بسلسلۂ جشنِ نوروزِ عالم افروز) ہوا تھا کہ کابل سے مرزا محمد حکیم کے مرنے کی خبر پہنچی اور کنور مان سنگھ پسر راجہ بھگوانداس حکومت کابل پر ممتاز کیا گیا۔ ملا بدایونی اس جشن کا ۹۹۳ھ میں ہونا (یعنی سال مذکور کے ذیل میں) بتاتے ہیں۔ مسٹر بیل نے بھی یہی لکھا ہے[۵۳]۔

سنہ ۹۹۳ھ کے حالات میں ملا قاسم ہندوشاہ فرشتہ کا بیان ہے[۵۴]۔

---

[۵۱] منتخب اللباب، حصہ اول، صفحہ ۲۴۵۔
[۵۲] " " " صفحہ ۱۸۹۔
[۵۳] اورینٹل بیاگرافی کل ڈکشنری صفحہ ۴۴۳ و مفتاح التواریخ ص ۲۰۶۔
[۵۴] تاریخ فرشتہ جلد اوّل، صفحہ ۲۶۶۔

"وہم دریں سال صبیۂ راجہ بھگوانداس را طوے وجشن عظیم کردہ بعقد شاہزادہ محمد سلیم در آوردند"
شاہ نواز خاں کہتے ہیں کہ "سال بست و نہم دختر عفت سرشت راجہ را با شاہزادہ سلیم پیوند پیوگانی بستند[51]"

یہ راجہ بھگوانداس کچھواہہ، والیِ جے پور، اکبر کا امیر الامرا، بڑا مقرب و معتمد آزمودہ کار سپہ سالار اور مدبر و منتظم صوبہ دار تھا۔ بہت سے کارہائے نمایاں کئے اور بارہا شجاعت و بسالت کے جوہر دکھائے تھے۔ اُس کی تعریف اسی قدر کافی ہے کہ راجا بھارا مل کا بڑا بیٹا اور مرزا راجہ مان سنگھ فاتح میواڑ و گورنر کابل و بہار کا نامور باپ تھا۔ [لالہ سجان رائے ان دونوں ناموں کو بالترتیب بھگونت داس اور بہاری مل لکھتے ہیں[52]۔]

شیخ عبدالقادر بدایونی نے اس تقریب شاہانہ کی دھوم دھام اور آرائشوں کے حالات کسی قدر زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ بدایونی نیز بہادر شاہی کا بیان ہے کہ اکبر نے مصالحِ ملکی اور مہامِ سلطنت کے لحاظ سے ۹۹۳ھ ہجری میں تجویز کیا کہ شاہزادہ ولی عہد (جہانگیر) کا عقد قرابت نامور خاندانِ کچھواہہ سے کیا جائے۔ یا جیسا کہ (بقول علامہ شبلی[53]) بعض اہلِ راز کی روایت ہے "راجہ بھگوانداس نے اپنی بیٹی دینا" از خود اپنی مرضی و خوشی سے منظور کیا تھا۔

محابا کیوں ہے! میں ضامن، ادھر دیکھ شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا!!

جوان دولت، جوان بخت، جوان سال شاہزادہ (سلیم) سولہ[54] برس کا تھا۔ بادشاہ

---

[51] مآثر الامرا جلد دوم، ص ۱۳۰۔

[52] خلاصۃ التواریخ، صفحہ ۳۹۲۔

[53] مجموعۂ کلام شبلی، صفحہ ۵۱ — و۔ مآثر الامرا، جلد دوم، صفحات ۱۱۱ لغایتہ ۱۱۴۔

[54] پروفیسر بنی پرشاد اپنی تاریخِ جہانگیر (صفحہ ۲۹) میں لکھتے ہیں کہ شادی کے وقت سلیم کی عمر پندرہ برس پانچ مہینہ تیرہ دن تھی۔ علامہ ابن ہردی رشحات الفنون میں سولہ سال کا سن بتاتے ہیں

مع تمام امرا اور درباریوں اور خدم وحشم کے راجہ کے گھر گیا۔ مجلسِ عقد میں ایک طرف شرفائے اسلام مفتی وقاضی رونق افزا تھے؛ دوسری طرف ہندو عمائد، پروہت، برہمن اور پنڈت جلوہ افروز۔ پہلے مسلمانوں کے طریقے پر نکاح ہوا، خطبہ پڑھا گیا۔ دو کرور تنکے[۵۱] (بحسب تحریر مآثر الامرا' دو کرور روپیہ) کا مہر باندھا گیا۔ پھر ہندؤں کی ساری رسمیں انجام دی گئیں۔ پھیرے پڑے۔ ہون ہوا۔ حجلہ گاہِ عروسی یعنی دلھن کے گھر سے دلھا کے عشرت کدہ تک خود بادشاہ سلامت (اکبر) عروسی محافہ (چوڈولہ یا پالکی، نالکی) پر اشرفیاں نچھاور کرتا لایا۔ پالکی کو ایک طرف بادشاہ کندھا دئے تھا، دوسری جانب شہزادہ۔ راستہ بھر قیمتی اور پُر تکلف ریشمی کپڑوں کا فرش بچھا تھا[۵۲]۔ راجہ نے جہیز بھی دل کھول کر دیا۔ اصطبل کے اصطبل خالی کر دئے۔ ان میں عراقی بھی تھے، عربی بھی، کچھی بھی، ترکی بھی، کہ اُس زمانہ میں گھوڑوں کی اچھی سی اچھی نسلیں یہی سمجھی جاتی تھیں۔ سو ہاتھی تھے اور سیکڑوں لونڈی غلام۔ ہندوستانی بھی، حبشی بھی، خُتنی[۵۳] و چرکس بھی۔ مرصع و مُکلّل آلات وزیورات، سونے چاندی کے ظروف، طرح طرح کے برتن اور اسباب۔ غرضکہ سب کچھ دیا اور بہت کچھ دیا۔ امراے شاہی اور سرداران ہمراہی کو بھی حسب مرتبہ وحیثیت خلعت اور گھوڑے مع بیش قیمت زین اور جڑاؤ ساز وسامان کے عطا کئے۔ اویماق مغل میں بھی یہی اہتمام اور داد ودہش اور جہیز کا تکلف مذکور ہے[۵۴]۔

---

۵۱ کرنیل می لیسن، بحوالۂ شیخ ابو الفضل و مسٹر بلاخ مین (نوٹ صفحہ ۱۶۔ آئینِ اکبری) تحریر کرتے ہیں کہ ایک تنکہ کا وزن دام کے پانچویں حصہ کے برابر ہوتا تھا۔ دام ایک مسی سکہ تھا، جو ایک روپیہ کا چالیسواں حصہ مانا جاتا تھا (ایضاً صفحہ ۳۱)۔ بیس ملین تنکہ = دو لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ (اکبر اور سلطنت مغلیہ کا عروج صفحہ ۱۲۱۔ نوٹ)۔

۵۲ مآثر الامرا، جلد دوم، صفحہ ۳۰۔ تاریخ جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرشاد، صفحہ ۲۹۔

۵۳ محمود کا مشہور غلام، ایاز بھی ختنی الاصل تھا' (فرشتہ) اگرچہ صاحب سیر المتاخرین (جلد اول، صفحہ ۱۰۱) کا بیان ہے کہ والیِ کشمیر کا بیٹا تھا اور ایک شاہزادہ۔

۵۴ صفحہ ۴۲۳۔

شعرائے دولت نے مبارک بادیں پیش کیں۔ ابوالفیض فیضی نے یہ قطعۂ تاریخ نذر دیا، جس کے ہر مصرع سے تاریخ نکلتی ہے[۵۱]

زہے عقد دُر پاشِ سلطان سلیم | کہ پرتو دہد سال اُمید را
زپروردنِ آفتاب دول | قرانے شدہ ماہ و ناہید را (۹۹۳ھ)

ابوالفضل نے عرض کیا:-

دین و دنیا را مبارک باد، کیں فرخندہ عقد | از برائے انتظامِ دنیا و دین بستہ اند
در نگارستانِ دولت نورِ چشم شاہ را | حجلۂ چوں پردہائے دیدہ رنگین بستہ اند

شیریں زبان و شیوا بیان شبلی نے بھی اس تقریب کو تین سو برس بعد یاد کیا ہے[۵۲]۔ اُن کے دلاویز قطعہ کے بہت سے شعر زبانوں پر رہتے ہیں (اوّل و آخر چھوڑ کر)

قرابت راجگانِ ہند سے اکبر نے جب چاہی
کہ یہ رشتہ عروسِ کشور آرائی کا زیور تھا

تو خود فرماندہِ جے پور نے نسبت کی خواہش کی
اگرچہ آپ بھی وہ صاحبِ دیہیم و افسر تھا

ولی عہدِ حکومت اور خود شاہنشہِ اکبر
گئے انبیر تک جو تخت گاہِ ملک و کشور تھا

اُدھر راجہ کی نورِ دیدہ گھر میں حجلہ آرا تھی
اِدھر شہزادے پر چترِ عروسی سایہ گستر تھا

دُلھن کو گھر سے منزل گاہ تک اس شان سے لائے
کہ کوسوں تک زمیں پر فرش دیبائے مشجر تھا

---

۵۱ مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۲۷ - و اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۵۶۴ -

۵۲ مجموعۂ کلام شبلی، صفحہ ۱۵ - (ہمارا طرزِ حکومت) -

دلھن کی پالکی خود اپنے کندھے پر جو لائے تھے

وہ شاہنشاہِ اکبر اور جہانگیر ابن اکبر[۵۱] تھا

نواب نصیر حسین خاں خیال نے اس واقعہ کو دلچسپ انداز اور شیریں عبارت میں لکھا[۵۲] ہے بہ تغیر خفیف اس کا نقل کر دینا ناگزیر ہے:۔

"ملایان عہد نے لاکھ گھورا اور نظریں لگائیں مگر جو ہونے والا تھا وہ ہو کر رہا۔ یہ (ہندوں اور مسلمانوں) کا عقد اتحاد بندھا اور خوب بندھا۔ رشتہ مضبوط ہو گیا۔ شہزادہ سلیم دولھا بنا۔ بادشاہ خود بیاہنے گیا۔ رجپوتوں کی عزت بڑھائی۔ برات جمی اور رچی۔ منڈھا چھوایا اور خوشی کا یہ گیت گایا گیا۔

پربت بانس کٹا مورے بابل   تنے کا منڈھا چھوائے رے
منڈھے اوپر کلس برا سجے   دیکھیں راجا رائے رے

ان بولوں کے ختم پر دلھن کا چنڈول آیا۔ بادشاہ آگے بڑھا۔ دولھا (سلیم) کو بلایا۔ اس سے نالکی اٹھوائی۔ پھر خود کندھا لگایا۔ سب کا دل بھر آیا۔ راجہ راؤ سامنے آئے۔ ہاتھ باندھ کر اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کرنے اور بھرے دل سے کہنے لگے۔

ہماری بیٹی تمہارے محلوں کی چیری۔ ہم باندی گلام رے
ہماری تمہارے لونڈی بندے غلام

بادشاہ اس پر بالیدہ ہو کر جواب دے رہا تھا "نہیں، نہیں
تمہاری رے بیٹی ہمارے محلوں کی رانی۔ تم صاحب سردار رے۔
تمہاری ہمارے

اس پر ایک کوک پڑ گئی۔ دلہن رخصت ہوئی۔ اور رجپوتوں کی بیٹی اکبر کی بہو اور ملکۂ ہند بنی

---

۵۱ مآثر الامراء، جلد دوم، صفحہ ۱۳۰   ۵۲ مغل اور اردو صفحہ ۱۲۔

پارٹ رانی کہلائی۔

شاہ نواز خاں نے مآثر الامرا[51] میں اس تقریب کو تقریباً پوری تفصیل (مندرجہ بالا) کے ساتھ درج کیا ہے۔ مگر جیسا کہ اُن کی اور بعض اور مسلمان مورخین کی روش ہے! اس وادی میں پھونک پھونک کر قدم رکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ

"عرش آشیانی بفروغ قدوم، منزل راجہ را روشنی افزود۔ اُو جشن خسروانہ ترتیب دادہ جہاز عروس با پیشکش از نظر گزرانید۔ کہ تفصیل آں محمول بر مبالغہ می شود۔"

صاحب مفتاح التواریخ (مسٹر بیل) نے بھی تقریباً یہی سب واقعات اپنے متقدمین کی تحریرات سے کم و بیش نقل کر دیے ہیں[52]۔ "امرائے ہنود" میں بھی یہی تفصیل مرقوم ہے[53]۔ کرنیل میلی سن اپنی تاریخ "اکبر اور سلطنتِ مغلیہ کے عروج" میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ شادی فتح پور سیکری میں بڑے احتشام اور پورے مراسم کے ساتھ انجام دی گئی تھی۔ بڑی خوشیاں منائی گئی تھیں[54]۔

شیخ ابوالفضل[55]، مولانا نظام الدین[56] اور تمام معاصر مورخین کی تحریرات سے راجہ بھگونت داس کے یہاں بادشاہ کے تشریف لے جانے اور محفل و برات کی رونق بڑھانے کی متفقاً تصدیق ہوتی ہے۔ لیکن اکبر صرف اپنے ہی شاہزادوں کی شادیوں میں خود نہیں جاتا تھا، بلکہ ہندو

---

[51] جلد دوم، صفحہ ۱۳۰۔

[52] صفحہ ۲۷۶۔

[53] صفحہ ۸۲۔

[54] صفحہ ۱۲۸۔

[55] اکبر نامہ، دفتر سوم، صفحات ۴۵۶ و ۵۰۹۔

[56] طبقاتِ اکبری، صفحہ ۳۶۶۔

امیروں اور عزیزوں کی تقریبات میں بھی اسی طرح بے تکلف و تامل شرکت کرتا تھا۔ اکبرنامہ سے پایا جاتا ہے کہ سنہ ۳۶ جلوس یعنی سنہ ۹۹۹ھ میں اس نے رام داس کی لڑکی کی شادی سام سنگھ سے کی تھی تو خود دُلھن والوں کے یہاں گیا تھا۔ عزت افزائی کی تھی۔ پانچ لاکھ روپیہ مرحمت فرمایا تھا[۵۱]

آج کل کی دنیا شاید اس کو حکمت عملی یا مصلحت کوشی سے تعبیر کرے یا اکبر کی ہمہ گیر و صلح اندیش پالیسی سے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اکبر کا یا کسی اور بادشاہ کا بیٹے کی سگائی کے لئے، یا شادی بیاہ کے موقع پر، سمدھی کے یہاں جانا آئین شرافت اور دستور قرابت کا پہلا باب تھا، اور اب بھی ایشیائی ممالک کے رسوم و آداب میں اُسی قدر ضروری و اہم سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی تقریب کے سال بھر بعد[۵۲] یعنی جب جہانگیر سترہ برس کا ہوا، تو سنہ ۹۹۴ھ میں اس سے بھی زیادہ رِفق والتیام، کوکبۂ و احتشام، جماعت و انبوہ، فرو شکوہ، شوکت و شان اور آن بان کے ساتھ اس کا نقش ثانی تیار کیا گیا[۵۳]۔ اور نہ تنہا اکبر بلکہ تمام بیگمات و مخدراتِ حرم سرائے سلطانی، دلھن کے لینے کے لئے، اُس کے گھر گئیں۔ خافی خاں لکھتے ہیں[۵۴]:-

"دخترِ فرخندہ اختر راجہ اودے سنگھ پسر راجہ مال دیو زمرزبان مارواڑ کہ در حسب و نسب

---

[۵۱] اکبرنامہ، دفتر سوم، صفحہ ۶۴۸۔

[۵۲] دیباچۂ تزک، صفحہ ۵۔

[۵۳] کین صاحب اس شادی کا سال ۱۵۸۶ء، اور شاہزادۂ خرم کی ولادت ۱۵۹۲ میں، اور رانی کا عرفی نام جودھ بائی بتاتے ہیں (مغل ایمپائر، صفحہ ۱۱۱) تاریخ ہندوستان از مسٹر ڈی لافوس، صفحہ ۹۸۔ سیر المتأخرین، ج ۱، ص ۱۸۶۔ ڈکن صاحب کی آگرہ ہینڈ بک، ص ۲۶۔

[۵۴] منتخب اللباب، حصہ اوّل، صفحہ ۲۲۵۔

ودولتِ موروثی برہمہ راج ہائے عالی تبار افتخار داشت، بعقد آں گوہرِ بحرِ سلطنت وجہانبانی نیز درآوردہ خود بذاتِ شریف وہمہ حجلہ نشینان سراپردۂ عصمت، رونق افزائے خانۂ دکاشانۂ راجہ گردیدند۔ د بجور رتبہ و دستورِ سریر آرایان ہند لوازم شادی بہ تقدیم رسانیدند۔"

راجہ مال دیو کا بیٹا راجہ اودے سنگھ (والیِ مارواڑ) حسب ونسب اور موروثی دولت میں تمام بلند مرتبہ راجاؤں سے ممتاز ومفتخر تھا۔ اُس کی لڑکی کے ساتھ شاہزادہ کا عقد ہوا۔ بذاتِ خود بادشاہ اور تمام بیبیاں اور بیگمیں، راجہ کے یہاں گئیں اور ہندوستان کے بادشاہوں کے رتبہ اور دستور کے مناسب لوازم شادی انجام پائے۔

میر غلام حسین خاں سیر المتأخرین[۵۱] میں راوی ہیں کہ (اودے سنگھ عرف) موٹا راجہ نے اپنی عزّت و آبرو بڑھانے کے لئے بڑی شاندار مجلس ترتیب دی اور آراستہ کی تھی۔ خود بادشاہ کے آنے کے واسطے درخواست کی تھی۔ اکبر نے پاسِ عزّت کر کے اُس کی خواہش قبول کی اُس کے گھر پر گیا اور اعزاز و افتخار بڑھایا۔

شبلی کی تربت منور رہے، سچ فرمایا ہے[۵۲]

یہی ہیں وہ شمیم انگیزیاں عطرِ محبت کی — کہ جن سے بوستانِ ہند برسوں تک معطر تھا

تذکرۂ خسرو میں لکھ چکا ہوں کہ ان مخلوط و مختلط قرابتوں کے متعلق دوست و دشمن سب یکساں رائے رکھتے ہیں۔ رہا باہمی طریق عمل اور سُلوک و مودّت۔ اوراقِ تاریخ شاہد ہیں کہ حق پسند و منصف مزاج دوست بھی اعتراض و حرف گیری سے معاف نہیں رکھتے۔ برملا سب کچھ کہہ ڈالتے ہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ ہر حال میں اپنے، اپنے سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے اقوال کی، آپ کے یہاں وقعت نہیں۔ میرے نزدیک ضرورت نہیں۔ اس لئے

---

۵۱ جلد اوّل، صفحہ ۱۸۶۔

۵۲ مجموعۂ کلام شبلی، صفحہ ۵۱۔

صرف بعض مصلحت شناس و باخبر انگریز مورخین کی تحریرات نقل کر دینا کافی ہو گا۔

کرنیل ٹی لیین اپنی تاریخ اکبر میں لکھتے ہیں کہ سلیم کی شادی اودے سنگھ راجا جودھ پور کی لڑکی، مادر شاہ جہاں سے ہوئی۔ اسی شاہ جہاں کی بدولت راجپوتی خون کو وہ منزلت و ملکنت حاصل ہو گئی جس سے ہندوستان میں کوئی آگاہ نہ تھا۔ اور اس شادی سے کیسے کیسے اچھے نتیجے حاصل ہوئے۔ کرنیل ٹاڈ لکھتے ہیں کہ اکبر نے رشوت دے کر اس کو حاصل کیا تھا۔ یعنی چار صوبے مرحمت فرمائے تھے جس سے مارواڑ (جودھ پور) کے محاصل دوچند ہو گئے تھے[۵۱]۔

مسٹر ایچ۔ جی۔ کین، "مغل ایمپائر" میں[۵۲] لکھتے ہیں "اکبر نے وسط ایشیا سے تعلقات قرابت و ازدواج قطع کر دیئے اور امبیر کے کچھواہہ خاندان سے شادی بیاہ کر کے اتحاد و یگانگی کی بنیاد قائم کی۔ اس نے ہندوؤں سے رسم و راہ پیدا کر کے اپنی رعایا کے لئے عمل و موافقت کی ایک شاہراہ دکھادی" دوسرے موقع پر لکھتے ہیں[۵۵] کہ نہ تو اکبر نے، نہ جہانگیر نے اپنی ہندو رانیوں یا بیبیوں کو تبدیل مذہب کرایا۔ نہ اسلام اختیار کرنے کی ترغیب دی"۔ انجینئر ڈنکن صاحب ان بادشاہوں کی مذہبی رواداری، رانیوں کی ہندوانہ پرستش اور آزادانہ عبادت گزاری کی تحسین کرتے اور محلات سلطانی میں ان کی ضروریات اور پوجا پاٹ کے مناسب حال تعمیرات کا ذکر فرماتے ہیں[۵۴]۔ نامور میکس مولر نے اپنی نفیس تصنیف "سائنس آف ریلیجن" Science of Religion کے حصہ اول میں اس بارہ میں سیر حاصل بحث کی اور مشہور کتاب فرینڈس اینڈ فوز۔ Friends & Foes (دوست و دشمن) سے اقتباسات و انتخابات دیئے ہیں۔ ٹامس کاریٹ صاحب Thomas Coryat تو اس درجہ تک بڑھ کر کہہ گئے ہیں[۵۶] کہ جہانگیر اُن لوگوں کو پسند ہی نہیں کرتا ہے جو اپنا مذہب بدل دیتے ہیں۔ وہ اپنے خود ساختہ مذہب کے سوا

---

۵۱ صفحہ ۱۸۴۔ نیز ۱۲۴۔

۵۲ صفحہ ۱۱۰۔

۵۳ آگرہ کی ہینڈ بک، صفحہ ۶۲۔

۵۴ ایضاً صفحات ۲۲ و ۲۹ و ۲۲۹ نوٹ ۲۳۹۔

۵۵ منقول از مغل ایمپائر صفحہ ۱۱۶۔ اصل کتاب کا نام Crudities خامیاں ہے۔ اور اسکی صفحہ بندی نہیں ہے۔

بت شکن بھی ہمت اسلام ہے بت گر بھی ہے — قلعۂ شاہی میں مسجد ہے جہاں، مندر بھی ہے۔

کسی دوسرے دین کا پابند ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی سلطنت میں تمام مذاہب کا یکساں احترام ہے" کین صاحب کہتے ہیں[۵۱] کہ "جہانگیر جب ولی عہد سلطنت تھا تو اکبر نے اُس کی ہندو رانیوں کے لئے فتح پور سیکری میں مکانات بنوا دیئے تھے اور بقول فرگسن صاحب ان محلات پر ہندوانہ خصوصاً جین وضع کی آرایش و تزئین کرائی تھی"۔ مسٹر اسٹینلے لین پول اپنی تاریخ "قرون وسطےٰ کے ہندوستان[۵۲]" میں راوی ہیں کہ اکبر کی جے پوری دُلھن آزادی کے ساتھ اپنے مذہب و ملت کے تمام رسوم و ارکان ادا کرتی تھی۔ اور ہندؤں کی معینہ قربانیاں بھی کرتی تھی۔ ونسنٹ اسمتھ صاحب کا قول ہے[۵۳] کہ مذہبی معاملات میں جہانگیر اپنے باپ ہی کی طرح رواداری برتتا تھا۔ مسٹر وھیلر بحوالہ منوکی لکھتے ہیں[۵۴] کہ عالمگیر کی ملکہ ایک راجپوتانی شاہزادی، اُس کی پہلی اور جوانی کی بی بی تھی حرم سرائے شاہی میں بڑا رسوخ اور اثر رکھتی تھی۔ محل کے اندر اپنے بتوں پر خوشبوئیں جلاتی تھی۔ اس کا شوہر اگرچہ سخت پابند مذہب تھا، لیکن اُس کے دینی معاملات میں دست انداز نہ ہوتا، دخل نہ دیتا تھا۔" اورنگ زیب اور زوال دولت مغلیہ" میں بھی کم و بیش ایسا ہی تحریر ہے[۵۵]۔ سچ ہے پروانہ چراغِ حرم و دیر نداند۔

خافی خاں منتخب اللباب میں لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب کی بی بی، نواب بائی بیگم، شاہ میر نام ایک سید کی بیٹی تھی۔ کشتوار (علاقۂ کشمیر[۵۶]) کے راجہ نے اپنی بیٹی سید کو دے دی تھی۔ سید نے اُس کو مسلمان کر کے عقد کر لیا۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ راجہ نے تربیت و غمخواری کی۔ سید صاحب حج کو تشریف لے گئے اور وہیں وفات پائی۔ راجہ نے اُن بچوں کی اپنے طور پر پرورش کی۔ شاہ جہاں نے جب اُس راجہ کی بیٹی اور باج و خراج چاہا تو یہی لڑکی سیدزادی جو حُسنِ صورت اور سیرت و ذکاوت میں موصوف تھی مع جہیز

---

۵۱ آگرہ ہینڈ بک صفحہ ۷۱۔
۵۲ صفحہ ۲۵۱۔
۵۳ نوٹ نمبر ایک، سلی مین صاحب کی کتاب پر، صفحہ ۴۰۵ جلد اوّل۔
۵۴ تاریخ آگرہ از خان بہادر سید محمد لطیف، صفحہ ۴۹۔
۵۵ سلسلۂ حکمرانانِ ہند، آکسفورڈ، صفحہ ۱۰۲ نوٹ۔ و ترجمہ سوانح عمری اورنگ زیب، صفحہ ۳۱۶۔
۵۶ ملا نظام الدین ہروی نے طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ ولایت کھتواری کا نام کشتوار تھا۔

اور پیشکش کے بھیج دی گئی۔ شاہ جہاں نے معلم اور اتالیق مغلانیاں آداب سکھانے کے لئے معین کیں اور شاہزادہ اورنگ زیب سے عقد کر دیا۔ اسی کے بطن سے شاہ عالم بہادر شاہ تھا[۵۱]

اسی بدنصیب و بدنام اورنگ زیب کے مآثر میں مسٹر ڈنکن تحریر فرماتے ہیں[۵۲] کہ شاہزادہ ولی عہد محمد معظم کی ماں راجپوتنی تھی۔ واقعۂ ذیل اُس کی یادگار ہے۔ حرم شاہنشاہی کی ملکہ و مالکہ پہلے شہنشاہ کی بہن روشن آرا بیگم[۵۳] تھی۔ اُس کا درجہ و رتبہ سب سے بلند تھا۔ مگر افسوس ہے کہ اُس نے اپنی عظمت و وقار کو قائم نہ رکھا۔ سنہ ۱۶۶۴ء میں اورنگ زیب بیمار پڑا۔ موت کا اندیشہ سب کے پیش نظر تھا۔ اسی حال میں بیگم نے بادشاہ کی مُہر والی انگوٹھی چپکے سے اُڑا لی۔ شاہزادہ محمد معظم کو محروم کر کے اُس کے بھائی محمد اعظم کو جو صرف چھ برس کا تھا تخت و تاج دلانے کی سازش میں شرکت کرنے لگی۔ کیونکہ یہ بچہ ایک مسلمان سلطانہ کے بطن سے تھا۔ بیگم کا مقصد یہ تھا کہ اعظم جب تک نابالغ اور نا قابل حکمرانی رہے گا عنانِ سلطنت میرے ہاتھ میں رہے گی۔ اور میں فرمانروائے مطلق بنی رہوں گی۔ معظم کی راجپوت ماں نے محافظانِ شاہی (گارد) کو رشوت دے کر اپنے خاوند کے کمرے تک کسی نہ کسی طرح رسائی حاصل کی۔ لیکن بادشاہ اُس

---

۵۱ منتخب اللباب، حصہ دوم، صفحہ ۴-۶۰۳۔

۵۲ آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۴۲، نوٹ نمبر ایک۔

۵۳ روشن آرا بیگم، شاہ جہاں کی سب سے چھوٹی بیٹی، اورنگ زیب کی بہن اور بڑی خیر خواہ و وفا شعار تھی۔ ۱۰۸۰ھ مطابق ۱۶۶۹ء میں فوت ہوئی۔ شاہ جہان آباد میں اپنے ہی نصب کردہ باغ موسوم بہ باغِ روشن آرا میں دفن کی گئی۔ (بیلس ڈکشنری، صفحہ ۲۲۵) مورخین لکھتے ہیں کہ عالمگیر و شاہجہاں کے معاملات کو سلجھانے اور عالمگیر کو تاج و تخت دلانے میں ایک حد تک اُس کی مساعی جمیلہ بھی شامل و شریک تھیں۔ عالمگیر نے بھی حق مہر و محبت ادا کرنے میں دریغ نہیں کیا۔ اس کا مرتبہ و اعزاز کیا تھا؟ حرم سرائے سلطانی کے جلوس کے سلسلہ میں برنیر نے اُس کے تزک و احتشام کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھتا ہے "کہ جہاں تک ہو سکے آپ اپنے خیال کو وسعت پر وسعت دیجئے۔ آپ کے قیاس میں کوئی مرقع ایسا نہیں آ سکتا جو اس سے زیادہ دل پر اثر ڈالنے والا اور شاندار ہو جو اُس وقت پیش نظر ہوتا تھا جب روشن آرا بیگم کی سواری ایک عظیم الشان ہاتھی پر نکلتی تھی۔ فیروزے جڑے ہوئے سونے کے میگڈ مبر (ہودج؟) میں سوار پیچھے پیچھے پانچ چھ ہاتھیوں کی قطار۔ اُن پر ویسے ہی جگمگاتے ہوئے میگڈ مبر کسے ہوئے، اور اُن میں ملکہ کی خواصیں بیٹھی ہوئیں، اُن کے پیچھے امرائے دربار کی بیگمات کی سواریاں، سب ملا کر ساٹھ ہاتھیوں کی ایک قطار ہوتی تھی ......" (سوانح عمری اورنگ زیب، ترجمہ اُردو صفحہ ۲۰۱)۔

وقت بیہوش و بدحواس پڑا تھا۔ اُس کو پہچان بھی نہ سکا۔ روشن آرا نے اس کو برأت بیجا اور دخل ناروا قرار دیا۔ راجپوتنی کو اتنا پٹوایا کہ اُس کا چہرہ داغدار ہوگیا۔ کمرے سے سختی کے ساتھ نکلوا دیا۔ اورنگ زیب نے صحت پائی اور یہ حال سُنا، تو شاہزادۂ ولی عہد کی ماں کی اہانت و سوءِ ادب کو برداشت نہ کر سکا۔ بہت بُرا مانا۔ مُہرِ شاہی کا چُرا لینا ایک ایسا جرم تھا، جس کو اُس نے کبھی عفو نہیں کیا۔

اورنگ زیب کی ایک اور بیگم کی نسبت مسٹر اسٹینلی لین پول فرماتے ہیں کہ کام بخش کی ماں اُودے پوری بائی تھی۔ یہ ہی ایک عورت تھی، جس کے ساتھ شہنشاہ کو بے حد الفت و تعشق تھا[۵۱]۔ اس ملکہ کی اصل و نسل اور جذبات وفا کے بارہ میں جو کچھ مجھے تحقیق ہو سکا "حیات جلیل" میں گزارش کر چکا ہوں[۵۲]۔

مؤلفِ "امرائے ہنود"[۵۳] اور "تاریخ آگرہ"[۵۴] کا بیان ہے کہ آگرہ کے قلعہ کے محل میں ایک طرف پرکھما اور دوسری طرف مندر کے آثار اس وقت تک موجود ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ محلاتِ شاہی میں راجاؤں کی بیٹیوں کو اپنے مذہب کے رسوم اور عبادت کرنے کی پوری آزادی حاصل تھی۔ بابا لغاً میر بدایونی یہ راج کماریاں تیموری قلعہ میں آنے کے بعد اپنے دھرم کے مطابق پوجا پاٹ کرتی تھیں۔ ٹھاکر جی کو جل پھول چڑھاتی تھیں۔ تلک لگاتی تھیں۔ پرکرما کرتی تھیں۔ ہَوَن کرتی تھیں۔ مسٹر کین شاہجہاں کے بارے میں بہت سی باتیں الفنسٹن صاحب سے اور کچھ اپنے مشاہدہ و مطالعہ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں[۵۵] "یہ امر قابل تحریر ہے کہ شاہجہاں نے ہندو خواتین کے ساتھ شادی بیاہ کا رواج اُٹھا دیا جو اُس کے پیشروؤں نے قائم کیا تھا"۔

مسٹر ڈنکن فرماتے ہیں کہ[۵۶] "ترقی اسلام کی سرگرمی میں شاہجہاں کی نقصان رساں روش کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ اُس نے وہ طریقہ جو اُس کے متقدمین نے ہندو خواتین کے ساتھ

---

۵۱ اورنگ زیب اور دولت مغلیہ کا زوال۔ از اسٹینلی لین پول (سلسلۂ فرمانروایان ہندوستان)، مرتبہ سر ولیم ولسن ہنٹر۔ مطبوعۂ آکسفورڈ، صفحہ ۲۰۱ نوٹ۔ نیز ترجمہ اردو صفحہ ۲۱۶۔

۵۲ حیاتِ جلیل، حصّۂ اوّل، صفحہ ۱۰۷، نوٹ ۸۲۔ ۵۳ صفحہ ۵۰۔ ۵۴ صفحہ ۷۹۔

۵۵ مغل ایمپائر، صفحہ ۱۲۱۔

۵۶ آگرہ، ہینڈ بک، صفحہ ۳۹ (نوٹ)۔

شادی کرنے کا نکالا تھا بند کر دیا۔ اُس کی سب بی بیاں مُسلمان تھیں"

یہ صحیح ہے کہ شاہجہاں کی کوئی بی بی ہندو نہ تھی۔ مگر یہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اُس کے محل میں کتنی بیگمیں تھیں؟ خود مسٹر ڈنکن بمشکل چار کا پتہ دے سکے ہیں[1]۔ مسٹر بیل بھی اس سے زیادہ نہیں بتا سکے۔ پہلی، مظفر حسین مرزا صفوی کی بیٹی۔ ایران کی شاہزادی، قندھاری بیگم خطاب[2] جس سے رجب ۱۰۱۹ھ (ستمبر ۱۶۱۰ء) میں شادی ہوئی تھی۔ پرہنر بانو بیگم اسی کے بطن سے تھی۔ دوسری، ارجمند بانو بیگم دختر آصف خاں مخاطب بہ ممتاز محل۔ جس سے ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) میں نکاح ہوا تھا[3]۔ تیسری، شاہ نواز خاں پسر عبدالرحیم خاں، خان خاناں کی بیٹی۔ جس سے بقولِ مُلّا عبدالحمید لاہوری مؤلفِ بادشاہ نامہ ۱۰۲۷ھ (۱۶۱۸ء) میں محض بہ تقاضائے مصالحِ ملکی عقد کیا گیا تھا۔ شاہزادہ جہاں افروز جو سال بھر کا ہو کر جاتا رہا اسی سے پیدا ہوا تھا[7]۔ چوتھی، فتحپوری بیگم یا فتح پوری محل[4] جس کی آگرہ[5] اور دہلی[6] کی فتحپوری مسجدیں یادگار ہیں۔ بڑی سخی و دیندار تھی۔ اور ایک اکبر آبادی محل[8] جس نے آخر وقت تک رفاقت کی۔ اعز النسا نام تھا ۹ ذی الحجہ ۱۰۸۷ھ (۱۶۷۷ء) کو اس جہان سے رخصت ہوئی۔ سر سید احمد خاں[9] اور مسٹر فرینچ[10] نے صرف دو دو بیگموں کا ذکر کیا ہے۔ منشی معین الدین ایک اور ملکہ سرہندی بیگم کا بھی نام لیتے ہیں، جس کا روضہ اکبر آباد میں موجود ہے یہ سرہند کی رہنے والی اور بڑی حسین و جمیل تھی[11]۔

پھر شاہ جہاں پر اعتراض کرنے والوں کو بھی (ڈنکن صاحب، صفحہ ۳۷) تسلیم ہے کہ شاہ جہاں ایسا

---

[1] آگرہ ہینڈ بک، صفحات ۳۶ - ۳۷ - ۱۸۵۔

[2] تاریخ مرقع آگرہ، صفحہ ۴۱ - [3] تاریخ مرقع آگرہ صفحہ ۴۱۔ بیلس ڈکشنری صفحہ ۵۳۔

[4] معین الآثار، صفحہ ۱۱۶۔ و۔ آگرہ ہینڈ بک صفحہ ۱۸۵ و۔ " " " صفحہ ۸۹۔ و آثار الصنادید، صفحہ ۲۷۔

[5] تاریخِ تاج، انگریزی، صفحات ۵، ۷ و ۸۲۔ و معین الآثار ۱۱۵ و۔ آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۱۸۵۔

[6] بیل صاحب کی ڈکشنری، صفحہ ۸۹ معین الآثار، صفحہ ۱۱۶۔ [7] تاریخ مرقع آگرہ صفحہ ۴۱۔ نیز ڈاکٹر ہوئی کا ترجمہ تاریخ فرح بخش صفحہ ۱۳۲

[8] تاریخ تاج صفحہ ۵، ۷۔ آثار الصنادید صفحہ ۱۹۔ [9] آثار الصنادید مطبوعہ ۱۸۴۷ء، صفحات ۱۹، ۷۰، [10] سیاحت نامہ بالائی ہند ۱۹۳۳ء صفحہ ۱۲۸۔ مرقع آگرہ، صفحہ ۴۱۔ و۔ ترجمہ فرح بخش، ۱۲۸۔

[11] تاریخ تاج صفحہ ۲، ۷۔ و۔ معین الآثار، صفحہ ۱۱۲۔

سچا، پاکباز اور فدائی شوہر تھا کہ ارجمند بانو[51] کی وفات (دسمبر ۱۶۲۹ء) تک اُس نے کسی دوسری طرف نظر نہ کی۔ وہ ادھیڑ عمر کی عورت جو شوہر سے بھی کچھ دن بڑی تھی اور چودہ بچوں کی ماں[52] ہو چکی تھی، کیا ہوس رانی و نشاط انگیزی اور عشرت پسندی کا ذریعہ ہو سکتی تھی۔!

بہرکیف میں نہیں سمجھتا کہ ان صاحبوں کی تحریر کس تحقیق یا اطلاع پر مبنی ہے۔ ہندوستان کی تاریخیں[53] اس کے خلاف شہادت دیتی ہیں۔ یہ سلسلہ جوان جے پوری، جودھ پوری اور اودے پوری رانیوں کے دم قدم سے چلا تھا، فرخ سیر تک ختم نہیں ہوا۔ سب سے اخیر راجپوتنی مہاراجہ اجیت سنگھ کی بیٹی تھی، جو دلی کے لال قلعہ میں آکر دُلھن بنی[54]۔ اس سیہ طالع، سیہ قدم راجکماری کی شاندار آمد، شوہر کی معزولی و ہلاکت اور اُس کی ناشاد زندگی کے بارے میں "حیات جلیل" کے بہت سے ورق سیاہ کر چکا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ اکبر کے محل میں پانچ ہندو رانیاں تھیں اور جہانگیر کے یہاں سات۔ شاہجہانی چمن دیسی پھولوں کی بہار اور خوشبو سے ضرور خالی رہا۔ لیکن اس کے بھائی پرویز، اس کے دونوں بیٹوں، مراد اور شجاع، کی محل سراؤں میں راج دُلاریاں راج کماریاں رونق افزا تھیں۔ خود عالمگیر اورنگ زیب کی دو بیگمیں راجپوت تھیں

---

[51] شاہجہاں سے شادی کرتے وقت جہانگیر نے ممتاز محل خطاب دیا تھا۔ مسٹر کین نے اس کے حسن و جمال، سلیقہ و کمال، ہمدردی انسانی، مساکین و غربا کی پرورش، یتامیٰ کی نگہداشت و حمایت، نیک دلی و دین داری کی مدحت و توصیف فرمائی ہے۔ (آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۱۴۸) محمد شفیع نگیتوی بھی بڑی تعریف کرتے اور لکھتے ہیں کہ ممتاز محل دختر نواب آصف خاں کہ سرخیلِ زوجاتِ آں خسرو شیریں کردار بود...... (مرأتِ واردات، نسخہ خطی عجائب خانہ برطانوی)۔

[52] بادشاہ نامہ ملا عبدالحمید لاہوری، جلد اول، صفحات ۳۸۴ لغایتہ ۳۹۳۔
سوانح عمری اورنگ زیب، اُردو (سلسلہ مشاہیر فرمانروایان ہند) صفحہ ۲۴ نوٹ۔
اورنگ زیب اور سلطنت مغلیہ کا زوال از اسٹینلے لین پول، صفحہ ۱۴۔ آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۳۷ (نوٹ)۔
تاریخ تاج انگریزی از منشی معین الدین، صفحہ ۱۲۔ ترجمۂ مآثر الامرا، از بیورِج، صفحہ ۲۹۴۔

[53] مآثر الامرا، خافی خاں، مآثر عالمگیری، امرائے ہنود، بیل، جدو ناتھ سرکار۔

[54] حیات جلیل، حصہ دوم۔ صفحہ ۶۳، مثنوی طوطے فرخ سیر از میر عبدالجلیل بلگرامی۔ زبدۃ الاخبار قلمی، صفحہ ۱۰۹۔ امرائے ہنود، صفحہ ۱۷۔ بیل کی ڈکشنری، صفحات ۴۵ و ۱۳۰۔ کین کی ہینڈ بک مرتبہ ڈنکن، صفحہ ۷۴۔ گلستان ہند، دفتر دوم، صفحات ۲۱۶ و ۲۱۷۔

ایک راجہ کشتوار (کشمیر) کی بیٹی یا (حسب روایتِ منتخب اللباب[۵۱]) نواسی، جس کے بطن سے بہادر شاہ تھا۔ دوسری اُودے پوری[۵۲]، جس نے مرتے دم تک اپنے تاجدار سرتاج کا ساتھ دیا اور حق وفا ادا کیا۔ اسی طرح اور تیموری شاہزادوں کو لیجئے۔ داراشکوہ کا فرزند سلیمان شکوہ، عالمگیر کے چاروں بیٹے، پوتے اور پرپوتے سب اسی شاہانہ سوغات سے مستفید و فیض یاب تھے۔ گورگانی یا صاحب قرانی شجرۂ نسب میں ایسی سات رانیوں کے نام روشن نظر آتے ہیں، جن کے "پتی" بھی مکٹ دھاری تھے اور "پتر" بھی مکٹ دھاری ہوئے۔

آئیے۔ اب ہم اور آپ خود بھی تو ان مختلط دپیوندی قرابتوں کے قبائح، محاسن، فوائد و نتائج پر نگاہ ڈالیں اور غور کرلیں۔

جیسا کہ ضحی الاسلام کی فصل اول میں علامہ احمد امین نے تحریر کیا ہے "فاتح و مفتوح قوموں کی آمیزش حضرت عمر بن الخطابؓ کے عہد خلافت سے شروع ہوگئی تھی اور اس ازدواج باہمی یا بین الاقوامی سے ایک نئی قسم پیدا ہوئی تھی۔ جس میں عربی و غیر عربی دونوں خون تھے۔ بلکہ اس میں اُن تمام قوموں کی خصوصیات جمع ہوتی تھیں جن سے اس کا خمیر پڑا تھا۔ خواہ یہ خصائص جسمانی ہوں، عقلی، خلقی ہوں یا روحی۔" حضرت شہربانو اور سادات حسینی ان کی اولاد کو دیکھ لیجئے۔ اور "یہ تو کھلا ہوا راز ہے کہ مختلف قوموں کے باہمدگر ازدواج اور مختلف افکار و خیالات کے باہمی امتزاج سے ادب و شعر، علم و عمل، ہنر و فن، وضع و قطع حتیٰ کہ سادگی و تکلفات اور روحانیات و الہامات ہر چیز میں عروج و ترقی ہوتی رہی ہے[۵۳]۔"

---

[۵۱] خافی خاں حصہ دوم، صفحہ ۶۰۴۔

[۵۲] پوری تحقیق ملاحظہ ہو۔ ادبیاتِ مغل، صفحہ ۵۵۱۔ اورنگ زیب اور زوالِ حکومتِ مغلیہ، صفحہ ۲۰۱ نوٹ۔ نیز ترجمہ صفحہ ۲۱۶۔

[۵۳] مطبوعہ مصر۔

انگلستان کا مشہور فلاسفر اور ادیب برنرڈ شا مخلوط نسل کے متعلق حسب ذیل نظریہ پیش کرتا ہے۔

"میں انگلستان کی بہتر نسل پیدا کرنے کے لئے اس امر کا قائل ہوں کہ اگر ماں ایک قوم کی ہو تو باپ دوسری قوم کا ہونا چاہیئے۔ اگر اس اصول پر عمل نہیں کیا جائے گا تو نسل بتدریج کمزور اور خراب ہوتی جائے گی۔ انگریزوں کی نسل کو دیکھو جس میں غیر ملکی اقوام کے خون کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ عام طور پر یہ آمیزش جس قدر زیادہ ہو گی، اُسی قدر اُس کے نتائج بہتر نظر آئیں گے[۵۱]..."

کرنیل می لین "اکبر اور سلطنت مغلیہ کے عروج" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "اکبر کے عہد تک راجپوت شاہزادے حقارت کے خیال سے مذہب اسلام کے شاہزادوں کے ساتھ اتحاد و ازدواج کرنے کا خیال چھوڑے ہوئے تھے۔ انکار تھا۔ مگر اکبر کی آرزو تھی کہ دونوں ایک ہو جائیں۔ نسل و مذہب کے اختلافات کسی انسان میں کوئی اختلاف پیدا نہیں کر سکتے۔ وہ اس اصول پر کاربند ہوا اور عمل میں لایا۔ اُس کو بہت سے تعصبات راہ سے ہٹانا پڑے۔ وہ غالب آیا، خصوصاً اُن پر جو راجپوت شاہزادوں کی طرف سے پیش ہوتے تھے[۵۲]۔ ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں کہ اپنے مقاصد اور اتحاد کے حاصل کرنے کے لئے اکبر نے جو وسائل و ذرائع اختیار کئے اُن میں سے ایک تو وہ شادیاں تھیں جو اُس نے خود اپنی نیز اپنے خاندان والوں کی اسی ملک کے شاہزادوں کی بیٹیوں سے کیں۔ وہ جانتا تھا کہ شادی سے زیادہ کوئی ذریعہ مساوات کا نہیں ہے[۵۳]۔

اکبر کو حکمرانی کرتے زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ اُس نے اس امر کی اہمیت کا اندازہ کر لیا کہ راجپوتانہ کے ہندو شاہزادوں کو اپنے تخت کے ساتھ ایسی گرہ سے وابستہ کرے جو دوستی محض سے کہیں زیادہ قوی و قریبی ہو۔ یہ لکھنا کس قدر دلچسپی کا باعث ہے کہ اُس نے

---

۵۱ روزنامہ زمیندار، جلد ۲۱، نمبر ۱۸۳، مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۳۴ء۔

۵۲ صفحہ ۱۲۸۔

۵۳ صفحہ ۱۲۹۔

راجستان کے اعلیٰ شاہزادوں کی طبعی و اندرونی تعصبات پر غالب آنے کا کیا انتظام کیا، وہ بھی ایسے اتحاد پر کیسے رضامند ہو گئے جس کو اُن کی کثیر جماعت اپنے دل میں اپنی تحقیر و بے عزتی سمجھتی تھی[۵۱]"

شاہزادۂ خسرو کے کتابی تذکرہ میں میں نے سیر حاصل بحث کی اور تاریخوں کی ورق گردانی کر کے اُن رانیوں کا ذکر کر دیا ہے جو اکبر سے بھی پہلے اسلامی فاتحین کے مشکوئے حرم میں داخل ہو چکی تھیں۔ مثالاً، سلطان معز الدین سام اور راجہ اُچھ کی بیٹی[۵۲] غیاث الدین خلجی اور رانی خورشید، راجہ بگلاتا کی لڑکی[۵۳] ناصر الدین خلجی اور راجہ جھوندا س کی بیٹی، جو رانی جے پوری کہلائی[۵۴] نیز بھوانی داس پسر شودا کی بیٹی رانی چتوری[۵۵] جنھوں نے فرطِ اتحاد و محبت سے اپنے شوہروں کا طریقہ و مذہب اختیار کر لیا تھا۔

نظیری نے سچ کہا ہے۔

ہیچ اکسیر بہ تاثیرِ محبت نہ رسد — کفر آوردم و در عشقِ تو ایماں کردم

اس موقع پر پہنچکر کچھ صاف صاف باتیں بھی کہہ ڈالنا ضروری ہیں۔ اکثر مورخین و اہلِ قلم نے منصف مزاج ہو کر یا بن کر یہ تجویز کیا ہے کہ اکبر اور اُس کے اخلاف و پس آیندگان کی یہ پالیسی نہایت کامیاب ہوئی۔ اور یہ اختلاط و ازدواج باہمی ملک و ملت راعی و رعایا سب کے حق میں نفع رساں اور نعمت و برکت ثابت ہوا ہے۔ اس سے پیشتر کیا کیفیت تھی۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی فرماتے ہیں۔ "بابر کے ساتھ راجپوتوں کی بے وفائی اور کجروی خود اُن کی شکست کا باعث ہوئی۔ رانا سانگا فتح پور سیکری میں مغلوب ہوا..... بابر و ہمایوں کی تاریخ کا ایک ورق بھی ہم کو یہ نہیں بتاتا کہ ایک راجپوت نے بھی کسی وقت اُن کا ساتھ دیا ہو۔ ہمایوں کی شکست اور شیر شاہ کی فتح کا سب سے بڑا سبب یہی تھا[۵۶] بخلاف اس کے ان تعلقات و قرابت کے پیدا ہو جانے پر (بقول اسٹینلے لین پول) اس

---

[۵۱] صفحہ ۱۸۱۔

[۵۲] تاریخ فرشتہ، مقالہ دوم، صفحہ ۵۷۔

[۵۳] تاریخ فرشتہ، مقالہ پنجم، صفحہ ۲۵۷۔ تاریخ ظفر الوالہ بمظفر و آلہ۔ از حاجی دبیر جزو دوم، صفحہ ۲۰۹۔

[۵۴] " " صفحہ ۲۶۲ [۵۵] طبقات اکبری، صفحہ ۵۷۳۔

[۵۶] مقدمۂ رقعاتِ عالمگیر مطبوعۂ دار المصنفین، صفحات ۴۴ و ۴۵۔

ملک کے بعض بعض راجا بیس بیس ہزار سوار کا لشکر لے کر اورنگ زیب کی رفاقت میں لڑنے کو جاتے تھے اور ایسے راجاؤں کا شمار سو سے متجاوز تھا[۵۱]

لیکن یہ نظریئے صرف بیگانہ ممالک اور غیر اقوام کے اہل الرائے نے نکالے ہیں۔ ہمارے عزیز وطن کے دانشمند مدبروں نے اس کو بُری نگاہوں سے دیکھا اور ناپسندیدہ بتایا ہے۔ اس کے نتائج دونوں فریق کے لئے مُضر اور نقصان رساں ثابت کئے ہیں۔ مولوی محمد یحییٰ فرماتے ہیں[۵۲] "حقیقت یہ ہے کہ مسلمان من حیث القوم اکبر کی پالیسی اور اُس کی لا مذہبی کو نظر استحسان سے نہیں دیکھتے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو سلطنت مغلیہ کے زوال کا پیش خیمہ اکبر کی پالیسی تھی۔ اکبر نے راجپوتوں سے رشتے ناتے کر کے اُن کو اندر اور باہر سلطنت میں دخیل کر لیا۔ حالانکہ محکوم قوم کا تالیف قلوب کرنا کتنا ہی عمدہ اور قابل ستایش فعل کیوں نہ ہو لیکن حاکم کو اپنی گردن اُس کے ہاتھ میں دے دینا موت اور زوال کی نشانی ہے" شاید یہی راز تھا کہ بنی اسرائیل کی پرانی متمدن قوم غیر قوموں سے ازدواج و مناکحت ناپسند کرتی تھی۔[۵۳]

خود ہندوؤں کا خیال اس بارہ میں کیا ہے؟ اس کو بھی ایک روشن خیال تعلیم یافتہ اہل الرائے کی زبان سے سن لیجئے مسٹر نانالال مہتا اپنے مقالہ موسومہ ہندوستانی تمدن میں اسلام کا حصہ" میں لکھتے ہیں۔

"ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین بادشاہوں کی شادی بیاہ نے اتحاد کا کام نہیں دیا۔ ظاہر ہے کہ اسلام جو آزاد ہے کھانے پینے اور پرستش کے بے معنی قیود کی جانب التفات نہیں کرتا بلکہ نظر حقارت سے دیکھتا ہے وہ کسی مستوی سطح پر ایسی سوسائٹی (جماعت) سے کیسے مل سکتا تھا جو لابدی طور پر رسمی طہارت و صفائی پر راغب ہے۔ اس لئے ہندوؤں کے نقطۂ نظر سے یہ باہمی ازدواجات دوستی و محبت کے گہوارہ جنباں نہ تھے۔ بلکہ یہ اُن کی تذلیل اور خود اپنے لوگوں کو اپنے جماعتی مدارج کی حرص و ہوا کے اندر

---

[۵۱] سوانح اورنگ زیب ترجمہ از مشاہیر فرمانروایان ہندوستان، صفحہ ۱۹۰۔

[۵۲] سیر المصنفین، جلد دوم، صفحہ ۲۱۹۔ مطبوعۂ جامعہ پریس۔

[۵۳] از رسالۂ المناظر ماہ ستمبر ۱۹۳۲ء نمبر ۳۔

رکھنے کی ناقابلیت ظاہر کرنے کی محض ایک صورت یا تدبیر تھی۔ اس لئے ان مخلوط شادیوں سے جو شاہی نسلیں یا اولاد ہوتی تھیں وہ اگر کوئی شے بھی نہ ہوں تاہم بت پرست ہندؤں کے لئے خالص خون والے مسلمانوں سے کہیں زیادہ مخالف و متعصب ہوتی تھیں۔ اس کے متعلق مجھے صرف فیروز تغلق اور شاہجہاں کا نام لے دینا کافی ہے[۵۱]۔"

رہا شاہجہاں کا اپنی ہندو رعایا اور راجپوت امرا و رؤساء کے ساتھ طرز عمل، اتحاد اور اخلاص۔ اُس کی بے تعصبی کی شہادت کے لئے کسی مسلمان مصنف کا قلم درکار نہیں، بلکہ یورپین سیاحوں اور مورخوں کی تحسین و تحریر موجود ہے۔ ٹیورنیر صاحب کا بیان ہے کہ شاہجہاں کی حکومت ایسی عمدہ اور مشفقانہ تھی جیسی کہ باپ کی خاندان پر ہوتی ہے[۵۲]۔ مسٹر اسٹینلے لین پول فرماتے ہیں کہ ہندو لکھنے والے شاہجہاں کے انصاف اور رواداری وغیرہ کی بڑی تعریف کرتے ہیں[۵۳]۔

کیا شاہ جہاں کے متعلق مسٹر کین اور مسٹر ڈنکن کا یہ الزام لگانا اب بھی حق بجانب سمجھا جائے گا؟

کرنیل می لیسن Malleson اپنی "تاریخ اکبر اور سلطنت مغلیہ کے عروج" میں لکھتے ہیں کہ ہندوؤں کی آبادی کل میں ۵/۶ تھی جو مسلمانوں کے زیر حکومت تھی۔ ان کو اپنے فرائض مذہبی آزادی سے ادا کرنے کی اجازت تھی۔ البتہ جزیہ ادا کرنے کے مستوجب تھے، جو ادیانِ غیر کے اشخاص اور غیر جنس کی رعایا پر عائد ہوتا تھا۔ مگر حکومت کے تمام صیغوں میں ہندؤں کا عنصر بہت غالب تھا۔ اکثر صوبوں میں اسی مذہب کے اعلیٰ طبقے، گورنروں کے ماتحت، موروثی عمل و دخل رکھتے تھے اور زمانۂ جنگ میں اپنی افواج کا حصہ میدانِ کارزار کی خدمات کے لئے لاتے تھے۔ جیسا کہ تمام متفقہ اور معاصر مآخذ و ذرائع سے پایا جاتا ہے[۵۴]۔

---

[۵۱] اخبار لیڈر، صفحہ ۸، مورخہ ۱۲ جنوری ۱۹۲۵ء، چہار شنبہ۔

[۵۲] اورنگ زیب اور زوال سلطنت مغلیہ (سلسلۂ حکمرانانِ ہند) مرتبہ سر ولیم ولسن ہنٹر، صفحہ ۱۵۔

[۵۳] " " " " " " " " صفحہ ۱۵۔

[۵۴] مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۱۸ء، صفحات ۴، ۵ و ۷۔

جہانگیر کی بے تعصبی اور غیر مذہب والوں خصوصاً مسیحیوں پر التفات و توجہ کے اعتراف و ستایش میں سر ٹامس رو اور پیٹر وڈیلا ویلے نے صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں[۱]۔

باز آمد: جہانگیر کی اس پہلی شادی کے پہلے ہی سال، ۹۹۴ ہجری میں شاہزادی سلطان النسا پیدا ہوئی جو سلطان بیگم بھی کہلاتی ہے[۲]۔ یہ تاریخ انگریزی حساب سے ۲۶ اپریل ۱۵۸۶ء کے مطابق ہوتی ہے۔ دوسرے برس ۲۴ امرداد[۳] کو (بماہ رمضان ۹۹۵ھ ہجری۔ اگست ۱۵۸۷ء) بڑے بیٹے کی[۴] (لاہور میں) ولادت ہوئی۔ دادا جان (اکبر، عرش آشیاں) نے سلطان خسرو نام رکھا۔ یہ بڑے لڑکے کا بڑا بیٹا تھا، اپنا پہلا پوتا۔ بڑے جشن منائے۔ خوب خوشیاں کیں[۵]۔ فرشتہ کہتا ہے[۶]۔

"دریں سال ۹۹۶ھ ہجری ولادتِ سلطان خسرو ولد شاہزادۂ عالیشان شاہزادہ محمد سلیم از دختر راجہ بھگوانداس روے نمود۔ عرش آشیانی از طلوع اولین کوکب نبیرہ خوشحال شدہ در آرایش جشن بلاقصے الغایتہ کوشید۔"

ملا نظام الدین احمد ہروی طبقاتِ اکبری میں لکھتے ہیں :-

"دریں سالِ فرخندہ فال (۳۲ الٰہی۔ ۹۹۶ھ) ولادتِ سلطان خسرو ولد شاہزادۂ جواں بخت سلطان سلیم از مہدِ عصمت دختر راجہ بھگوانداس روی نمودہ و از آرایشِ جشن طوے ولادت ایں شاہزادہ کہ

---

[۱] سیاحت نامہ، صفحات ۹۸ (نوٹ) اور ۱۲۷، جلد اول صفحہ ۵۲ [۲] دیباچہ تزک جہانگیری، صفحہ ۶۔ یہ شاہزادی ساٹھ برس زندہ رہی تھی [۳] دیباچہ تزک، صفحہ ۶۔ منتخب اللباب، حصہ اول، صفحہ ۲۴۵۔ سالِ ولادت ۹۹۷ھ الفاظ و ہندسہ دونوں میں لکھا ہے۔ ظاہراً طباعت کی غلطی نہیں ہو سکتی۔ مآثر الامرا، جلد دوم، صفحہ ۱۳۰۔ اور مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۳۴ اور قاموس المشاہیر، جلد اول، صفحہ ۲۲۴ میں ۹۹۵ھ تحریر ہے [۴] سیر المتاخرین، جلد اول، صفحہ ۱۸۷ میں لکھا ہے کہ راجہ بھگونت داس کی لڑکی سے سلطان سلیم کے بیٹا پیدا ہوا۔ خسرو نام رکھا گیا تھا۔ رشحات الفنون، جزو اول میں بھی یہی مرقوم ہے۔ (ورق ۲۲۰ قلمی)۔ [۵] ترکوں میں دستور تھا کہ ایسے موقعوں پر ضیافت عام کرتے تھے۔ اور دولت مند لوگ اپنے نوکروں اور ملتزمینِ خدمت کو جوڑے دیتے تھے بلکہ جو پہلے آکر خوش خبری دیتا تو جو کپڑے پہنے ہوتے تھے وہ اس کو اتار کر دیدیتے تھے۔ (قصص ہند، حصہ دوم، صفحہ ۸۲)۔ [۶] تاریخ فرشتہ، جلد اول، صفحہ ۲۶۶۔

کہ طلوعِ اولین کوکبِ سعادت بود زمین و زمانِ جہانیان صلائے عیش و کامرانی در داد[۵۱]

اس مبارک موقع پر شاہزادہ سلیم نے اس بی بی کو "شاہ بیگم" کا خطاب دیا تھا۔ شاہ بیگم بڑی عقیل، دانشمند، زیرک و دور اندیش، وفاکیش اور غیور تھی۔ اس کو اپنے شوہر سے الفت نہیں عشق تھا۔ شوہر کی محبت بھی جنونِ محبت تک پہنچی ہوئی تھی۔ جس کو دوسری بی بی (جودہ بائی، دختر راجہ اودے سنگھ) بھی کم نہ کر سکی۔ اور اس کے حسن و جمال، ناز و نیاز کرشمہ و انداز کے تمام حربے بیکار ثابت ہوئے ع۔

میں بھی دیکھوں تو پلٹتی ہیں نگاہیں کیوں کر!

حالانکہ دونوں کے سوانح، لطیفے اور بذلہ سنجیاں دیکھ کر خشک مزاج و خشک دماغ "مقبول" کو بھی ماننا پڑتا ہے کہ جودہ بائی[۵۳] (جگت گوسائیں) وہ خوش سلیقہ و خوش مزاج ملکہ، وہ نگار آتشیں، وہ محشر در آستیں تھی، جس کی چشمکوں اور حاضر جوابی نے فتنہ ادا، ناوک افگن نورجہاں بیگم کی جودتِ فہم و رسائی طبع[۵۴]، بلکہ تابشِ حسن کو بھی ماند کر دیا تھا[۵۵]۔ جہانگیر کی ایک تیسری بیگم "صاحب جمال" اسم با مسمیٰ تھی، بڑے نامور اور کارگزار باپ کی بیٹی۔ اکبر نے سلیم کی شادی اس سے کر دی تھی۔ یا جیسا کہ دربار اکبری[۵۶] میں تحریر ہے "مینا بازار

---

۵۱ صفحہ ۱۷۳ ۵۲ منتخب اللباب، حصہ اول، صفحہ ۲۴۵۔ تاریخ ایلیٹ صاحب جلد ششم، صفحہ ۲۹۸۔ وبلیس بیاگرفی کل ڈکشنری، صفحہ ۱۵۲۔ وقاموس المشاہیر، صفحہ ۲۴۴۔ وترجمۂ تزک جہانگیری از بیوریج، صفحہ ۵۶۔ ۵۳ منشی سعید احمد لکھتے ہیں کہ جگت گوشائیں؟ عام طور سے جودہ بائی کے نام سے مشہور ہیں نہایت دانش مند، نیک طینت، خوش بیان، شیریں کلام، حاضر جواب اور با سلیقہ بیگم تھیں۔ ان کی حاضر جوابی کے اکثر لطیفے مشہور ہیں"۔ (امرائے ہنود، صفحہ ۴۹) کرنیل می لیسن فرماتے ہیں کہ وہ بڑے مضبوط ارادے اور دل و دماغ کی شاہزادی تھی۔ (اکبر اور سلطنتِ مغلیہ کا عروج، صفحہ ۱۶۵، قصصِ ہند، حصہ دوم، صفحات ۱۱۵ و ۱۱۶) سیر المتاخرین میں بھی ایسا ہی مرقوم ہے۔ صفحہ ۲۰۵)، ۵۴ اس رقیبانہ چھیڑ چھاڑ کے ذکر میں ایک معمولی سی بات ملک دین محمد تاجر کے سیریل نامہ سے (اسی کے لفظوں میں) نقل کر دینا کافی ہے"۔ نورجہاں نے جہانگیر سے کہا کہ آپ کے منہ سے بڑی بو آتی ہے۔ بادشاہ نے یہ بات اپنی منکوحہ (؟) بی بی سے کہی کہ تم ہمارے منہ کی بو بُری نہیں بتاتیں۔ اور نورجہاں بتاتی ہے۔ جودھا بائی بولی کہ ایک مرد کا جو منہ سونگھے اسکو دوسرے کی کب تمیز ہو سکتی ہے"۔ (صفحہ ۴۳۔ مطبوعہ فیروز پرنٹنگ ورکس۔ ۵۵ شمس العلماء آزاد دہلوی قصص ہند میں لکھتے ہیں کہ محل میں راجہ مان سنگھ کی بہن، مہارانیہ جودھ پور کی بیٹی وغیرہ رانیاں اور مہارانیاں تھیں مگر نورجہاں نے سب کے چراغ بے نور کر دئے تھے۔ (صفحہ ۱۷۱) یہ صحیح نہیں ہے۔ مان سنگھ کی بہن تو بہت پہلے دنیا سے رخصت ہو چکی تھی ۵۶ صفحہ ۱۵۵۔

کی آمد و رفت میں سلیم (جہانگیر) کا دل زین خاں کوکہ کی بیٹی پر آیا اور ایسا آیا کہ قابو ہی میں نہ رہا۔ غنیمت ہوا کہ اسکی ابھی شادی نہ ہوئی تھی۔ اکبر نے خود شادی کردی" [۵] بہر کیف شوہر کی بڑی محبوب رفیق اور چہیتی بی بی تھی۔ لیکن سیرت نگاروں سے پوچھیئے۔ شاہ بیگم کے سامنے صاحب جمال کی کیا حقیقت تھی ؟

برقِ جمال مرحبا پیکرِ ناز' آفریں !

[عند۔ پردگیانِ عصمت وعفاف کے بارے میں یہ خیال کی ادنیٰ سی جولانی یا قلم کی شوخی روا نہیں رکھتا لیکن یہ اظہارِ حقیقتِ حال تھا جو قلم سے بے اختیار نکل گیا۔ تہذیبِ جدید کی ضیاپاشی یا دورِ حاضر کے اثر پر محمول نہ کیا جائے۔ ابھی آپ سنیں گے کہ خود جہانگیر شاہ بیگم سے (مومن کی زبان میں) کیا کہہ رہا ہے۔

افسوس کوئی پردہ نشیں پردہ در نہیں ۔۔۔ وہ حسن جس سے عشق ہو رسوا نہیں رہا]

---

[۵] منقول ہے "یہ واقعہ ہے یا فسونِ جنون ہے۔ دو جملوں میں پورا افسانہ !"

"آزاد! تمہاری تلاش، مضمون آفرینی اور سحرکاری آج بھی روح کو تڑپا دیتی، دل کو گرما دیتی ہے"۔

"تاریخ والو! تم ہی بتاؤ کہاں ہو؟"

....."ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی ۔۔۔ کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ہم نے نہ آوازۂ عشق و عاشقی سُنا۔ نہ کسی تعلق و تعشق کی خبر ہے"۔

خافی خاں۔ ہم بھی کسی صاحب جمال کے اس نیرنگ جمال سے آگاہ نہیں۔ ہم تو کہہ چکے" وہم دریں سال خجستہ آل ۹۹۷ دخترِ خواجہ حسین ولد زین خاں برائے آں شاہزادہ عالی نژاد خواستند" (صفحہ ۲۴۶)۔

جہانگیر میں خود اسی قدر کہہ سکتا ہوں "پرویز از صبیہ صاحب جمال زین خاں کوکہ کہ نسب ہم سنگِ مرزا عزیز کوکہ بود"۔ (صفحہ ۸، تزک) البتہ سرکاری مورخ شیخ ابوالفضل کی تحریر سے اس کی حرف بہ حرف تصدیق ہوتی ہے۔ بے شبہ اُس کی تمام تحریرات میں) شاہزادہ کے ساتھ شیخ کی مخالفت کی بُو اُس کی ہر جنبش قلم سے آجاتی ہے لیکن جہاں تک کہ اس واقعہ کا تعلق ہے مجھے نقل کردینا ناگزیر ہے۔

"سنہ ۴۰ جلوس سنہ ۱۰۰۳ھ درنیولا بزرگ شاہزادہ را شگرف دلبستگی بدخت زین خاں کوکہ شد و بیوگانی سگالش از سرگرفت۔ گیتی خداوند را ازیں بے روشنی دل گراں شد و چوں خاطر شیفتگی از اندازہ بیروں دید ناگزیر دستوری داد۔ والا جشنے پیرایش گرفت و نشاط را تازہ آئین برنہاد۔

فراواں بارگہ برپاے کردند ۔۔۔ زمین را چرخ انجم زاے کردند

ز ہر سو پردہ بر درگاہ بستند ۔۔۔ تُتق را تازہ نو راز ماہ بستند

ورقدسی نشیمن مریم مکانی فرح بر پیوند خرمی افزود و آں پارسا گوہر را بہ شبستان سپردند" ع۔ بیوگانی۔ شادی کدخدائی، ترکی طوی، بیوگ عروس۔

شاہ بیگم کا اندوہناک انجام، یا اس تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ طلب ہے۔ وہ شاہزادہ (خسرو) جس کے ساتھ ساری چغتائی قوم کی امیدیں اور توقعات وابستہ تھیں جس کی آمد نشو ونما اور ترقی سے تیموری خاندان کو مسرت تھی، جو ماں (شاہ بیگم) کی آنکھ کا نور اور دل کا سرور تھا، باپ سے بگڑ جاتا اور تھوڑی سی سمجھ پا کر سرکشی اختیار کرتا ہے۔ دعوائے سلطنت اور اکبر کی جانشینی کے خیالِ خام میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ درگزر کرنے والے شفیق باپ پر جو کچھ گزری اُسی کا دل جانتا ہے۔ یہاں اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ ماں عزیز بیٹے کی شوخیوں اور سیاسی غلط کاریوں سے تنگ آ گئی تھی۔ خسرو کو بغاوت وسرکشی سے روکتی اور حتی الوسع باز رکھنا چاہتی تھی، مگر برگشتہ نصیب خسرو کب ماننے والا تھا۔ وہ جہانگیر کی بجائے تخت وتاج کا وارث اور حقیقتہً اہل اپنے ہی کو سمجھتا تھا۔ ماں کی کوفت اور سوزشِ دل بڑھتی رہی۔ اُس نے عاجز آ کر افیون کھائی اور جان دیدی۔[۵۱]

جہانگیر لکھتا ہے:-[۵۲]

والدۂ اوہم در ایام شاہزادگی از ناخوشی اطوار و اوضاع او، وسلوک برادر خوردش مادھو سنگھ تریاک خوردہ خود را کشت۔ از خوبی ہائے ونیک ذاتی او چہ نویسم۔ عقلے بہ کمال داشت۔ و اخلاص او بہ من در درجہ بود کہ ہزار پسر و برادر را قربانِ یک موے من می کرد۔ مکرر بہ خسرو مقدمات نوشت و اورا دلالت بہ اخلاص ومحبتِ من می کرد۔ چوں دید کہ ہیچ فائدہ نہ دارد، عاقبت نامعلوم است کہ بکجا منجر خواہد شد، از غیرتے کہ لازمۂ طبیعت راجپوتانی است خاطر بر مرگ خود قرار دادہ۔ وچندیں مرتبہ گاہ گاہے مزاج او در شورش می آمد۔ چنانچہ ایں حدیث میراثی بود کہ پدران وبرادران او ہمہ یکبار دیوانگی خود ہا را ظاہر می کردند وبعد از مدتے علاج پذیر می شدند۔ در ایامے کہ من بشکار متوجہ گشتہ بودم، روز بیست وششم ذیحجہ ۱۰۱۳ھ افیون بسیار درعین شورش دماغ خوردہ در اندک زمانے درگزشت گویا کہ ایں احوالِ پسر بیدولت خود را پیشتر می دید۔ استمداد اول کدخدائی

---

[۵۱] بیلیس اورینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری، صفحات ۲۴۴ و ۱۵۲۔ و امرائے ہنود، صفحہ ۸۳۔ ڈکن صاحب صفحہ ۲۶۔

[۵۲] تزک جہانگیری، صفحہ ۲۶۔ و دیباچہ تزک، صفحہ ۱۲۔

کہ در آغازِ جوانی و خورد سالی مرا دست داد نسبت اُو بُود۔ بعد از تولدِ خسرو اُورا شاہ بیگم خطاب دادہ بودم۔ چوں بدسلوکی ہائے فرزند و برادر را نسبت بہ من نہ توانست دید از سرِ جان در وقت دماغ پریشاں شدن درگزشتہ خودرا ازیں کلفت و اندوہ باز رہانید۔

"میری شہزادگی کے زمانے میں خسرو کی ماں بھی خسرو کے ناپسندیدہ اطوار و وضع اور اپنے چھوٹے بھائی مادھو سنگھ کے برتاؤ کے سبب سے افیون کھا کر مرگئی تھی۔ اُس کی خوبیاں اور نیکیاں کیا لکھوں۔ انتہا کی عقلمند تھی۔ میرے ساتھ اُس کا خلوص اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ میرے ایک ایک رونگٹے پر ہزاروں بیٹے اور بھائی قربان کر دیتی۔ اُس نے خسرو کو بارہا لکھا اور محبت و اخلاص کی راہ دکھاتی رہی۔ جب دیکھا کہ کچھ فائدہ نہیں نکلتا۔ انجام معلوم نہیں۔ کہاں تک پہنچے۔ تو غیرت کے باعث، جو راجپوتوں کی طبیعت کا خاصہ ہے، اپنی جان کھو دینے کی ٹھان لی۔ کبھی کبھی پہلے بھی اُس کے مزاج میں کئی مرتبہ شورش نمودار ہوچکی تھی۔ یہ تو موروثی بات تھی۔ اُس کے باپ دادا اور بھائی سب نے ایک نہ ایک بار پاگل پن ظاہر کیا تھا اور مدت کے بعد نفع ہوا تھا۔ جن دنوں میں شکار کے لئے گیا ہوا تھا ۲۶ ذیحجہ سنہ ۱۰۱۳ھ[1] کو عین شورش دماغ میں اُس نے بہت سی افیون کھالی اور تھوڑی دیر میں چل بسی۔ گویا کہ وہ اپنے نالائق بیٹے کی حالت پہلے ہی سے دیکھ رہی تھی۔ میری پہلی شادی جو شروع جوانی یا لڑکپن میں مجھے نصیب ہوئی، اُسی کے ساتھ ہوئی تھی۔

[یاد ہیں سارے وہ عیشِ بافراغت کے مزے دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے]

خسرو کے پیدا ہونے پر میں نے اُس کو "شاہ بیگم" خطاب دیا تھا۔ جب وہ اپنے بیٹے اور بھائی کی بدسلوکی میرے ساتھ دیکھ نہ سکی تو دماغ کی پریشانی کی حالت میں، اپنی جان کھودی اور اپنے کو اس رنج و تکلیف سے چھڑا لیا۔" اور مجھے وہ سزا دی جو محبت کے گنہگار کی تھی۔

---

[1] ۶ مئی سنہ ۱۶۰۵ء۔ لیکن اگر سال وقائع الناہجری ہے تو انگریزی سنہ ۱۶۰۴ء ہوگا۔ ڈاکٹر بینی پرشاد تاریخ جہانگیر (صفحات ۶۳، ۶۴) میں ۱۶ مئی سنہ ۱۶۰۴ء لکھتے ہیں۔

مادھو سنگھ اور اُس کے خاندان والوں کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ اس سچی وفاشعار و غمگسار بیوی کی جدائی کا جو ماتم جہانگیر کے سادہ نگار قلم نے کیا ہے[۵۱] اُس کو نقل کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اس دردِ دل کے ظاہر کرنے کی قوت اور کون سا انشا پرداز رکھتا ہے۔

افسانہ حُسن کا ہے اور عشق کی زباں ہے

از فوت او بنا بر تعلقے کہ داشتم، ایامے بر من گزشت کہ از حیات و زندگانی خود ہیچ گونہ لذتے نہ داشتم۔ چہار شبانہ روز کہ سی و دو پہر باشد از غایتِ کلفت و اندوہ چیزے از ماکول و مشروب وارد طبیعت نہ گشت چوں ایں قصہ بہ والد بزرگوارم رسید۔ دلاسا نامہ در غایت شفقت و مرحمت بدیں مُرید فدوی صادر گشت و خلعت و دستار مبارک کہ از سر برداشتہ بودند ہماں طور بستہ بہ جہت من فرستادند۔ ایں عنایت آبے بر آتش سوز و گداز من زدہ اضطراب و اضطرار مرا فی الجملہ قرارے و آرامے بخشید۔

" اُس کے مر جانے پر، میرے دل کے لگاؤ کی وجہ سے مجھ پر زمانہ گزر گیا۔ زندگی و حیات کی، کسی قسم کی، کوئی لذت میرے لئے باقی نہ تھی۔ چار رات دن جس کے بتیس پہر ہوتے ہیں، انتہا درجہ کا رنج اور تکلیف رہی۔ کھانے پینے کی کوئی چیز مُنہ تک نہ گئی۔ میرے بزرگ باپ نے جب یہ قصہ سُنا تو بڑی شفقت و مہربانی کے ساتھ اس فدوی ارادتمند کو دلاسے کا خط لکھا، خلعت اور اپنی برکت والی پگڑی سر سے جس طرح اُتاری تھی، اُسی طرح بندھی ہوئی میرے لئے بھیجی۔ میرے سوز و گداز کی آگ پر اس مہربانی سے پانی پڑ گیا۔ اور اضطراب و بےچینی میں کم یا زیادہ قرار و آرام پہونچا۔"

یہ خون کے آنسو جہانگیر کا قلم نہیں، آنکھ نہیں، دل بہا رہا ہے۔ ایک ایسی عورت کے رنج میں جس کی جوانی ڈھل چکی تھی۔ دماغ کے پیچ و تاب نے اور بھی نڈھال کر دیا تھا۔ گلچین جمال، ہوس پیشہ جہانگیر بھی وہی ہے، جس کی بیس بیگموں کی فہرست مسٹر بلاک مین نے آئینِ اکبری کے ترجمہ میں پیش کی ہے[۵۲] کپتان ولیم ہاکنس جس کی تین سو بیویاں بتاتے ہیں، اور اُن میں سے اصلی

---

[۵۱] تزک جہانگیری، صفحہ ۲۶۔

[۵۲] صفحہ ۶۱۹۔

ملکہ چارلسؔ۔ پادری ٹیری (Edward Terry) شہنشاہ کی "عورتوں" کا شمار ایک ہزار لکھتے ہیں[۲]۔ جو شاہ بیگم کی دائمی جدائی کے بعد بھی بہت سی بی بیوں کا خاوند ہے۔ جس کی نسبت کین صاحب کا قلم شوخی سے کام لے کر لکھتا ہے کہ "خود جہانگیر کو بھی ہمیشہ یہ خبر نہ رہتی تھی کہ اُس کے کون سے بیٹے کی ماں کون ہے"[۳]۔ جس کو فرنگستان کے اہلِ قلم[۴] مستِ الست بناتے ہیں اور رند ہزار شیوہ جس کو طاعتِ حق

---

[۱] سفرہائے بحری، صفحہ ۱۲۱۴ ۔

[۲] پادری صاحب سرطامس رُو سفیر انگلستان کے چیپ لین تھے اور اُنھیں کے ساتھ ۱۶۱۵ء میں ہندوستان آئے تھے جہانگیر کا دربار اور بادشاہانہ شوکت و احتشام دیکھا تھا۔ اپنی کتاب "مشرقی ہندوستان کے بحری سفر" (A Voyage to East India) میں یہاں کے بہت سے حالات لکھے ہیں۔ بعض باتوں کو اپنے ملک کی باتوں سے اور شہروں کو انگلستان کے دارالسلطنت سے زیادہ آباد و بارونق بتایا ہے۔ ۱۶۱۸ء میں واپس گئے ۔

[۳] مشرقی ہند کا سفر بحری، صفحات ۴۰۵ و ۶ ۔

[۴] شاید آں باعلم فراموشکاران مغرب کو کتاب بینی کی علوت و کثرت زیادہ یاد رکھنے کی اجازت نہیں دیتی یا بادشمنان نظرداری کے عملِ عزیز سے دوست اور اپنے خواہ مخواہ دور پڑ جاتے اور انھیں کے ملک و قوم کی تاریخیں اور روایتیں ان کے شرف مطالعہ و حوالہ سے محروم رہ جاتی ہیں ۔ بہرصورت ان کے وقوف و آگاہی کے لئے دو اقتباس پیش کر دینا ضروری ہیں۔

(۱) سر ہیتھوڈ ورہاریس نے ولایت کے مشہور رسالہ جورنل آف انڈین ہسٹری، بابتہ ماہ اگست ۱۹۲۳ء میں ایک عالمانہ مقالہ "ڈاکٹر برنیر شاہجہاں کے دربار میں" شائع فرمایا تھا۔ اس کے ضمن میں سلاطین یورپ کے درباروں کی اخلاقی حالت کا دربار مغلیہ سے موازنہ کیا تھا۔ لکھتے ہیں۔

"میں امید کرتا ہوں کہ میں عام رائے کے خلاف کسی غلطیات کی مدافعت کرنے کا مجرم نہ خیال کیا جاؤں گا" اگر میں یہ کہوں کہ سترھویں صدی میں "مغل اعظم" کا دربار بہ لحاظ عیش پرستی و شاہد بازی کے نہ صرف ظاہراً مہذب اور شائستہ نظر آتا تھا، بلکہ باطناً بھی وہ فرانس اور انگلینڈ کے درباروں کی بہ نسبت زیادہ با اخلاق تھا ۔

"عہد مغلیہ کی تاریخ میں اُس مسرت انگیز اشتیاق کا وجود نہیں پاتا جو انگلینڈ اور فرانس کے اُمرا میں اپنی بیٹیوں کی عصمت کو بادشاہ کی ہوسناکیوں پر قربان کر دینے کے لئے پیدا ہوا کرتا تھا۔ عین اُس عمر میں جب کہ ہمارے خیال کے مطابق ابھی ان کو اسکول میں زیر تعلیم ہونا چاہئے تھا نوجوان لڑکیاں درسیل یا وہائٹ ہال بھیج دی جاتی تھیں

(بقیہ صفحہ آیندہ پر)

میں سجدہ کے لئے سر جھکانا بھی گراں تھا آج اپنی صنم پرستی کی بدولت گم صُم ہو رہا ہے اور نیم دیوانہ۔ اللہ ری محبت کی قربانیاں!

(بقیہ صفحہ گزشتہ) تاکہ وہ شاہی نوازشات سے "سرفراز" ہو کر متمول بن جائیں۔ بقول سینٹ سائمن ہر والدین کی دلی تمنا بھی ہوتی تھی کہ اُن کی لڑکی سب سے بڑا انعام حاصل کرے اور بادشاہ کی معشوقہ بن جائے۔ اس معاملہ میں انگلینڈ کا اخلاقی معیار کچھ زیادہ بلند نہ تھا۔

"جب آرابیلا چرچل، جیمس (ڈیوک آف یارک) کی منظورِ نظر بن گئی تو بقول لارڈ میکالے، اُس کے والدین اس تعجب خیز احساس مسرت میں پڑ گئے کہ ایسی سیدھی سادھی لڑکی کس طرح اس شاہی معیار انتخاب پر پوری اُتری۔ اہل یورپ کی نظروں میں ایک شادی شدہ عورت سے بادشاہ کا تعشق کچھ بھی قابل اعتراض و ملامت نہ تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب مارکوئیس دی مونتیسپون کو لوئی چہاردہم (شاہ فرانس) کے ساتھ اپنی بہو کے تعشق کی خبر پہونچی تو اُس نے کہا کہ "الحمد للہ اب تمول ہمارے گھر میں داخل ہونے لگا ہے!" (مترجمات قاضی احمد میاں، اختر جونا گڑھی، صفحات ۶۰ و ۶۱۔ در رسالہ "زبان"، منگرول، ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء) یہ سامنے غیر کے تم فتنہ مجھے کہتے ہو چھائی جاتی ہے یہ دیکھو تو سراپا کس پر۔

(۲) دوسری حکایت تعدد و تکاثر ازواج کے متعلق ہے۔ جس پر خانوادۂ نبوت و ایالت کے انتساب سے مذہبی تقدس و عظمت کا رنگ بھی جلوہ افروز ہے۔ اس لئے ہمارے ادب و احترام کی مستحق ہے مگر تقلید و اتباع کی نہیں۔

لارڈ آکسفورڈ اپنی کتاب 'یادداشت' "Memories and Reflections" by Lord Oxford and Asquith

میں لکھتے ہیں "بادشاہوں کی پہلی کتاب کو میں نے خوب پڑھا ہے خاص کر حضرت سلیمان کی بابت ان کی سات سو بیبیاں تھیں۔ اور تین سو آشنائیں۔ (مجھے تو حیرت ہے کہ دونوں میں فرق کیا تھا!) یہ سب کی سب یا زیادہ تر غیر ملک و قوم کی مشرکہ تھیں۔ اس لئے انھوں نے اورشلیم (بیت المقدس) میں ان کے لئے مرتفعات (altars) بنوا دئے تھے۔ تاکہ اپنے وطن کے خداؤں کی پرستش بدستور کرتی رہیں۔ اور باوجود اس قدر حد سے زیادہ سہولتوں کے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک ہی بیٹا پیدا کیا تھا۔ رحبعام نام جس نے سلطنت کھودی۔ کیسی تضیع تھی!" (اخبار 'لیڈر'، روز شنبہ، ۱۴ر نومبر ۱۹۳۱ء صفحہ ۱۹)۔

کتاب مقدس کے عہد نامۂ قدیم (ترجمہ عربی، بیروت، م۔ ۱۸ مسیحی) میں بھی یہ ہی مذکور ہے۔ بی بیوں کے لئے 'سیدات' اور کنیزوں کے لئے 'سراری' کا لفظ استعمال ہوا ہے (صفحہ ۵۰۲)۔ لیکن علّامہ امین ہروی رشحات الفنون میں لکھتے ہیں "سلیمان بن داؤد علیہما السلام۔ سی صد زن در عقد نکاح او بود و ہفت صد کنیزک سر یت داشت" (جزو اول، ورق ۱۱۱، قلمی)۔

جہانگیر کے ایسے عیش پسند و عشرت کوش کا برابر چار شبانہ روز بھوکا پیاسا رہنا، اُس کے انتہائی رنج و قلق، دل کی بے قراری اور بےچینی کی کیفیت کو اُسی کی زبان سے ادا کر گیا ہے۔

ملک رجبعام کے متعلق عرب کا پُرانا اور مستند مورخ شاہزادہ ابوالفدا اسماعیل بھی شکوہ گزار ہے۔

"رجبعم پسر سلیمان، بدصورت بدنگاہ فاسق و کافر تھا۔ حضرت موسیٰ کی وفات کے پونے چھ سو برس بعد تخت نشین ہوا تھا۔" (تاریخ۔ جلد اول، صفحہ ۳۶)۔

اگر یہ دور کی باتیں مقصور ہوں اور پرانی کہانیاں، تو خود ہندوستان کے ایک گوشے میں گوا کی حالت دیکھ لیجئے جو سترھویں صدی (اپریل ۱۶۲۴ء) میں ہو رہی تھی اور جس کو پٹیرو ڈیلا دیلے Pietro Della Valle نے اپنے سیاحت نامہ میں بڑے درد و گداز کے ساتھ لکھا ہے اور جس کا پورا ایک صفحہ (۱۶۱) پرتگیزوں کی عیاشی کے نذر کر دیا ہے "اوروں پر تو بہت کچھ ..... مگر یہ لوگ خود اس قسم کے معاملات (معاشرت و ماندوبود) میں نہایت بے روک ٹوک ہیں۔ اپنی قریب سی قریب کی رشتہ دار کو نہیں چھوڑتے، حتیٰ کہ اپنی بہنوں کو بھی، جیسا کہ میں نے سنا ہے۔ رضاعی اور گھر کے پروردہ بچوں کا کیا شمار و قطار ...." اس بحث پر مسٹر ایڈورڈ گرے نے اضافہ کیا اور ڈی کلون کے اسکیچ آف گوا De Kloguen's Sketch of Goa (صفحہ ۱۷۱) اور فان سیکا Fonseca (صفحہ ۱۶۲) پر توجہ دلاتے ہیں۔ جس نے تحریر کیا ہے۔ "تعیش و بدکاری اونچے اونچے طبقوں میں فی الحقیقت راج روگ یا سلطنت فرما عیب بن گیا ہے۔ اور اُن کے اخلاق و اطوار جو اصلاح و درستی کی امیدوں کے حدود سے گزر چکے ہیں بگڑے ہوئے اور خراب ہو رہے ہیں۔"

لیکن شہنشاہ اکبر بھی اس سانحۂ غم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ دلبند فرزند کی تسلی اور دلاسے کے لئے خط لکھا۔ سر سے پگڑی اُتار کر جیسی بندھی ہوئی تھی ویسی ہی بھیجدی کہ زخمِ دل کے اندمال کے لئے یہی ایک مرہم تھا۔

ایسی سلیقہ مند، وفا سرشت، نیک نہاد بیگم کی نیکیوں اور خوبیوں کا اعتراف، جو اُنیس (۱۹) بیس (۲۰) سال کی رفاقت و یکجائی کا نتیجہ تھا، اور شوہر کا اُس کو اور اُس کی محبت و اخلاص کو اس طرح یاد کرنا[۵۱] صنفِ نازک کے ہر فرد کے لئے قابلِ فخر اور موجب شرف ہے۔ شاہ بیگم کا خیال جہانگیر کے دل سے کبھی محو نہیں ہوا۔ تزک کے اوراق پر دہ بارہا اُس کا ماتم کرتا نظر آتا ہے۔ آخر یہ کہہ کر چپ ہو جاتا ہے۔

اُٹھیں گے آذر ہزاروں حُسن کے بتخانے سے
مے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون ؟
اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون !

تنہا جہانگیر ہی نہیں بلکہ اور معاصر مورخ بھی اُس کے اخلاقِ حسنہ، خصائلِ حمیدہ، پاکدامنی اور پاکیزہ وشی کو مدِ نظر رکھ کر ادب و احترام کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ مرزا ہادی تزک کے دیباچے میں[۵۲] لکھتے ہیں کہ ایک خلفشار کے بعد، جب جہانگیر الٰہ آباد واپس پہنچا تو اکبر نے اُس کے لئے خلعت و انعامات بھیجے۔ ہر طرح کا سامان تسلی و دلداری کیا۔ تب وہ کچھ روز یہاں مطمئن و فارغ البال رہ کر بسر کر سکا تھا۔ قضا را والدۂ سلطان خسرو نقاب آرائے نہاں خانۂ عدم گشت۔ تفصیل ایں اجمال آنکہ در نیولا

---

[۵۱] ڈاکٹر بینی پرشاد (صفحہ ۲۹) تحریر کرتے ہیں کہ یہ الفاظ بیگم کے مرنے کے دو برس بعد جہانگیر کے قلم سے نکلے تھے۔

[۵۲] صفحہ ۱۲۔

پیوستہ در دماغ آں عفت سرشت بہم رسید و سودائے بر مزاج استیلا یافت و چوں خسرو از بیراہ روی در ملازمت حضرت عرش آشیانی ہموارہ بہ شکوۂ شاہنشاہی می پرداخت۔ ایں غم سربار آں گشت ۔ در روزے آنحضرت بشکار تشریف بردہ بودند پوشیدہ از پرستاران افیون خوردہ سر بہ بالینِ فنا نہاد۔ وچوں سر آمدِ پردگیانِ حرم سرائے سلطنت بودہ اُنس و محبت تمام با و داشتند۔ خاطر قدسی مظاہر ازیں سانحہ بہ نہایت ملول و بغایت اندوہ گیں شد و بر دلِ مہر منزل ایں مصیبت سخت گرانی کرد، و حضرت عرش آشیانی از استماع ایں حادثہ ناگزیر و آشفتگی ضمیرِ فیض پذیر فرمان از روے کمال مہربانی و غمگساری فرستادہ تسلی بخش خاطر عاطر شدند۔

"اتفاقاً، قضائے الٰہی سے خسرو کی ماں نے دنیا سے پردہ کیا۔ ان دنوں، اُس نیک بی بی کے دماغ میں خشکی پیدا ہوگئی تھی۔ سودا مزاج پر غالب تھا۔ ادھر خسرو کی بے راہی اور ناہنجاری کی حالت یہ ہو رہی تھی کہ اکبر کے حضور میں جہانگیر کی شکایتیں کیا کرتا تھا۔ بیگم کو اس کا غم اور بڑھ گیا تھا۔ ایک روز جہانگیر شکار کو گیا ہوا تھا، بیگم نے لونڈی باندیوں سے چھپا کر افیون کھالی اور اپنے کو ختم کر دیا۔ حرم سرائے شاہنشاہی کی بی بیوں میں یہ سب سے بلند مرتبہ والی تھی۔ جہانگیر کو اس سے نہایت اُلفت و محبت تھی۔ شاہزادہ کے دل پر اس سانحہ سے بڑا رنج و اندوہ ہوا۔ یہ مصیبت بڑی بھاری تھی۔ اکبر کو اس حادثے اور جہانگیر کے قلق و تاسف کی اطلاع ہوئی تو کمال مہربانی و غم خواری فرمائی۔ فرمان بھیجا اور جہانگیر کی دلداری کی۔ دلاسا دیا۔"

اسی واقعہ کی نسبت منتخب اللباب میں تحریر ہے۔[۵۱]

درہمیں آوان چوں والدۂ خسرو کہ ہمشیرۂ[۵۲] راجہ مان سنگھ می شد سودائے مزاج بہم رسانیدہ بود

---

[۵۱] خافی خاں، حصہ اوّل، صفحہ ۲۲۷۔

[۵۲] یہی صاحب صفحہ ۲۳۸ پر لکھتے ہیں کہ راجہ مان سنگھ کی صبیہ (لڑکی) جہانگیر سے منسوب ہوئی تھی۔ بہن (خواہر یا ہمشیر) لکھنا چاہیے تھا۔ ممکن ہے کہ طابع کی غلطی ہو۔ یا یہ کہ بہن کے مرنے کے بعد بیٹی بیاہ دی ہو۔ ایسا عقد شرعاً و رداجاً جائز ہے۔

ازاداہائے خارج واطوار ناہموار خسرو ناخلف کہ سہ سال از شاہزادۂ عالی نژادِ بلند اقبال محمد خرم کلاں بود ونظر بر عنایات وتوجہات جدِ بزرگوار وپدرِ نامدار کہ نسبت بہ خسرو درحق آں غرۂ جاہ وجلال زیادہ مبذول می گردید از راہ حسد بر خود ہموار نمی توانست بود ودر خدمتِ پدر گستاخانہ وبے ادبانہ سلوک می نمود وعندالفرصت بخدمتِ جدِ بزرگوار طریقۂ غمازی از طرف شاہنشاہی[۵] بکار بردہ شعلہ افروزی عناد می نمود ومادر اُو در منعِ آں می کوشید وفائدہ نمی بخشید۔ علاوہ مرض سودا گردیدہ بود۔ دریں آوان روزے خود را از غصۂ اطوار آں فرزند بدعاقبت از افیون مسموم ساخت۔ وبرخاستہ رفتنِ عبداللہ خاں وواقعۂ والدۂ خسرو معاً بعرضِ شاہزادہ نامدار رسید وباعث الم خاطر گردید۔

"اسی زمانے میں خسرو کی ماں کا مزاج سودائی ہوگیا تھا۔ جو راجہ مان سنگھ کی بہن ہوتی تھی۔ نالائق خسرو شاہزادہ خورم سے تین سال بڑا تھا۔ مگر اس کے طور طریق کی کیفیت یہ تھی کہ اکبر جب خسرو کے مقابلہ میں، شاہزادہ (جہانگیر) پر عنایت وتوجہ زیادہ کرتا، تو اس کو بڑا رنج وحسد ہوتا تھا۔ باپ سے گستاخانہ اور بے ادبانہ برتاؤ کرتا۔ موقع پاتا تو دادا جان کے سامنے جہانگیر کی شکایتیں کیا کرتا اور دشمنی وعناد پھیلاتا۔ اس کی ماں ہر چند باز رکھنے کی کوشش کرتی' فائدہ نہ ہوتا۔ اس کے سوا مرض سودا تو ہو ہی گیا تھا۔ انھیں دنوں کمبخت بیٹے کے اطوار سے غصہ ہوکر زہر (افیون) کھالیا۔ عبداللہ خاں کا اُٹھ کر چلا جانا اور خسرو کی ماں کا واقعہ' شاہزادہ نے ایک ساتھ سنا تو بڑا رنج ہوا۔[4]

جیسا کہ جہانگیر کہتا ہے یہ سودا اور آشفتہ سری بیگم کا خاندانی مرض تھا۔ خود اُس کے نامور اور بہادر باپ امیرالامرا راجہ بھگوان داس میں، جب وہ صوبہ داری کابل پر ۹۹۴ھ (۱۵۸۶ء) میں متعین وسرفراز ہوا، تو دیوانگی کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ حکیم نے نبض پر ہاتھ رکھا۔ راجہ جمدھر

---

[۵] شاہزادۂ سلیم سے مراد ہے۔ ولی عہد مقرر کرنے کے بعد اکبر نے "جہانگیر" کا لقب دیدیا تھا۔ منتخب اللباب' حصہ اول' صفحہ ۲۳۰۔ دربار اکبری' صفحہ ۹۳۔

کھینچ کر اپنے مار لیا۔ زندگی باقی تھی۔ بادشاہی طبیبوں کے علاج و پرداخت سے کچھ دن بعد بمشکل شفایاب ہوا۔[۹۱]

جب تک در و دیوار کی دنیا میں بنا ہے　　افسانہ رہے گا مری شوریدہ سری کا

ہاں۔ "افیون کھا لینے" یعنی اس طرح خودکشی کا خراب اور ناپاک عمل ہمارے ملک میں کم ہو چلا ہے، مگر اب بھی باقی ہے۔ بعض وقت طبقۂ ادنیٰ کی کوتاہ اندیش، نادان عورتیں جب کسی صدمہ یا رنج کو برداشت نہیں کر سکتیں تو افیون کھا کر جان دے دیتی ہیں۔ اسی کو آسان سمجھتی ہیں۔ قدیم زمانے میں اس کا رواج اونچے اونچے طبقوں میں بھی تھا۔ تین چار سو برس پیشتر کی متعدد مثالیں، عہد جہانگیری کی تاریخوں میں ملتی ہیں۔ سال سوم جلوس یعنی ۱۰۱۷ھ (۱۶۰۸ء) کے واقعات میں لکھا ہے[۹۲] کہ جلال الدین مسعود پسر میر گیسو دراز نے جب انتقال کیا تو اُس کی ماں نے کمال دلبستگی و تعلق سے اُس کی حالت احتضار میں اُسی کے ہاتھ سے افیون کھالی اور بیٹے کے مرنے کے ایک دو گھڑی بعد خود بھی اس جہاں سے چل بسی۔ قریب ہی زمانہ میں[۹۳] لعل خاں[۹۴] شاہی کلاونت[۹۵] بھی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اکبر اس کی بڑی قدر کرتا تھا۔ لعل نے بچپن سے اُس کے زیر نظر تربیت پائی تھی۔ ملتزم خدمتِ خاص تھا۔ فن موسیقی خصوصاً ہندی گانے میں نظیر نہیں رکھتا تھا۔ وہ پینسٹھ بلکہ ستر برس کے سن میں فوت ہوا۔ کلاونت کی ایک کنیز تھی، جس کی دلفریب

---

[۹۱] مآثر الامرا جلد دوم، صفحہ ۱۳۱۔ د۔ اُمرائے ہنود، صفحہ ۸۵۔

[۹۲] اقبال نامۂ جہانگیری، صفحہ ۳۳۔ توزک جہانگیری صفحہ ۶۷۔ ترجمۂ راجرس صفحہ ۱۴۲۔ و ترجمۂ مآثر الامرا، بیورتج صاحب صفحہ ۵۷۶۔

[۹۳] اقبال نامہ جہانگیری، صفحہ ۳۳۔ توزک جہانگیری، صفحہ ۷۱۔

[۹۴] ہندوستان کا مشہور گویّا اور فن موسیقی کا ماہرِ کامل تھا۔ جہانگیر کے جلوس کے چوتھے سال ۱۰۱۸ھ (۱۶۰۹ء) میں راہی عالم بقا ہوا۔ (بیل۔ بیاگرفی کل ڈکشنری صفحہ ۱۵۹۔)

[۹۵] کلاونت۔ کلاوت۔ ہندی لفظ ہے مطرب اور گانے والوں کو کہتے ہیں۔

صورت کا وہ عاشق، اور فسوں ساز چشم کا مسحور تھا۔ معمولاً اُسی کے ہاتھ سے افیون کھاتا تھا۔ لعل خاں کے مرنے پر اُس نے بھی افیون کھالی۔ اور عدم کی راہ میں مالک کی رفاقت اختیار کی۔ جہانگیر کہتا ہے کہ[۵۱] مسلمانوں میں کسی عورت نے اس درجہ وفاداری کا حق کم ادا کیا ہوگا۔ ع کہ فخرِ عاشقی و نازشِ وفا تھی وہ۔

میر جلال کے سلسلہ میں بخشی معتمد خاں (مولفِ اقبال نامہ جہانگیری) کا بیان ہے کہ ہندوستان کی یہ رسم تو بہت پرانی ہوچکی کہ شوہر کے مرجانے پر ہندوؤں کی عورتیں خود کو آگ میں زندہ جلا دیتی اور اپنی جانِ عزیز اپنی محبت و وفاکیشی پر فدا کردیتی ہیں۔ بارہا ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ دس بیس عورتیں خواہ بی بی رہی ہوں خواہ باندی، آگ میں خود گھس گئی ہیں اور پورے استقلال کے ساتھ اپنے کو جلا دیا۔ مگر بیٹے کی جدائی میں ماں کی یہ کیفیت اس سے پہلے نہیں سنی گئی۔ جہانگیر بھی تو زک میں لکھتا ہے[۵۲] کہ ماؤں سے خواہ مسلمان ہوں خواہ ہندو، ایسا واقعہ ظہور میں نہیں آیا۔

شاہ بیگم کے مرنے کے بارے میں یہ تو وہ مسلمہ اور متفقہ بیان تھا، جو بلا اختلافِ الفاظ تمام ہندو اور مسلمان مورخوں اور اُن کے ریزہ چین انگریزوں نے کیا ہے[۵۳]۔ مگر با ایں ہمہ ایک اور روایت بھی ہے جو بداہتہً لغو اور ناقابلِ التفات، یا کسی افسانہ کی ٹوٹی ہوئی کڑی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ایک ذمہ دار و نامور اہلِ قلم کے قلم سے نکلی ہے، اس لئے یہاں اُس کا نقل کرنا ناگزیر ہے۔ سر ولیم سلی مین اپنی دلچسپ کتاب "سیاحت و تذکار" میں ایک موقع پر لکھتے ہیں[۵۴]:

"جہانگیر کے بڑے بیٹے خسرو کی آنکھیں باپ کے حکم سے نکلوالی گئی تھیں، کیونکہ وہ بغاوت پر بغاوت کیا کرتا تھا۔ بغاوت کی ترغیب دینے والے دو سبب تھے۔ ایک تو خود اُس کی خواہش کہ ماں کے قتل کا انتقام لوں۔ دوسرے، اُس (ماں) کے بھائی ہندو شاہزادہ مان سنگھ اور خسرو کے خسر خانِ اعظم، اکبر کے وزیر اعظم کی یہ آرزو کہ اپنے عزیز کو تخت پر دیکھیں۔ نورجہاں نے

---

۵۱ تزکِ جہانگیری۔ صفحہ ۱۷۔ ۵۲ ایضاً صفحہ ۱۸۔

۵۳ جیلس بیاگرافی کل ڈکشنری، صفحہ ۲۴۴۔

۵۴ سیاحت نامہ و تذکرہ، صفحہ ۴۰۲ جلد اول۔

خسرو کی ماں یعنی راجہ مان سنگھ کی بہن کو بلایا تھا کہ ہمارے یہاں آکر ایک کنوئیں میں جو ہماری محل سرا کے صحن میں ہے، چاندنی رات میں میرے ساتھ جھانکو۔ جب وہ جھانکنے لگی تو اُس کو کنوئیں کے اندر ڈھکیل دیا۔ نورجہاں نے جب دیکھا کہ اس نے ہاتھ پاؤں مارنا چھوڑ دیے ہیں تو شور وغل کیا۔ اور بات بنائی کہ رانی اتفاقیہ گر پڑی ہے۔"

"ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ سا ژرف بین ومحتاط تاریخ نویس اس پر حاشیہ لکھ کر اپنا خیال ظاہر کرتا ہے:-

"ممکن ہے کہ یہ حکایت صحیح ہو۔ مگر اس قسم کا الزام قطعاً ناممکن الاثبات ہے اور محلات کی فضا میں نشوونما پا جانے والا[۱]۔"

ایلیٹ اور ڈوسن صاحبان نے تکمیل اکبرنامہ کے حوالہ سے اس خودکشی کا باعث بیگم اور اُس کی ایک سوت کے جھگڑے کو لکھا ہے[۲]۔ ڈاکٹر بینی پرشاد اس کو بھی غلط سمجھتے ہیں[۳]۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخی واقعات کے ردّ وقبول میں بعض یورپین مورخ ایک روشِ خاص، یا اُن کی اصطلاح میں ایک "اصول" رکھتے ہیں۔ اُن کا دستور ہے کہ مسلمان بادشاہوں اور بیگموں کی نسبت کیسی ہی بے بنیاد وبیہودہ بات بتائی یا سنائی جائے تو اُس کو باور یا بیان کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ ممکن ہے کہ یہ آپ ہی کی طبعزاد ہو۔ مخالف وموافق تمام روایتوں کے مطابق جہانگیر کے زمانۂ شاہزادگی میں، والدۂ خسرو نے آخر سنہ ۱۰۱۲ھ یعنی مئی سنہ ۱۶۰۴ء میں افیون کھا کر جان دی تھی۔ سرٹامس ہربرٹ، بیل اور بلاک مین صاحبان اس بارے میں متفق اللسان ہیں کہ شمسی حساب سے نورجہاں چونتیس (۳۴) سال کی تھی جب سنہ ۱۶۱۱ء (۱۰۱۹ھ) میں شبستان شاہی یعنی جہانگیر کے عقد میں آئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اُس کے بعد مہرالنساء کو

---

[۱] نوٹ زیر صفحہ ۲۰۴ مذکور۔

[۲] جلد ششم صفحہ ۱۱۲۔

[۳] تاریخ جہانگیر، صفحہ ۴۶۔

نور محل[۵۱] اور نور محل سے نور جہاں بننے میں بھی کچھ زمانہ لگا ہوگا - وہ ۱۶۱۱ء میں شیر افگن کی بی بی تھی بنگالہ میں رہی ہوگی - تو نور جہاں اور شاہ بیگم کی یکجائی اور جوشِ رقابت و عناد کو کون ہوشمند باور کرے گا !!!

جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹ بات کہتا

تمہیں منصفی سے کہدو تمہیں اعتبار ہوتا

بعض صاحبوں نے سالِ وفات ۱۰۱۱ھ لکھا ہے[۵۲] اُس زمانہ کی تاریخوں اور اصلی تحریرات و اسناد کے دیکھنے سے یہ غلطی کھل جاتی اور قلم کی لغزش صاف نظر آتی ہے -

اسی طرح مسٹر نیویل کا یہ خیال کہ خسرو کے معاملات میں اُس کی ماں مدد و معاون تھی[۵۳]، صریحاً خلاف قرائن و خلاف واقع ہے - خود جہانگیر کی تحریرات اور تمام معاصر مورخین کے تذکروں سے اس کی تردید ہوتی ہے - ممکن ہے کہ موصوف نے ایلیٹ صاحب کی تاریخ سے[۵۴] دھوکا کھایا ہو -

ان حضرات کی تلاش اور ذوقِ تحقیق قابل داد ہے - لیکن بعض کی ہمہ دانی اور احتیاط کی کیفیت بھی لائق اعتنا ہے - مسٹر ہیو مرے Hugh Murray اپنی تاریخ ہند برطانوی History of British India میں تحریر فرماتے ہیں کہ " نور جہاں آگرہ کے ایک روضہ میں جو تاج محل کہلاتا ہے دفن ہے[۵۵] " ایک اور صاحب جب " شورش ہندوستان کی تاریخ " لکھنے بیٹھتے ہیں تو رقم طراز ہوتے ہیں کہ " شاہ جہاں اور اُس کی محبوب بی بی نور جہاں کا یہی روضہ تھا[۵۶] "

شاہ بیگم کی نسبت مسٹر گلیڈون اپنی تاریخِ جہانگیر[۵۷] میں لکھتے ہیں کہ " یہ شاہزادی (مان بائی) بہت ملنسار تھی علاوہ اس کے حد سے زیادہ حسین، بڑی اچھی سمجھ والی، نہایت دلکش، ملائم طبیعت والی تھی - اطوار دلآویز و شیریں تھے "

---

[۵۱] نور جہاں کا عروج، دیباچہ تزک، صفحہ ۲۰ - سیاحت نامہ سلی مین صاحب، جلد اول، صفحہ ۱۰۴ - ترجمۂ تزک، صفحہ ۱۹۲، نوٹ جلد اول - نور جہاں جہانگیر کے مرنے کے بعد اٹھارہ سال زندہ رہی - بہتر برس کی عمر میں ۱۰۵۵ھ یا ۱۶۴۵ء میں دنیا سے رخصت ہوئی -

[۵۲] جہانگیر آربی، جلد اول صفحات ۵۵ و ۵۷ - خافی خان، منتخب اللباب، حصہ اول، صفحہ ۲۲۷ -

[۵۳] ڈسٹرکٹ گزیٹیر الہ آباد، سلسلۂ جدید، صفحہ ۱۶۹، جلد ۲۳ - و سابق صفحہ ۱۳۸، جلد ہشتم -

[۵۴] جلد ششم، صفحہ ۲۹۸ - [۵۵] صفحہ ۲۳۰ - [۵۶] صفحہ ۱۰۹ - [۵۷] صفحہ ۱۳ -

پروفیسر بینی پرشاد فرماتے ہیں[۵۱] "کہ سلطنت کے بلند اغراض و فوائد کے درمیان آجانے سے پولیٹکل شادیوں سے اکثر متعاقدین کی مسرت و انبساط کا خون ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں تو کچھ اور ہی صورت تھی۔ مان بائی کے حسن و جمال، ذہانت اور دلکش سلیقوں سے شاہزادہ سلیم اس پر مفتوں تھا۔ اور باوجودیکہ ایک مالیخولیائی رنگ یا کیفیت، اس کے خاندان میں متوارث چلی آتی تھی اور جس کو مزمن بیماری آسانی سے دیوانگی کے حدود تک پہنچا سکتی تھی، وہ اپنے شوہر کے دل کو گرم اور زندگی کو پر لطف رکھتی تھی"۔

اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہتی تو جہانگیر کے تاج و تخت پانے پر اُس کا مرتبہ کیا ہوتا۔ وہ سب سے بڑی ملکہ یا "بانوسے بانویان" ہوتی اور تمام بیگمات شاہی حتیٰ کہ جودھ بائی اور نور جہاں[۵۲] پر اختیار و اقتدار رکھتی۔ ابوالفضل علامی کی شہادت ہے کہ "آئینِ الوس[۵۳] ملکی است کہ حرمِ کلاں در نگاہ داشتِ دیگراں اختیار دارد۔"[۵۴] مولانا ظفر علی خاں لطائف الادب[۵۵] میں راوی ہیں "مغلوں میں قدیم سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ خاقانہ اپنے شوہر کی دوسری بی بیوں کو اپنی باندیاں سمجھ کر جسے چاہے بخش سکتی تھی جیسا کہ ۱۲۲۱ء میں خاقان اسان بغا والی ماوراء النہر کی بڑی بیگم ساتلمش خاتون نے اپنی سوکن مانلک کو جذبۂ رقابت سے بیتاب ہو کر ایک امیر کبیر وختوی شراول کے نکاح میں دیدیا تھا۔"

مرنے کے وقت بیگم کی عمر تینتیس برس کے قریب تھی۔ اُنیس (۱۹) سال دلدار و دلنواز خاوند کی خدمت گزاری، اطاعت و رفاقت میں گزارے تھے۔

نیرنگِ حسن و عشق کی وہ آخری بہار　　تربت تھی میری اور کوئی اشکبار تھا

---

۵۱ تاریخ جہانگیر صفحہ ۲۹۔

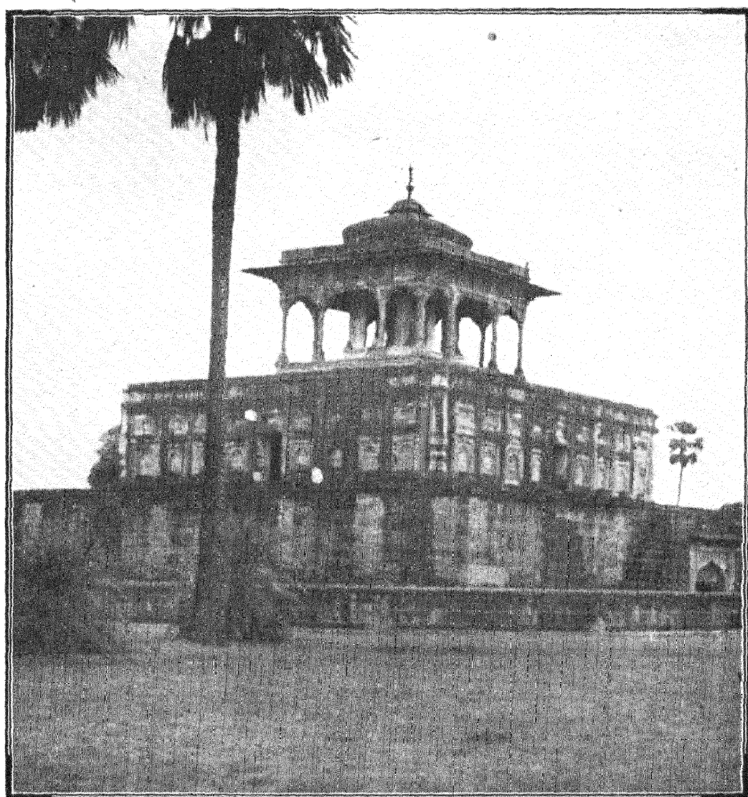
۵۲ وہی نور جہاں جس کی نسبت خود جہانگیر نے تزک میں تسلیم کیا تھا "تا از نور جہاں محلسرائے میں آباد نہ شدہ بود۔ از مزۂ خانہ داری و انتظامِ مصالحِ بیت واقف نہ بودم۔ حالا سردار چار صد حرم محترم من است۔" (صفحہ ۱۱ تاریخ پادشاہانِ دہلی موسوم بہ تاریخ بیب، مطبوعہ ۱۲۷۳ھ، لکھنؤ، مطبع حسنی)۔

۵۳ قوم کو ترکی زبان میں کہتے ہیں قبیلۂ بزرگ۔ ۵۴ اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۵۰۲۔

۵۵ مطبوعہ لاہور، صفحہ ۱۳۔

(۴)

مقبرۂ شاہ بیگم



مقبول صمدنی

مقبرۂ شاہ بیگم

خلوص ووفا کی پیکر، بے قرار اور درد مند دل والی بیگم آج اپنے شوہر کے قرب ظاہری سے محروم اور اُس کی آخری آرام گاہ سے منزلوں دور ہے۔ وہ الٰہ آباد میں دفن ہے اور جہانگیر لاہور میں۔ مگر اُس کی بے چین روح کو تسکین و تسلی ہے کہ خسرو باغ کی یہ ڈھائی گز زمین اُسکی ابدی خواب و راحت کے لئے اُس کے غمگسار سرتاج نے پسند کی تھی۔ اُسی کے نازبردار ہاتھوں سے سپردِ خاک ہوئی۔ وہ جیسی نفیس مزاج، جمیل و خوبصورت تھی، نصیبوں سے ویسی ہی حسین و دلکش قبر بھی پائی۔ یہ مقبرہ نہایت خوش قطع غیر معمولی طرز کا ہے، ہندوؤں اور اندلسی مسلمانوں کے ملے جُلے طریق تعمیر کا بہتر نمونہ۔ بیگم نے ایک ہندو راجہ کے گھر جنم لیا تھا، ایک مسلمان بادشاہ کے یہاں دم توڑا۔ اس لئے اُس کا مدفن دونوں کی مخلوط و متحد یادگاروں کی نظیر ہے۔ اکبر کے عہد کا عروج تھا، اور جہانگیر کی ذاتی نگرانی اور توجہ۔ ایسی چیز تیار ہوگئی جس کی مثال دوسری جگہ کم ملے گی۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

اس کے بعد (یا اس کے سوا) جو اس قسم کی شاہی عمارت کبھی بنائی گئی تھی وہ دھاکری محل بی بی ایشروئی کا سنگ سرخ کا مقبرہ آگرہ میں ہے۔ یہ کوئی راجپوت بیگم تھیں۔ اکبر کی ہوں یا جہانگیر کی؟ تاریخ نہیں بتا سکتی [1]۔

سلاطینِ اسلام کے مختلف خاندانوں اور مختلف دوروں کے طرزِ تعمیر سے صاحبانِ فن و اہلِ نظر کو اطلاع و آگاہی ہے۔ اس لئے صراحت و تشریح کی ضرورت نہیں۔ اس قدر یاد دلا دینا کافی ہے [2] کہ

---

[1] مرقع اکبرآباد، از مولوی سعید احمد مارہروی، صفحہ ۱۷۰۔

[2] ،، ،، ،، ،، ،، ،، صفحہ ۶۔

"اکبر جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانہ میں عربی تعمیرات کا اثر ختم ہوکر ہندوؤں اور ایرانیوں کا اثر قائم ہوگیا تھا۔ یا یوں کہئے کہ عربی طرز تعمیر کے بجائے ہندی طرز تعمیر غالب ہوکر جدید مغلیہ طرز تعمیر کی بنیاد پڑی تھی۔ جہانگیری طرز تعمیر میں جو مغلیہ طرز تعمیر کا وسطی یا دوسرا دور ہے، عربی اور ایرانی طرز کے ساتھ ہندوؤں اور بودھوں کا طرز تعمیر بھی نظر آتا ہے"۔ انھیں اصلاحات اور ترتیبات اور اُن کے مطابق تعمیرات کو دیکھ کر وسیع النظر ونج ووڈ ہیتھ (Wedgewood Heath) کو اقرار کرنا پڑا تھا کہ شاہانِ مغلیہ فن تعمیر کے بھی بادشاہ ہیں۔ یہ مقبرہ اس اتحاد کی زندہ یادگار اور جہانگیری عمارات میں نقشِ اولیں ہے۔

یہ سنگین و خوشنما نازک عمارت باغ کے پچھم جانب، خسرو باغ کا تیسرا[۹۱] مقبرہ ہے، مسٹر بیل[۹۲] کے حساب سے دوسرا، اور زمانۂ تعمیر کے لحاظ سے پہلا۔

باغ کے صدر جنوبی دروازے سے دو سو اسّی[۲۸۰] قدم کے فاصلہ پر بالکل سامنے یہ سہ منزلہ عمارت واقع ہے۔ اتفاق سے آج کل اس کے قریب ہی املی کے ایک پرانے درخت کی شاخیں راستہ پر بڑھ آئیں اور پھیل گئی ہیں، جس سے نگاہ کو دفعتہً رُک جانا پڑتا ہے۔ لیکن بعض اوقات اس کا سایہ سایۂ رحمت اور باعث راحت و فرحت ثابت ہوتا ہے۔ اور دوسرا ہی قدم یا دوسری ہی نظر ڈالنے پر مقبرہ کا سنگین چبوترہ، بلند کرسی، سطح زمین سے ملا ہوا دروازہ، بلکہ عمارت کی ہر چیز گنبد مع کلس سامنے آجاتا ہے۔ پھاٹک سے یہاں تک پہنچنے کے لئے فراخ و کشادہ سڑک موجود ہے، جو تقریباً آدھے راستہ تک خوب پختہ، سواری لے جانے کے قابل بنی ہے۔ اس کے دونوں جانب دلآویز روشیں، سرسبز و شاداب پھولوں کی کیاریاں، خوشنما جھاڑیاں اور جا بجا بڑے بڑے گھنے درخت بھی ہیں۔ بقیہ نصف راہ صرف پیادہ طے کرنا ہوتی ہے، کیونکہ گھومنے والوں کے لئے پختہ سڑک یہاں سے بائیں کو گھوم جاتی ہے۔ اور چند پتھر یہاں سدِّ راہ کھڑے کر دئے گئے ہیں۔ بائیسکل لے جانے

---

[۹۱] آرکیالوجی کل سروے آف انڈیا، جلد دوم یعنی دی مانومینٹل انٹی کوئیٹیز اینڈ انسکرپشنس، مولفہ ڈاکٹر اے فوہرر پی ایچ ڈی، مطبوعہ ۱۸۹۱ء، صفحہ ۱۳۰۔ اور پریاگ یا الٰہ آباد کی ہینڈ بک، مرتبہ ماڈرن ریویو آفس صفحہ ۵۳۔ [۹۲] ڈسٹرکٹ گزیٹیر سابق الٰہ آباد، جلد ہشتم، مطبوعہ ۱۸۸۴ء، صفحہ ۱۳۸۔ و۔ جدید ۱۹۱۱ء صفحہ ۲۶۳۔ و تاریخ جہانگیر از پروفیسر بینی پرشاد صفحہ ۱۴۳۔ و مفتاح التواریخ صفحہ ۲۳۵

کی بھی ممانعت ہے۔ مرنے والوں کی عظمتِ منزلت اور قبروں کی حرمت، ادب و احتیاط کا اقتضا یہی تھا یہ تجویز پرانی ہو، یا حال کی، اصلاح، ضرور قابلِ تحسین و اعتراف ہے۔

اس مقبرہ اور اس کے حوالی کا ایک مکمل نقشہ صاف اور اچھا، خفیف رنگین، امیر الدولہ گورنمنٹ لائبریری لکھنؤ میں موجود ہے، جس کے نیچے ذیل کی عبارت لکھی ہے۔ Mausoleum of the Ranee wife of the Emperor Jahangir near Allahabad. Drawn and engraved by Thos. Daniell

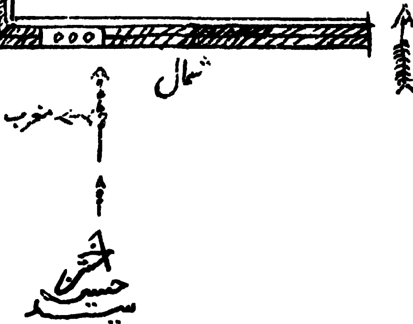
یہ نقشہ نامور چابکدست نقاش و مصور طامس دانیال کی صنّاعی و ہنرمندی کا شاہکار ہے اور ڈیڑھ صدی پہلے کی نقشہ کشی و طباعت کا کارنامہ۔ پیمانہ بڑا ہے۔ قرینہ ہے کہ نظری ہوگا لیکن اصل سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ اور اصول پیمایش کے مطابق مانا جا سکتا ہے۔ مقبرہ کے پچھم، پرانی دیوار اور کنواں[۱] مع تماشائیوں اور تفریح کرنے والوں کے انبوہ کے اپنی پوری شان و سامان کے ساتھ نظر آتا ہے۔ شہر و حوالی شہر کی مخلوق کا ایک جمِّ غفیر پانی لینے کے لئے ہر قسم کے برتن، پکھالیں، اور جانور ہمراہ لے کر اُمنڈ آیا ہے۔

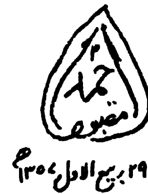
موجودہ حالت میں بھی مقبرہ کا منظر اور اس کا گرد و پیش نہایت دلپسند و دلکش ہے پچھم جانب وسیع میدان ہے۔ لان (LAWN) ہیں۔ پورب کو دو عمارتیں ہیں۔ پہلی اسکی بڑی بیٹی سلطان النساء نثار بیگم کا خوبصورت گنبد۔ دوسری اس کے لختِ جگر سلطان خسرو کا مرقد۔ شمال میں روشیں اور کیاریاں ہیں، اور خیابان و ریاحین۔ کچھ زیرِ زراعت زمین بھی ہے۔ سرسبز اور لہلہاتے ہوئے قطعات ہیں۔ دیوار بھی قایم ہے۔ کنواں بھی۔ مگر ایک بڑی حد تک بے مصرف۔ حوض بھی ہیں لیکن خشک۔ سرو کے پودے حال میں لگائے گئے ہیں۔ تاڑ کے دو پُرانے درخت بھی باقی ہیں۔ معلوم نہیں کس کی رعایتِ ذوق کارفرما ہوئی۔ کچھ اور سدابہار درخت بھی ہیں۔

---

[۱] الٰہ آباد کی ہینڈ بک، مرتبہ ماڈرن ریویو آفس میں بھی اس کا ذکر ہے، ص ۵۳۔

مقبرۂ شاہ بیگم کا سطحی خاکہ





ترتیب و نگہداشت کے لحاظ سے بلکہ ہر حیثیت سے کوئی چیز کسی طرح انگشت نمائی کے قابل نہیں، اور یوں تو ع کیسی ہی ٹھیک بات ہو حُسن کو اختلاف ہے۔

یہ تعمیر چار فٹ کی بلند کرسی پر کی گئی ہے، عمارت کے سب سے نیچے درجہ کا ہر پہلو اکتالیس گز ہے۔ اوپر چڑھنے کے لئے ایک ایک فٹ اونچی تین تین سیڑھیاں ہیں۔ یعنی آسایش و فراغت کے ساتھ پہنچ جانے کے لئے صدر دروازہ کے دونوں جانب ایک ایک چھوٹا سا زینہ موجود ہے۔ نیچے اوپر مقبرہ کی تینوں منزلیں جدا جدا نظر آتی ہیں، مگر یہ ایک ہی بنیاد یا دیوار پر قائم نہیں ہیں۔ بلکہ تینوں طبقے یا مرتبے یکے بعد دیگرے بنے ہوئے ہیں۔ مرتبہ اُس عہد کی دفتری و کتابی اصطلاح میں منزل کے معنی میں مستعمل[1] ہوتا تھا۔ یہ مرتبے مختلف انداز اور جدا جدا عرض و طول کے ہیں۔ پہلے سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا چھوٹا، لمبائی چوڑائی اور بلندی میں کم ہوتا چلا گیا ہے۔ یہاں تک کہ تیسری منزل کی وسعت بقدرِ مقدور اختصار کے ساتھ نیز اُس کی انتہائی بلندی، گنبد اور گنبد کے کلس پر پہنچکر ختم ہو جاتی ہے۔ فن ڈرائنگ کے ایک ماہر کا ارشاد ہے کہ مقبرہ کا فوٹو ایک مثلث نما چوکھٹے میں بڑی آسانی و خوبی سے آ سکتا ہے۔

باہر سے دیواریں تمام و کمال سرخی مائل سنگِ سفید کی ہیں۔ کہیں کہیں زرد کھٹو مرمریں پتھر بھی استعمال ہوا ہے۔ نیچے والے طبقہ (منزل) میں دیواروں کے باہر اٹھارہ فٹ چار انچ چوڑا چبوترہ ہے۔ اس چبوترہ میں تین سمت تو پانچ پانچ سنگین جالیاں چار فٹ نو انچ لمبی ایک فٹ چوڑی لگی ہیں۔ چوتھی طرف یعنی دکن کو، سامنے کے رخ صرف دو جالیاں ہیں۔ اور ان کے بیچ میں (صدر کا ایک) دروازہ۔ سب ملا کر سترہ جالیاں ہوئیں۔ یہ جالیاں اصولِ فنِ پیمایش و تعمیر کے مطابق بنائی گئی ہیں، اور روشنی کا اچھا کام دیتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس وضع و طرزِ خاص کو اکبر کے عقیدہ و ایجاد سے کچھ لگاؤ رہا ہو۔ شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد دہلوی ناقل ہیں کہ "ایک مریدِ خاص مر گیا تو اُس کی قبر میں جالی رکھی گئی کہ آفتاب کی روشنی پہنچتی رہے بلکہ چراغ کی لو بھی منہ کو لگائی کہ روشنی اور آگ پاک کرتی ہیں[2]"

شاہ بیگم کے مقبرے میں داخلے کی کھلی ہوئی محراب یا گھونگھٹ میں دروازہ ہے۔ اس کے داہنے

---

[1] جہانگیر نامہ معتمد خاں۔ [2] قصصِ ہند، حصہ دوم، صفحہ ۹۸۔

پہلو یا دیوار پر ایک پتھر پر ہندی میں "گنیش" لکھا ہوا ہے۔ بے احتیاطی یا عدمِ التفات سے اس پر حسبِ معمول سفیدی سال بہ سال پھیری جاتی ہے۔ تاہم صاف اور نمایاں پڑھا جا سکتا ہے۔ کیا کسی نے تعمیر کے بعد اس کو یوں ہی کھدوا دیا تھا؟ غالباً نہیں۔ کیونکہ کسی قدر گہرا کھدا ہے۔ کیا تعمیر کے وقت یہ نام برکت کے لئے کھدوایا گیا تھا؟ یقیناً نہیں۔ اگر حکماً اور اطلاع سے کندہ ہوتا تو حروف اس سے زیادہ خوبصورت اور باقاعدہ ہوتے۔

داخلہ کا دروازہ چبوترہ سے گزر کر یعنی چبوترہ کو کاٹتا ہوا بارہ فٹ نو انچ کے فاصلہ پر ملتا ہے۔ عمارت کے علو و رفعت اور اپنے اطراف و جوانب کی بلندی و شان کے لحاظ سے آج کل تنگ اور نیچا سمجھا جاتا ہے۔ مگر کیا کیا جائے کہ تین چار سو برس پیشتر یہی صورت پسند و رائج تھی۔ ہندوانہ تعمیرات میں یہ بات عام پائی جاتی ہے۔ موجودہ چوکھٹ اور کواڑوں کی حالت اُن کی دیرینہ سالی و کہنگی کم از کم کثرتِ استعمال پر دلالت کرتی ہے۔ تختے کمزور، نسبتہً پتلے، قدرے ناہموار اور ناپیوست سے ہو رہے ہیں۔ بالائے دروازہ محراب کی بلندی اُس کی چوڑائی کی مناسبت سے نہیں، بلکہ کچھ زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس محراب کے دونوں طرف یعنی آمنے سامنے دوسری منزل کو جانے کے لئے غیر مسقف (کھلے ہوئے) زینوں کی دوہری قطار ہے۔



دیواریں پورا بوجھ اُٹھا لینے کے قابل خوب مضبوط، موٹی موٹی اینٹ اور چونے کی بنائی گئی ہیں۔ تعمیر میں یہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ منزلِ زیریں کے پہلے حصّہ کی کُھلی چھت دوسری منزل کے لئے چبوترہ کا کام دیتی ہے۔ اور دوسری منزل کی چھت تیسری یعنی سب سے اوپر والی منزل کے ساتھ کارآمد ہے۔ اندر کی تیسری دیوار پر دو منزلوں کا بار تھا اس لئے وہ زیادہ مستحکم اور عریض ہے۔ پہلی دیوار صرف تین فٹ سات انچ ہے۔ دوسری چار فٹ ساڑھے چار انچ۔ اور تیسری پانچ فٹ نو انچ۔ دیواروں کا موٹاپا بقدرِ ضرورت بتدریج بڑھتا گیا ہے۔ اسی لئے بمقابلہ پہلے حصّے کی دیوار کے دوسرے اور تیسرے حصّے کی دیواریں زیادہ چوڑی رکھی گئی ہیں چھت یہاں دس فٹ سات انچ بلند رہ جاتی ہے۔ اس (دوسری) منزل کی دیواروں میں ہر چہار طرف، ہر ضلع کے وسط میں ایک ایک کُھلا ہوا دروازہ ہے۔ ان دروازوں میں چوکھٹ بازو نہیں ہے۔ ان کی بغلی دیواروں میں نیچے اوپر دو دو ٹکڑے لوہے کے لگے ہیں، جن کی شکل یہ ہے [قیاس ہوتا ہے کہ ان قلابوں پر کبھی کواڑ رہے ہوں گے۔ یا ان پائیزوں پر کواڑ لگانے کا ارادہ رہا ہوگا۔ مگر تکمیل کی نوبت نہیں پہنچی۔ ہر دروازے کے دونوں طرف محرابوں کے دو دو نشان بھی ہیں۔ یعنی ہر دیوار میں چار چار دروازوں کی بلندی طے کرنے کے بعد دیواروں پر ہر آٹھ محرابوں کے اوپر آرائش و زیبایش کے لئے پتھر میں کُھدے ہوئے معمولی نقش و نگار ہیں۔ ایسے ہر پھول کے گرد، ہر نقش کے ساتھ محرابوں سے اوپر خوشنما سنگی حاشیہ نظر افروز ہے۔ نقشی کارنِس کے نیچے پتھر میں جال بنے ہیں۔ یہ کل جگہ خالی اور غیر مکمل سی نظر آتی ہے۔ حتیٰ کہ دروازوں کے خشتی پہلو چونے کے پلاسٹر سے بھی محروم ہیں۔ اور پلاسٹر پر قلعی تو کسی جگہ نہیں پائی جاتی۔ صورتِ حال شاہد ہے کہ شروع ہی سے اس طرف توجہ نہیں ہوئی۔ یا یہ کہ اس منزل کے نیچے شاہزادی دفن تھی اور اس کے اوپر نقلی تربت ہے، اس لئے اس درمیانی طبقہ کو سادہ چھوڑ دیا۔ صرف بالا و پست درجوں کا احترام مدنظر رکھا گیا۔ حتی الوسع ہر نوع کی آرائش و تکلفاتِ تعمیر سے درگزر کیا گیا ہے۔ معمولی محرابیں اور جدولیں کافی سمجھی گئی ہیں۔ دروازے بھی مستقل دروازوں کی حیثیت و حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ دیواروں میں مستطیل شگاف نکاس کے لئے بنے ہوئے ہیں۔ یہ منزل

مسٹر بیل نے مفتاح التواریخ[۵۱] میں "آئینہ مہر" کی جگہ "آئینہ خود" اور مسٹر بیوریج نے اپنے مقالہ[۵۲] میں "آئینہ مہر" لکھا ہے۔ مسٹر ڈیوہرسٹ نے اپنی تحریر[۵۳] میں تصحیح فرمادی ہے۔ بیل صاحب نے پہلی رباعی میں "عزت" کی جگہ "غیرت" لکھا تھا شاید چھاپے کی غلطی ہو۔

باز آمد ان پتھروں پر نہایت خوبصورت نستعلیق حروف کندہ ہیں۔ ہر مصرع کے گرد نفیس بیلیں اور گلکاریاں ہیں۔ یہ حروف اس قدر باقاعدہ، سڈول، دبیز اور باہر کو ابھرے ہوئے ہیں کہ آج کل کے موٹے موٹے انگریزی حروف جو پیتل وغیرہ کی چادروں پر ڈھالے جاتے ہیں، ان کے آگے ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔ مرمریں ظرف اور نستعلیق حرف، ع

عروسِ جمیل و لباسِ حریر

اوپر یعنی تعویذِ قبر مسطح ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان اطراف میں تختی اور قلمدان کے امتیازی نشانات[۵۴] بنا دینے کا رواج اُسوقت تک نہیں ہوا تھا البتہ بیلوں، پھولوں اور گلکاریوں سے مالا مال ہے۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) عالیشان مقبرہ آگرہ میں بنوایا تھا۔ ان کے خاندان میں خوش نویسی پشتہا پشت تک قائم رہی (حیاتِ جلیل، حصہ دوم، صفحات ۲۰۲ و ۲۰۳۔ نوٹ) خسرو باغ کی یہ رباعیاں تو نستعلیق میں لکھی ہیں، لیکن امیر الشعرا رضا قلی خانِ "ہدایت" فرماتے ہیں کہ میر عبداللہ نسخ کے بڑے خوشنویس تھے۔ باپ کا نام میر سید مظفر تھا۔ سلسلۂ نسب برہان الدین خلیل اللہ بن شاہ نور الدین نعمت اللہ ولی ماہانی تک پہنچتا ہے۔ اُن کے آبا ایران سے ہندوستان چلے آئے تھے۔ طبقۂ شعرا میں بھی ممتاز درجہ حاصل تھا۔ مگر اپنے تخلص "وصفی" (کرمانی) کے لحاظ سے (بہ سلسلۂ حروف تہجی) صفِ آخر میں جگہ پاتے ہیں۔ (مجمع الفصحا، مطبوعۂ ایران، جلد اول، صفحہ ۱۵۴) متعدد مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔

[۵۱] ملخصاً صفحہ ۳۳۵۔ [۵۲] جورنل رائیل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۷ء، صفحہ ۶۰۳۔

[۵۳] جورنل مذکور، بابتہ جولائی ۱۹۰۹ء، صفحہ ۷۴۶۔ J.R.A.S., 1909.

[۵۴] تختی ایک چارگوشہ تختۂ چوبیں مع دستہ کے ہوتا ہے جس پر ہمارے ملک میں لکھنے لکھانے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ مگر اب یورپ یا اہل یورپ کی بدولت اُسکی جگہ سلیٹ لے رہی ہے۔ قلمدان کو سب جانتے ہیں، یعنی وہ چیز جس میں قلم وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ مسلمان عورت کی قبر پر تختی کی اور مرد کی قبر پر قلمدان کی شکل بنائی جاتی ہے (تاریخِ آگرہ یعنی مرقع اکبرآباد از مولوی سعید احمد صفحہ ۸۰۔ و۔ آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۱۴۵۔

پتھر کے پھولوں پر کوئی روغن سُرخی مائل بھرا ہوا تھا جو رفتہ رفتہ ماند ہوتا جاتا ہے۔ سنگِ بالیں ایک بلند بالا تختہ مرمر کا، لمبا چوڑا اور خوب موٹا ہے۔ خوبصورت، دلفریب، پشت کی جانب چھ پہل کا تراشا گیا ہے۔ اور نقش و نگار سے بھی مکلف ہے اس پر نہایت عمدہ کام ہے۔ پائینِ قبر کا تختہ بھی ایک ڈال سنگِ مرمر کا، سرہانے والے پتھر کے بالکل مشابہ اور ہمشکل ہے۔ اس پر بھی ویسی ہی نفیس بیلیں اور باریک کام ہے۔ البتہ کچھ لکھا نہیں ہے۔ یہ سنگِ بالیں کا ہر لحاظ سے پورا جواب ہے، اور خود لاجواب یہاں مرمریں دِلہوں اور تختوں پر مختلف اقسام خصوصاً کنار کی بیلیں، خوبصورت دوہری تہری اُبھری ہوئی نگہ افروز ہیں۔ کہیں کہیں کچھ پتھر یا اُس کا کوئی ریزہ اُکھڑ بھی گیا ہے۔ مگر اُن کے نشانات وداغ زیادہ نمایاں نہیں، کم ہیں اور خفیف۔ روغن جو یہاں بھرا ہوا تھا اب بھی جاذبِ نگاہ ہے۔ مگر اُس کی آب وتاب ویسی باقی نہیں رہی۔ ماند پڑ گیا ہے۔ قبۂ گنبد مختصر و ہتدوانہ ہے، چینی وضع سے بہت ملتا جُلتا، یا بالکل بودھوں کا سکھر۔ جہاں ایوان کی دیواروں کی بلندی ختم ہوجاتی ہے، یعنی عمارت کے چوکور حصّہ سے پتھر کے تختے بڑھتے گھٹتے ہوئے لگا کر، بتدریج اُٹھا اٹھا کر، چاروں پہلوؤں کو اوپر لے جا کر ملا دیا ہے۔ حقیقتہً یہ کوئی بُرج نما (مدور) یا گنبد نہیں ہے بلکہ اپنی وضع کی ایک خاص چیز ہے۔ اس پر کلس بھی اسی شان کا زرنگار وزر راندود مناسب حال چڑھایا گیا تھا، اب بے رونق ہوگیا ہے۔ اس طبقہ کا یہ قبہ، اس کا فرش، اس کے مرمریں تختے اور چٹانیں، اس کے حسین ستون، ان سب پر نازک نقاشیاں، غرض کہ اس کا ہر جزو وکل قابلِ ناز اور سلاطینِ تیموری کی عظمتِ ماضیہ اور صنعتِ کاملہ کا آئینہ دار ہے۔

حکومتوں کے انقلاب اور یار واغیار کی دست درازی ودست بُرد نے اس کے ساتھ جو کچھ ظلم کیا ہوگا، کس کی زبان بتا سکتی ہے۔ لیکن امن وامان اور تہذیب وروشنی کے زمانہ میں یعنی سنہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد عوام نے جو قدردانی کی، اور سیاحوں اور زائرین نے جس قدر ضرر پہنچایا، وہ بھی ناقابلِ تلافی ہے۔ فرش کے چکنے ہوئے پتھروں پر بہت سے حضرات نے انگریزی، فارسی، ہندی اور عربی میں اپنے نامِ نامی اور دستخطِ گرامی نقش فرما دیئے ہیں۔ کسی

ہی مقبرہ میں سو رہی ہے۔ اس سے بھی روشن اور شہرت یافتہ مثال ممتاز محل[51] (روضۂ تاج) کی ہے نیز شاہجہاں کی ملکہ قندھاری بیگم کے مدفن کی۔ اس گئی گزری حالت میں بھی دہلی و آگرہ میں ایسی زیرِ زمیں قبریں بہ تعداد کثیر[52] موجود ہیں۔

شاہ بیگم کا جسدِ خاکی کسی سفید و تابندہ مرمر کے تابوت کے اندر دفن نہیں ہے۔ بلکہ اس کی قبر اینٹ چونے کی سادہ و بے تکلف تعمیر ہے۔ قبر کے چبوترے کا طول دس فٹ، عرض سات فٹ دو انچ ہے قبر کا تابوت والا یعنی اونچا حصہ پانچ فٹ پانچ انچ لمبا، دو فٹ پانچ انچ چوڑا ہے قبر کے چبوترہ کی بلندی ایک فٹ ایک انچ ہے۔ اور تعویذ کی ایک فٹ چار انچ؛ دونوں کی ملاکر دو فٹ پانچ انچ ہوئی۔ اسکی چھت کسی قدر پست مگر محدب ہے، چاروں دیواروں کے پہلوؤں کو کچھ کچھ اٹھاکر اوپر ملاکر پاٹ دیا ہے۔ آپ چاہیں تو اس کو ایک قسم کا نیم گنبد کہہ سکتے ہیں۔ شاید ایک تہ خانہ یعنی زمین دوز حصۂ عمارت کے لئے یہی مناسب و کافی تھا۔ اس پورے طبقۂ زیریں میں معمولی پتھر کے چوکوں کا ہموار صاف ستھرا فرش ہے۔ کثرتِ استعمال و پامالی سے چکنا بھی ہوگیا ہے۔ ایک وسیع مسقف رقبہ میں ایسا فرش نہایت اچھا، پیروں کے لئے ٹھنڈا اور آرام دِہ اور آنکھوں کے لئے راحت بخش اور زائر کے واسطے سکون آفریں و فرحت افزا ثابت ہوتا ہے۔ شاید یہ درجہ کبھی چاروں طرف سے بند رہا ہوگا۔ جیسا کہ مسٹر بیل نے لکھا ہے اور منافذ اور جھنجھریوں سے روشنی کا بقدرِ قلیل انتظام ہوگا۔ مفتاح التواریخ[53] کے الفاظ یہ ہیں "اصل تربتِ او اندرون روضہ ہست و آں مسدود است از ہر چہار طرف"۔ بظاہر اس کی تعبیر دشوار ہے۔ اور اگر آمدورفت کے اعتبار سے بند ہونا مراد ہو تو چاروں طرف سے مسدود ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ ایک دکھن رُخ تو دروازہ ضرور کھلا ہوا موجود ہے۔ بہرکیف اب کوئی بگڑی ہی

---

[51] تاریخ آگرہ، صفحات ۵۰ و ۱۴۳۔

[52] تاریخ آگرہ صفحات ۵۸، ۹۰، ۹۲، ۹۴، ۹۳، ۱۶۴، ۱۶۸ و ۱۷۳۔

[53] صفحہ ۳۲۵۔

ہوئی کیفیت باقی نہیں۔ غالباً کُل اصلی حالت میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہاں کبھی نقش و نگار بازنگینیاں رہی ہوں، مگر اس وقت سفیدی اور چونے کی تہوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ چھت کی استرکاری میں البتہ کچھ جدولیں، اور دائرہ بناتے ہوئے جال در جال پیدا کر دیئے گئے ہیں۔ اور وہ خوشنما ہیں اور نظر فریب۔

بیگم کی گود جس طرح جیتے جی بھری پُری رہی، اُسی طرح آج بھی ہے۔ اُس کی آغوش یا دامانِ عاطفت میں کئی بچے کھیل رہے اور قبر کے پہلوؤں اور بغلی حصّوں کو آباد کئے ہوئے ہیں۔ اس کی قبر کے پاس داہنے کو دو چھوٹی چھوٹی قبریں ہیں۔ تختی اور قلمدان کی معمولی پہچان کے بھروسہ پہ کہتا ہوں کہ پہلی شاہزادی کی ہے، دوسری شاہزادہ کی، جو پہلی سے کسی قدر چھوٹی ہے۔ اس کے بعد اینٹوں کی جالی سے ادھر کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ بائیں طرف بھی دو قبریں ہیں ۔ ایک شاہزادہ کی، دوسری شاہزادی کی۔ اس کمرہ سے باہر یعنی دوسرے درجہ میں بھی اسی طرح پہ بائیں طرف دو قبریں چھوٹی چھوٹی برابر کو ہیں۔ ایک شاہزادی کی، دوسری شاہزادہ کی۔ اور تین قبریں جو کسی قدر ہٹ کر ہیں ان میں پہلی شاہزادی کی معلوم ہوتی ہے، دوسری شاہزادہ کی۔ تیسری پھر شاہزادی کی ہے۔ تیسرے درجہ میں ایک معمولی چبوترہ اینٹوں کا نظر آتا ہے۔ جو تقریباً ایک گز مربع اور ایک بالشت اونچا ہوگا۔

"بخلد شد بیگم" سے ۱۰۱۲ عدد نکلتے ہیں، جو سنگ بالیں پر مرقوم ہے۔ مسٹر بیل اپنی اورنیٹل بیاگرفی کل ڈکشنری[۱] میں ۱۰۱۲ = ۱۶۰۳ء لکھتے ہیں۔ تزک[۲] میں سال وفات ۱۰۱۳ھ چھپا ہے۔ ممکن ہے کہ ٹائپ کی غلطی ہو۔ مسٹر بیوریج کی رائے[۳] ہے کہ تزک کی مندرجہ تاریخ یعنی ۲۶ ماہ گزشتہ ۱۰۱۳ھ ۶ مئی ۱۶۰۵ء کے مطابق ہوتی ہے۔ غالباً خود جہانگیر یا اُس کے نقل کنندہ و کاتب سے ایک سال بڑھ گیا ہے۔ صحیح تاریخ ۲۶ ذیحجہ ۱۰۱۲ھ یا ۱۶ مئی ۱۶۰۴ء ہے۔ اکبرنامہ سے بھی یہی سال پایا جاتا ہے۔

---

[۱] صفحہ ۱۵۲۔ [۲] صفحہ ۲۶۔ [۳] جورنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۷ء، صفحہ ۲۰۳۔

ڈاکٹر فوہرر شاہ بیگم کا سال وفات ۱۰۱۴ لکھتے ہیں[۵۱]۔ وہ محکمۂ آثار قدیمہ کے سب سے بڑے افسر تھے۔ اُن کی کتاب یادگار ہائے قدیم پر سرکاری استناد، سرکاری حکم اور سرکاری خرچ سے سرکاری مطبع میں چھپی۔ یہ مقبرہ اور اس کا کتبہ اُن کی نگرانی اور سایۂ عاطفت میں تھا۔ اُن سے ایسی غلطی کا سرزد ہونا تعجب سے خالی نہیں۔

کرنیل نیویل ڈسٹرکٹ گزیٹیر جلد[۵۲] میں ارقام فرماتے ہیں، کہ کتبہ سے سالِ وفات ۱۶۲۱ معلوم ہوتا ہے۔ گزیٹیروں کے فاضل مولف بھی انسان ہیں۔ باوجود وسعت نظر و تحقیق اور قابل معاونین کی ایک جماعت کے ان کا قلم کبھی کبھی فاش غلط نگاریاں کرجاتا ہے۔ ان کا یہ لکھنا کہ خسرو کی ماں کا سال وفات ۱۶۲۱ معلوم ہوتا ہے، ایک فاحش غلطی ہے۔ "معلوم ہوتا ہے" کے معمولی فلسفیانہ و ادیبانہ عذر کے لکھ دینے سے اُن کی ذمہ داری و جوابدہی اُن کو سبکدوش نہیں کرتی۔ اس شاہزادی نے ۲۶ ذوالحجہ ۱۰۱۳ھ کو وفات پائی تھی جو تمام تقادیم موجودہ و رائجہ کے حساب سے ۶ مئی ۱۶۰۴ء کے مطابق ہے۔ قطعۂ تاریخ اور اس کی نقل آپ کے سامنے موجود تھی۔ ۱۰۱۳ھ یکم جون ۱۶۰۳ء سے شروع ہوکر ۱۹ مئی ۱۶۰۴ء کو ختم ہوا۔ ۱۶۲۱ء کا پہلا دن ۱۵ صفر ۱۰۳۰ھ کے مطابق تھا۔ پندرہ برس کا تفاوت! قیاس چاہتا ہے کہ غلطی سے ماں کے سالِ وفات کے بجائے بیٹے کا لکھ گیا ہو۔ اس لئے کہ سلطان خسرو آخر جنوری یا شروع فروری ۱۶۲۲ء میں فوت ہوا تھا۔ اور ۱۰۳۱ھ کا آغاز ۲ نومبر ۱۶۲۱ء کو اور اختتام ۲۵ اکتوبر ۱۶۲۲ء کو ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک تقویم سے دوسری میں تحویل کرتے وقت دنوں کا خفیف فرق ناگزیر یا ناقابل لحاظ سمجھا جاتا تھا، لیکن ہفتوں، مہینوں اور سالوں کا نہیں!

صفحاتِ تاریخ بتاتے ہیں کہ مغلوں کے محلات میں آنے والی ہندوستانی شاہزادیوں میں مان بائی (شاہ بیگم) سب سے پہلی رانی تھی جس نے حرم سرائے سلطانی میں جان دی اور اپنے

---

[۵۱] آرکیالوجی کل سروے آف انڈیا، سلسلۂ جدید، جلد دوم، صنادید قدیمہ اور کتبے، صفحہ ۱۳۰۔
[۵۲] صفحہ ۱۶۹۔ گزیٹیر سابق، صفحہ ۲۰۳۔

شوہر پر نثار و تصدق ہوگئی۔ تیمور کے پوتے نے بھی نیاز مندی و وفا کا حق ادا کیا اور اس کے جسدِ خاکی کی ابدی آسایش کے لئے دامنِ فردوس میں ایک قابلِ رشک نشیمن مہیا کر دیا۔ اُس کا مقبرہ حسن اہتمام و لطافت اور تعمیری و نسوانی رعایتوں کے ساتھ اس سر سبز و سدا بہار چمن کی آغوش میں تیار کرایا گیا، اُس کے شایانِ شان تھا۔ مغلوں[۵] کے بہت سے شاندار مقبرے اور مدفن میں نے آگرہ اور دہلی میں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر دیکھے ہیں، لیکن شاہ بیگم کے مقبرے کو بے تکلف و تامل اور بلا خوفِ تردید، اُن کے سلیقۂ تعمیر کا حسین ترین نمونہ اور خوشنمائی و نزاکت کا مجسمہ کہہ سکتا ہوں۔ اس کی سادگی و نظر فریبی مُسلّم ہے، ساتھ ہی جدتِ وضع، اندازِ تعمیر اور مجموعی اختصار نے جو خوبی و رعنائی پیدا کر دی ہے، اُس کی دادِ تحسین مجھ نا شناس کی آنکھیں کیا دے سکتی ہیں۔ میں نے ایک بالغ نظر[۶] کو اس وجہ خاص سے اس کو تاج پر بھی فوقیت و ترجیح دیتے دیکھا ہے۔ یہ رائے تاج محل کی اہانت و گستاخی پر محمول نہ کی جائے۔ وسیع النظر اور جہاندیدہ سیاح بعض عمارات کو ممتاز محل کے روضہ سے بھی ممتاز بتاتے آئے ہیں۔ حال ہی میں بمبئی یونیورسٹی کے پروفیسر ہنری ہیرس ہسپانوی نے انجمن ادبی کابل کو جو قابلِ قدر مقالہ بھیجا تھا اُس میں فرمایا تھا کہ "میرے خیال میں "تاج محل" اپنی دلکشی اور حُسن کے اعتبار سے بے نظیر ضرور ہے۔ لیکن شیر شاہ کا مقبرہ اپنی عظمت اور اپنی شانِ نمود کے لحاظ سے تاج محل سے بھی زیادہ بلند درجہ رکھتا ہے" [شیر شاہ سوری کا مقبرہ سہسرام میں ایک مصنوعی تالاب کے وسط میں بنایا گیا ہے۔ اس کی عمارت افغانی فطرت کا آئینہ ہے۔ چونکہ شیر شاہ افغان تھا۔ اس لئے اُس کا یہ عظیم الشان مقبرہ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ یہ قبر ہندو کُش اور افغانی سلسلۂ کوہ

---

[۵] صحیح تو یہ ہے کہ بابر ترک تھا۔ مغل نہیں، ماں کی نسل کو چھوڑ کر ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے لئے مغل کا لفظ اس لئے استعمال ہونے لگا کہ ہندوؤں نے مغل کا نام تمام مسلمانانِ شمال کو دے رکھا تھا تاکہ افغانوں اور ترکوں سے امتیاز ہو سکے۔ یہ نام ماخوذ ہے مغل سے جو التایا ایلنجی خان Alanza or Alinji ترکوں کے سردار کا بیٹا تھا۔ ابتداً چین کے مغربی حدود کی اقوام میں یہ ترکوں کا قبیلہ تھا۔ ملاحظہ ہو گبن کی رومن امپائیر جلد ششم صفحہ ۱۳۸ - اور ہاورتھ کے "منگولس" حصہ اول صفحہ ۲۹ - و سیاحت نامہ پیٹر ڈیلاویلے ترجمہ مطبوعہ ایڈورڈ گرے صفحہ ۴۸، نوٹ ۲۔

[۶] سر سلوین فری منٹل Sir Selwyn Hoare Framantle. سے مراد ہے جو الہ آباد کی ہر چیز پر شیدا تھے۔

کی بلندیوں کو اپنے اندر رکھ لینا چاہتی ہے]"۔ لہ

ایک عورت کے روضہ کی تعمیر میں خصوصیت یا صفت اس کی نسوانیت کو ہونا چاہیئے۔ اگر اکبری دور کی ٹھوس تعمیرات کا سا مردانہ پن، استواری و استحکام کی نمایش اور اہتمام اس میں بھی کیا جاتا تو لطافت و نزاکت، دلکشی و دلربائی خواہ مخواہ مفقود یا نظر انداز ہو جاتی۔ یہ نسوانیت یہاں ارادۃً پیدا کی گئی ہے، اور بدرجہ اتم زیب دے رہی ہے یوں کہئے کہ روضہ کی عمارت محض روضہ نہیں بلکہ شاہ بیگم اپنی بہارِ حسن و جمال کے ساتھ اس رشکِ فردوس مقام پر جلوہ افروز ہے۔ پھر یہ اس کی انتہائی خوبی ہے کہ صبحِ درخشاں ہو یا نیمروزِ تاباں، شام کا دھندلکا ہو یا رات کی گھنگھور سیاہی، یہاں رانی اپنی اُٹھتی عمر یا ڈھلتی ہوئی جوانی میں نہیں، بلکہ چڑھتے ہوئے شباب میں رونق بخش نظر آتی ہے۔

میں نے جب اپنی جوانی اور نئی عمر میں اس کو پہلے پہل دیکھا تھا تو اپنے نزدیک فیصلہ کر لیا تھا کہ جہانگیر نے یہ خوبصورت اور نازک یادگار بنا کر بیگم کی مہر و وفا کا صلہ یا حقیقتۃً اپنا خراجِ عشق ادا کیا ہے۔ اولوالعزم شاہ جہاں نے بلند حوصلگی کے ساتھ ممتاز محل کا روضہ بنوانے میں محض باپ کی تقلید یا پیروی کی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ اپنے سپوت ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

نگارندۂ سطور، عبرت و وفا کا سبق حاصل کرنے شاہ بیگم کے مرقد پر بارہا گیا، اور زبانِ حال سے کسی کی غفلت و بے خبری کا شکوہ سنج پایا ہے۔

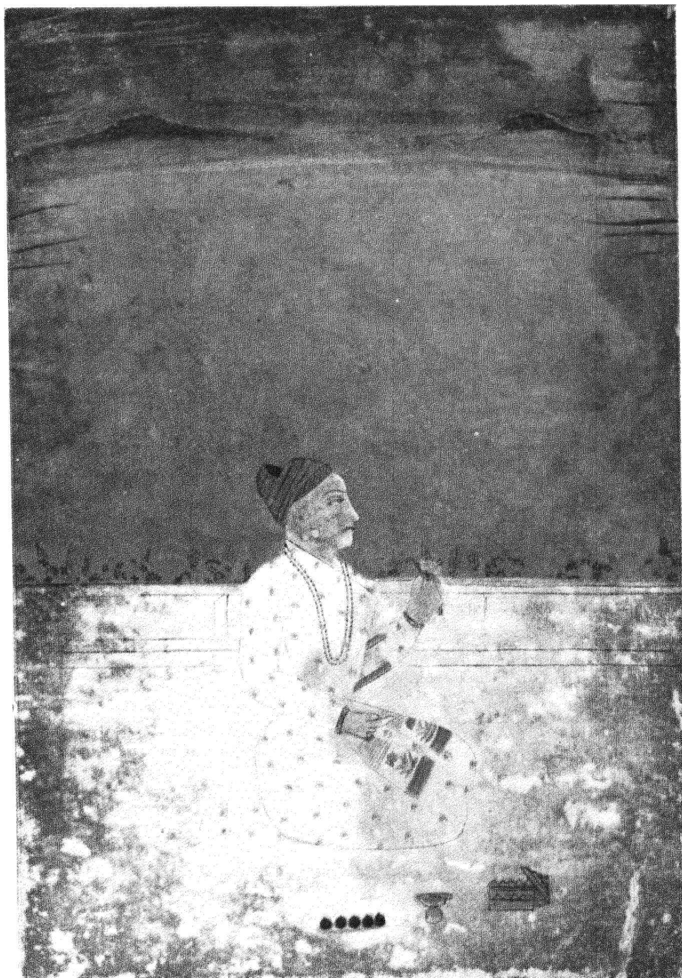
بر مزارِ ما غریباں نے چراغے، نے گلے نے پرِ پروانہ سوزد، نے صدائے بلبلے

لہ رسالہ شاہکار، لاہور، جنوری ۱۹۳۵ء، صفحات ۴۲، ۴۳۔

(۵)

سلطان خسرو

(فرزند اکبر شاہنشاہ جہانگیر)



عمل ابوالحسن اصفہانی نادرالزمانی جہانگیر شاہی

مرحوم شیخ محمد حسین ادیب' رئیس قنوج کی نایاب چیزوں میں دستیاب ہوئی

مقبول صمدنی

خسرو اور مقبرۂ خسرو

مرقدِ خسرو الٰہ آباد اور نواحی الٰہ آباد بلکہ صوبۂ الٰہ آباد کی سب سے بڑی زیارت گاہ ہے، جس کے سامنے لاکھوں بندگانِ خدا سرِ ادب خم کرتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ دعویٰ تامل کے ساتھ مانا جائے گا۔ کیونکہ اس صوبہ میں بہت سے مشہور مزارات و معابد، آثارِ عتیقہ، پاک تیرتھیں اور مقدس مقامات موجود ہیں۔ مذہبی تعلق و تقدس کے لحاظ سے خود پریاگ کا کہن سال پتال پوری مندر اور اُس کا اکشے وٹ درخت یہاں کی بڑی پرستش گاہ سمجھے جاتے ہیں۔ لاکھوں نہیں کروڑوں عقیدت مندوں اور عبادت گزاروں کا مرجع ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ روضۂ خسرو کا جذبۂ احترام کسی خاص جماعت یا قوم و ملت کے دلوں کے ساتھ وابستہ و محدود نہیں۔ شاید اُس کا طواف، کم از کم نظارہ مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم کرتے ہیں۔ یعنی وہ ریاضت کش جاتری اور تارک الدنیا سادھو جو دشوار گزار پیچیدہ راستے طے کرکے دور دراز مقامات اور پہاڑوں سے اپنے اپنے طریقوں پر پرستش اور یادِ الٰہی کے لئے یہاں آتے ہیں، جو تربینی کے سنگم کے اشنان کو گناہوں سے برائت کا وسیلہ و ذریعہ مانتے اور سعادت و برکت ابدی کی دستاویز سمجھتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کا وہ مغرور و متکبر سیّاح جو اپنی ذاتی نخوت، قومی تفاخر اور ملکی خصوصیات اور آن بان کے سامنے پُرانی دنیا بلکہ سارے جہان کو ہیچ اور حقیر سمجھتا ہے، یہاں پہنچکر وطنی سربلندی و رفعت کا خیال دور کر دیتا اور بے اختیار سرِ اطاعت جھکا دیتا ہے۔ وہ ہراس و ہیبت پیدا کر دینے والی ہیبت، جس نے اس بیسویں صدی میں دارا و سکندر کے تاج کو بھی ناچیز و بے حقیقت ثابت کر رکھا ہے، بادۂ پندار سے سرمست و سرشار انسان کے پرغرور سر سے خود بخود ہٹ جاتی اور تعظیم و ادب کا خراج پیش کرتی ہے۔ ادھر ایک متواضع و کریم النفس ایشیائی نژاد دور ہی سے دیکھ کر برہنہ پا ہو جاتا ہے۔ اس خاک کے پتلے منکسر مزاج، صافی مشرب کے آئینِ عجز و نیاز کی پہلی دفعہ اور جادۂ ارادت و عبرت کا پہلا قدم یہی ہے۔ عرفی کی روح جو جیتے جی جہانگیر کے لئے مضطرب اور اُس کی پرستار رہی تھی[۱]، لاہور ہوتی ہوئی تاکستانِ شیراز سے آجاتی ہے۔ ان دونوں نو واردوں کو عجز و فروتنی کا یکساں مظاہرہ کرتے ہوئے پاتی ہے۔ تحیّر و استعجاب کا تاثر دل سے نکل کر زبانِ حال پر آجاتا ہے۔ وہ اس مٹتے ہوئے عظمت و جلال کو سراہتی ہے، جس نے

---

[۱] اکبر نامۂ شیخ ابوالفضل، مطبوعۂ نول کشور، جلد اول تقریظ شارح، صفحہ ۲۔ ایضاً دفتر سوم، صفحہ ۶۲۴

بیگانہ ز تاج کرد تارک ——— آوارہ ز کفش کرد پا را

اس بڑے اور آباد شہر (الٰہ آباد) کی آبادی کا بیشتر حصہ بلا کسی امتیاز فرقہ و جماعت کے ہر روز، ہر ہفتہ، ورنہ کم سے کم سال میں دو تین مرتبہ تفریحاً یا کھیل تماشوں کے سلسلہ ہی سے خسرو باغ ضرور پہنچ جاتا ہے اور پھر وہاں پہنچکر ہر آنکھ والے کی نظریں اور عبرت و حسرت بھری نگاہیں بے اختیار مقبرہ تک پہنچ جاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ اس دَور آزادی و آزاد خیالی اور روشنی و روشن دماغی میں بھی "یادگارِ خسرو" کی عظمت و ہیبت برقرار بلکہ روز افزوں ہے اور سروشِ غیبی کی یہ صدا قائم ہے۔

چشم خونبار کو صرفِ چمن آرائی کر ——— شاید آجائے پئے سیرِ گلستاں کوئی

آغازِ سلسلہ یا واقعات کو سمجھ لینے کیلئے اتنا یاد دلا دینا ضروری ہے کہ خسرو لاہور میں جہانگیر کی پہلی بیگم، راجہ بھگوان داس کی بیٹی، رانی مان بائی مخاطب بہ شاہ بیگم کے بطن سے ۲۴ امرداد ماہ الٰہی (رمضان ۹۹۵ھ[۵۱]) سن بتیس جلوس اکبرشاہی میں پیدا ہوا تھا۔ مسٹر بیوریج پُرانے حساب سے اس کی انگریزی تاریخ ۴ اگست ۱۵۸۷ء لکھتے ہیں[۵۲] میرے شمار سے دو دن بعد یعنی ۶ اگست ہوتی ہے۔ باپ کا بڑا بیٹا اور دادا کا پہلا پوتا تھا۔ اس لئے بڑی خوشیاں منائی گئی تھیں، جن کا تذکرہ "تذکرۂ خسرو" میں کر چکا ہوں۔ اور بقدرِ ضرورت اس کتاب میں بھی شاہ بیگم کے سلسلہ میں آچکا ہے۔

اکبر و جہانگیر کے زمانے کی تاریخوں میں خسرو کی زندگی کے متعلق بہت کم مذکور ہے البتہ تلاش سے اکبرنامہ میں کچھ باتیں مل جاتی ہیں۔

ولادت۔ دو جگہ پر (۱) سال جلوس ۳۱۔ سنہ ۹۹۴ھ (۱) پنجاب میں چناب کے قریب شبِ شانزدہم درخانۂ شاہزادہ سلیم از دخترِ راجہ بھگونت داس فرزندے سعادت پیوند پدید آمد۔

---

۵۱ قاموس المشاہیر نظامی بدایونی صفحہ ۲۲۴۔ اور ینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری، صفحہ ۱۵۲۔

۵۲ جورنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی میں مسٹر بیوریج کا مضمون بابتہ جولائی ۱۹۰۷، صفحہ ۵۹۷۔

وگوناگوں نشاط رو آوردہ - طالع بروشِ یونانیان بردہ درجہ قوس و بہ آئینِ ہندیان یک درجہ و چہل و یک دقیقہ شہریار دیدہ در بہ سلطان خسرو خود نامور گردانید و بر خلاف زایناں انجمن سپاس گزاری برآراستہ شد - در منزلِ مریم مکانی بزرگ جشنے پیراستہ آمد و سباق و بخشش را روز بازار شد[۵۱]

[ترجمہ] سولھویں کی رات شاہزادہ سلیم کے گھر میں راجہ بھگونت داس کی بیٹی سے لڑکا پیدا ہوا۔ طرح طرح سے خوشیاں کی گئیں۔ زایچہ دیکھا گیا۔ بادشاہ نے خود سلطان خسرو نام رکھا۔ شکرانہ کی محفل آراستہ ہوئی۔ مریم مکانی (حمیدہ بانو بیگم۔ اکبر کی ماں) کے محل میں بڑا جشن منایا گیا۔ داد و دہش خوب ہوئی۔

(۲) سال جلوس ۳۲ء ۹۹۵ھ

..... بشہر لاہور در شبستانِ شاہزادۂ سلطان سلیم از دخترِ پاکِ فرزند راجہ بھگونت داس آں گوہرِ سعادت پرتو چہرہ برافروخت و بفرخ ساعتی نوید خجستگی نشاط آورد زمانہ بہ تہنیت گزاری برنشست و روز بعشرت بزمے برخواست رازدارانِ آسمانی چشمِ دوربین باز کشادند و لختے از شگرف کاری سپہر و اختر دریافتہ برگزاردند۔ نظم

بسے سیرِ سپہر انجمن ساختند ؎ ترازوے انجم برافراختند
چناں طالعے کامد آں پور ازو ؎ چہ گویم زہے چشم بد دور ازو ؎

طالع ..... کیوان خدیو آں بفرزانہ فرزند را بسلطان خسرو نامور گردانید امید کہ بہ ہمیں دمسازانِ آگہی ببالد و شایستہ خو ہا روز افزونی گیرد۔[۵۲]

[خلاصہ] شہر لاہور میں شاہزادہ سلیم کے محل میں راجہ بھگونت داس کی بیٹی سے لڑکا ہوا۔ مبارک ساعت میں خوش خبری پہونچی۔ بڑی خوشی ہوئی۔ دنیا بھر میں مبارک سلامت ہونے لگی۔ اکبر نے خسرو نام خود رکھا۔ طالع دیکھا گیا۔ امید ہے کہ ہوش مندی کے ساتھ بڑھے گا۔ اور نیک عادتوں میں دن بہ دن ترقی کریگا۔

اہلِ دربار اور مقربانِ سلطنت کی دعائیں اتنی تو پوری ہوئیں کہ خسرو نیک خصال و نیک کردار ثابت ہوا" مگر نیک مزاج و نیک بخت نہیں۔ اُس کی زندگی تمام تر کلفت و اذیت میں گزری۔ انجام اندوہناک تر ہوا۔

(۳) ۳۳ھ جلوس، مطابق ۹۹۷ھ۔ سفرِ کشمیر میں شاہزادہ سلیم کو حکم ملا کہ اردوئے شاہی میں

۵۱ اکبرنامہ، جلد سوم، صفحہ ۵۰۸ - ۵۲ اکبرنامہ جلد سوم، صفحہ ۵۲۵۔

جا کر سلطان خسرو اور چند بیگمات کو لوا لائیں[۵۱]

(۴) ۳۵ سنہ جلوس، مطابق ۹۹۹ھ میں بسم اللہ ہوئی۔ مکتب میں بٹھایا گیا۔ اکبر نے پہلا حرف "الف" خود بتایا۔ باقی تعلیم شیخ ابوالفضل کے ذمہ ہوئی، تاکہ کچھ نہ کچھ روزانہ سکھا دیا کریں۔ شیخ نے پھر اپنے بھائی شیخ ابوالخیر کے سپرد کر دی، جو نیک ذاتی اور دانش آموزی میں یکتا تھے[۵۲]

(۵) سال جلوس ۳۸، مطابق ۱۰۰۰ھ میں رہتاس کی راہ میں شہر کے قریب شاہزادہ خسرو نے حاضر ہو کر دادا جان کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا[۵۳]

(۶) ۷ ر ماہ آذر ۳۸ سنہ ج = ۱۰۰۱ھ میں سلطان خسرو کو ہندی علوم کی تعلیم شروع ہوئی۔ بھودت برہمن جو بھٹاچارج کے لقب سے معروف تھے اور اس زمانے میں تمام فنون میں یکتا سمجھے جاتے تھے اس خدمت پر مقرر ہوئے[۵۴]

(۷) ۳۹ سنہ جلوس ۱۰۰۲ھ میں جب شاہزادۂ کلاں (سلیم) کے رتبہ و منصب میں ترقی ہوئی تو باوجود خورد سالی کے سلطان خسرو کو بھی بوجہ خرد و بزرگی (عقل میں بڑا ہونے کے) پنج ہزاری مرتبہ مرحمت ہوا[۵۵]

(۸) ۴۲ سنہ جلوس = ۱۰۰۷ھ میں اکبر جب دکن سے مالوہ کی طرف شکار کو چلا تو سلطان خسرو بھی ہمرکاب تھا[۵۶]

خسرو کی ذات و صفات کی نسبت فارسی کے قدیم مورخوں نے قطعاً سکوت اختیار فرمایا ہے۔ البتہ مولانا غلام محمد ہفت قلمی مصنف تذکرۂ خوش نویسان نے سلطان خسرو کو طبقۂ خوش نویسان میں شمار کیا ہے اور خورم و پرویز و دارا شکوہ شاہزادگان بلکہ زین خان کوکہ سے بھی پہلے جگہ دی ہے۔ ہمارے معاصرین میں سے، کرنیل میلی سن اس کو جامع اوصاف بتاتے اور لکھتے ہیں کہ تمام امرا بھی اس کو ایسا شاہزادہ مانتے تھے، جس کا طریقہ بے داغ تھا[۵۷]

---

۵۱ اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۵۶۵۔ ۵۲ ایضاً صفحہ ۶۳۴۔ ۵۳ ایضاً صفحہ ۶۷۱۔ ۵۴ ایضاً صفحہ ۶۸۴۔ اسی مورخ (ابوالفضل) نے آئین اکبری میں "نسناسائے عقلی کلام" اور "دانش اندوزانِ جاوید دولت" کے زیر عنوان ممتاز ہند و فضلا کے جو نام لکھے ہیں، ان میں کوئی "بھودت" پڑھا نہیں جاتا۔ خالی "بھٹاچارج" ایک ملتا ہے۔ غالباً انھیں سے مراد ہے۔ باقی دو بھٹاچارج کے نام بھی بتا دیے ہیں۔ ۵۵ اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۶۸۷۔ ۵۶ ایضاً صفحہ ۸۱۰۔ ۵۷ اکبر اور سلطنت مغلیہ کا عروج، صفحہ ۱۴۲۔

اسی عہد کا اٹالین سیاح پیٹرو ڈیلاویلے لکھتا ہے کہ سلطان خسرو ایک شاہزادہ بڑی بڑی امیدوں کا مرکز اور بغایت محبوب تھا۔[۱]

جہانگیر کو بقائے دوام بخشنے والے اور دردرس مصنف ڈاکٹر بینی پرشاد بھی اس بارہ میں شکوہ سنج ہیں کہ کسی سوانح نگار نے خسرو کی زندگی کا کوئی واقعہ لکھنا ضروری نہیں سمجھا جب تک کہ شہرت و نام کی تیز روشنی اُس پر پرتو انداز نہیں ہوئی۔ فرماتے ہیں کہ خسرو سترہ سال کا نوجوان لڑکا تھا بے حد حسین و شکیل تھا۔ سلیقہ خوب، اخلاق دلآویز و محبوب تھے۔ اس کے اطوار ملامت و اعتراضات سے پاک تھے۔ یہ بھی مان لیجئے کہ اُس کو تعلیم عمدہ ملی تھی، فوجی قواعد و منصب کی بھی اور ادبی و انشاپردازانہ فنون کی بھی۔ اُس کے دل و دماغ کی خوبیوں اور اُن کے اعلیٰ فوائد و نتائج کا اُس کے باپ اور چچاؤں کے طور طریقوں سے کیا مقابلہ ہوسکتا ہے۔[۲]

موصوف بحوالہ میک لیگن صاحب Maclagan[۳] تحریر کرتے ہیں کہ پادری پن ہیرو Pinheiro جو یہاں جیسوٹ عیسائیوں کی تیسری مشن کے ساتھ تشریف لائے تھے ۱۵۹۵ء کا ایک واقعہ نقل فرماتے ہیں "میں اکبر بادشاہ کو حضرت مسیح اور مریم عذرا کی تصویریں دکھا رہا تھا۔ جس وقت ان پاک تصاویر پر خود ہماری نظر پڑی تو ہم نیچے جھک کر دوزانو ہوگئے۔ ہم کو دیکھ کر شہنشاہ کا پوتا یعنی شاہزادہ کا بیٹا، جو دس سال کا ہوگا، اُس نے بھی اپنے ہاتھ باندھ لئے اور اپنے زانوؤں کو جھکا لیا۔ بادشاہ کو یہ دیکھ کر مسرت ہوئی اور شاہزادہ سے فرمایا کہ اپنے بیٹے کو تو دیکھئے۔"

ڈاکٹر صاحب کا ارشاد ہے کہ یہ دس سال کی عمر تو پادری صاحب نے اپنے اندازہ سے لکھ دی ہے۔ حقیقۃً خسرو اُس وقت صرف آٹھ سال کا تھا۔[۴]

خسرو کی موت خواہ بقضائے الٰہی آئی ہو یا بلائی اور کسی کے ہاتھ کی لائی ہوئی رہی ہو، معتمد خاں مولف اقبال نامہ، شکر رت جہانگیری اور غیرت خاں خواجہ کامگار حسینی محرر جہانگیر نامہ کی روایت کے مطابق ۲۰ بہمن ۱۰۳۱ کو ہوئی تھی۔ جس کو مسٹر بیل ۹ ماہ مذکور یعنی ۱۳ ربیع الثانی اور مسٹر بیوریج ۲۹ جنوری ۱۶۲۲ بتاتے ہیں۔[۵] اور حقیقت یہ ہے کہ بڑی بیکسی و بے بسی کی حالت میں (دکن میں) ہوئی۔ شاہجہاں (شہزادہ)

---

[۱] سیاحت نامہ، صفحہ ۵۵۔ [۲] تاریخ جہانگیر، صفحہ ۴۷۔ [۳] صفحہ ۴۰۔ [۴] تاریخ جہانگیر، صفحہ ۶۳۔ [۵] جورنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی

جب راجگانِ احمد نگر و برار کے مقابلے کے لئے میدان جنگ کو چلا ہے تو بڑے اصرار و لجاج سے جہانگیر سے اجازت لے کر اور آنی رائے سنگھ دلن[51] اور آصف خاں کی حفاظت سے خسرو کو باہر نکلوا کر اپنے ہمراہ لیتا گیا تھا[52]۔ جہانگیر نے شاہجہاں کو کامل اختیارات[53] دے دئے تھے کہ جس طرح مناسب ہو خسرو کے ساتھ برتاؤ اور سلوک کرنا۔ سب اُس کی تمیز و صوابدید پر چھوڑا تھا۔

اقبالنامۂ جہانگیری میں بخشی الممالک معتمد خاں کے الفاظ یہ ہیں "و خسرو را کہ در زندانِ مکافات محبوس بود و بند ہائے شاہی محافظت و محارست او می نمودند حکم شد کہ ہمراہ خود بُردہ بضابطہ کہ خاطر آں فرزند مطمئن باشد مقید دارد ....." یہ کہہ کر جہانگیر خود اکبرآباد چل دیا اور شاہجہاں کو روانہ دکن کر گیا تھا۔ معتمد خاں کی بھی اسی لشکر میں ماموری تھی۔ خدمت بخشی گری پر تقرر ہوا تھا۔

خافی خاں لکھتے ہیں "و حکم شد کہ خسرو خسران مآل را ہمراہ بُردہ قسمے کہ خاطر از و جمع باشد نگاہ دارند[55]"۔ سرکاری رپورٹ اور تزک[56] کی خبر تو یہ ہے کہ خسرو نے وہاں دردِ قولنج سے یکایک وفات پائی۔ مگر ایک جماعت کا اشتباہ بلکہ دعویٰ ہے کہ شاہجہاں نے اُس کو مروا ڈالا تھا تاکہ مقابلہ کا سب سے بڑا دعویدار اور امراؤ مقربینِ شاہنشاہی کا سب سے زیادہ محبوب و عزیز[57] شاہزادہ دنیا سے رخصت ہو جائے اور تاج و تخت اس کے لئے خالی رہے۔

میں مسٹر بیوریج کا مضمون۔ بابت جولائی ۱۹۰۷ء صفحہ ۶۰۱۔ قاموس المشاہیر میں (صفحہ ۲۲۴ پر) ۲۳ ربیع الاول ۱۰۳۱ھ تحریر ہے اور انگریزی تاریخ ۱۶ جنوری ۱۶۲۲ء عمر ۳۶ سال (صفحہ ہذا) [51] انوپ سنگھ، راجہ بڑگوجر کا آنی رائے سنگھ دلن خطاب تھا۔ دادا نے اتفاقاً ایک شاہی چیتے کو شکار کر لیا تھا ماخوذ ہوا۔ سچ کہہ دینے پر رہا کر دیا گیا۔ ملازمت میں داخل ہوا۔ بیرزائن باپ تھا۔ جہانگیر کے شیر کے شکار میں ساتھ تھا مجروح ہوا۔ بادشاہ کی جان بچائی۔ صلہ میں مرصع تلوار عطا ہوئی اور خطاب آنی، سپہ سالار شیر کا مارنے والا۔ جہانگیر کا نہایت معتبر و معزز و مقرب امیر تھا۔ قاموس المشاہیر، صفحہ ۱۱۱۔ اوبماق مغل، صفحہ ۵۷۴۔ اقبال نامۂ جہانگیری صفحہ ۴۶ تا ۴۸۔ [52] بیوریج صاحب کا مضمون، رسالۂ رایل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۷ء، صفحہ ۵۹۷۔ اور ڈکن صاحب کی آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۲۳۔ [53] تاریخ جہانگیر از گلیڈون، صفحہ ۹۴۔ [54] صفحہ ۱۶۴۔ [55] منتخب اللباب، حصہ اول، صفحہ ۳۷۰۔ [56] تزک جہانگیری، صفحہ ۳۴۲۔ ترجمۂ انگریزی، جلد دوم، صفحہ ۲۲۸۔ اقبال نامۂ جہانگیری، صفحہ ۱۹۱۔ [57] اکبر اور سلطنت مغلیہ کا عروج، از کرنیل میلی سن، صفحہ ۱۴۲۔

دھویا ہزار اُس بُت سفاک نے مگر   دھبے ہمارے خون کے خنجر میں رہ گئے

مسٹر بیل نے مفتاح میں کم و بیش پُرانی کتابوں سے دونوں روایتیں نقل کر دی ہیں۔ لکھتے ہیں کہ "شاہزادۂ خسرو مدت تک محبوس رہا۔ آخر باپ کے خوف سے اکبرآباد سے بھاگ کر الٰہ آباد چلا آیا اور وہیں اقامت اختیار کی۔ حتّٰی کہ وفات پائی"..... "بعض تواریخ میں مرقوم ہے کہ شاہجہاں جب ولایتِ دکن کی تسخیر کو گیا تو بھائی کو بھی لیتا گیا اور وہیں شہید کرا دیا۔ جہانگیر نامہ میں تحریر ہے کہ وہ دکن میں دردِ قولنج سے فوت ہوا۔ اگر یہ صحیح ہے تو تعجب ہے کہ اس کا مزار الٰہ آباد میں کیسے بنا۔ اسی کتاب میں لکھا ہے کہ تکفین و تدفین کے بعد بادشاہ کے حکم سے اس کی نعش احقاقِ شہادت کے لئے قبر سے نکالی گئی تھی۔ شاید اس کے بعد الٰہ آباد بھیج دی گئی ہو، اس لئے کہ اس کی ماں کی قبر وہیں تھی۔"[۵۱]

مسٹر بیل کے بعد کے ایک مورخ صاحب "اویباق مغل" اسی قدر لکھ کر خاموش ہو گئے کہ اسی سال شہزادۂ خسرو دکن میں گزر گیا۔[۵۲]

اُس زمانہ کے یوروپین سیاحوں اور لکھنے والوں[۵۳] کی متفقہ خبر اور اطلاع یہی ہے کہ شاہجہاں نے خسرو کو ہلاک کرا دیا تھا۔ موافق و مخالف دونوں طرح کی روایات اور تحریرات پر میں "شاہزادۂ خسرو کے تذکرہ" میں ضروری تفصیل کے ساتھ بحث کر چکا ہوں۔ یہاں نقل و تکرار کی حاجت نیز گنجایش نہیں پاتا۔ مسٹر ہوڈیوالا کو اس بارہ میں اختلاف ہے۔ فرماتے ہیں[۵۴] کہ زہر دینے یا گلا گھونٹنے کی کوئی شہادت نہیں پائی جاتی۔ میں کہتا ہوں کہ راجپوتوں کی تاریخیں صاف لفظوں میں خسرو کے مروا ڈالنے کا الزام خورم پر لگاتی ہیں۔[۵۵]

ہنریخ فان پوسا Heinrich von Poser جرمن سیاح نے جو اُس وقت ہندوستان میں موجود تھا، لکھا تھا "لیکن خورم کی اس دہشت ناک برادر کُشی یعنی خسرو کے قتل کو کون پسند کرے گا۔ بے شبہ یہ مشہور مثل ہے کہ جو کوئی حق و صداقت کے مقابلہ میں جبر و جور کرنے

---

[۵۱] مفتاح التواریخ، صفحات ۲۳۵ تا ۲۳۶۔ [۵۲] صفحہ ۱۷۱۔ [۵۳] پیٹرو ڈیلا ویلی۔ پیٹر منڈی۔ ولیم ٹیری۔ پلسارٹ۔ ہربرٹ۔ فان پوسا۔ ڈی لٹ۔ [۵۴] جورنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن، جولائی ۱۹۱۰ء، صفحہ ۵۹۹۔ [۵۵] تاریخ جہانگیر از گلیڈون۔ صفحہ ۸۹ (اضافہ پرنسپل اینگر۔)

کے لئے تیار ہوگا، تو وہ تاج ہی کے حاصل کرنے کے لئے ایسا کرے گا۔ لیکن کیا کوئی تاج کسی ایسے سر پر مضبوطی کے ساتھ ٹھہر سکتا ہے، جس کے اندر نہ ایمانداری ہو نہ لائق اعتماد ہونے کی صفت۔"[۱]

مسٹر آیروین William Irvine ترجمۂ تزکِ جہانگیری کے تبصرہ میں جہاں جہاں گیر کے مردانہ اوصاف اور سپاہیانہ قابلیتوں کی ستائش فرماتے، اور جس خوبی سے اُس نے اپنے بیٹے خسرو کی بغاوت کا استیصال کیا اور بڑی سے بڑی مستعدی سے کام لیا تھا، اُس کا اعتراف کرتے ہیں؛ یہ بھی تحریر کرتے ہیں "لیکن یہ بات بھی کس قدر قابلِ افسوس ہے کہ اُس نے کتنی بڑی کمزوری سے اس بدنصیب شاہزادے کو خورم کے ہاتھوں میں دے دیا تھا۔ جس کے بارہ میں کم از کم یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ زہر دے کر جان لے لینے میں حقیقتہً اس کی بھی سازش تھی؛ ورنہ چشم پوشی تو ضرور ہوگی تھی[۵۱]"

تہمتِ قتل مٹائے سے نہیں جانے کی خونِ ناحق مرا سرخی ہے ہر افسانے کی

حال کے سرکاری مورخین و مفتشین میں سے مسٹر سی ڈی اسٹیل، ضلع الہ آباد کے گزیٹیر (جلد ششم مطبوعہ ۱۸۸۴ء) میں بحوالۂ تاریخ الفنسٹن صاحب (صفحہ ۴۹۲) لکھتے ہیں کہ خسرو کو شاہ جہاں نے ۱۶۲۱ء میں قتل کرا دیا تھا[۵۲]۔ کرنیل نیویل گزیٹیر جدید میں تحریر فرماتے ہیں کہ بدنصیب شاہزادۂ خسرو حراست میں الہ آباد بھیج دیا گیا تھا۔ سنہ ۱۶۲۲ء میں فوت ہوا۔ عام خیال یہ ہے کہ باپ کے اشارے یا حکم سے ہلاک کرا دیا گیا تھا۔[۵۳]

شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ خاں بہادر نے ہندوستان کی مبسوط تاریخ میں، جو اسی سرزمین (الہ آباد) پر بیٹھ کر چودہ ضخیم جلدوں میں دس ہزار صفحوں پر لکھی گئی تھی اس واقعہ کو دردناک تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ اس لئے اُن کی اصل عبارت[۵۴] یہاں نقل کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

"باپ کے ساتھ بے ادبی کرنے سے سلطان خسرو ہمیشہ نابینوں (نابیناؤں[۵۵]) کی پُتلی کی طرح نظر بند رہتا تھا

---

[۱] جورنل رایل ایشیاٹیک سوسائٹی لندن، جولائی سنہ ۱۹۰۱ء صفحہ ۹۴۹۔ [۵۲] صفحہ ۱۳۸۔ [۵۳] سنہ ۱۹۱۱ء صفحہ ۱۴۹۔
[۵۴] تاریخ ہندوستان، مطبوعہ ۱۸۹۵ء۔ جلد ہفتم۔ صفحہ ۱۹۔ [۵۵] خسرو کے نابینا کر دئے جانے کے متعلق موافق و مخالف دونوں قسم کی روایات "تذکرۂ خسرو" میں نقل کر دی گئی ہیں۔

اور اپنی پاداش میں گرفتار تھا۔ اور اُس کی نگرانی خواجہ ابوالحسن کو سپرد تھی۔ اب خواجہ، شاہ جہاں کے لشکر کے ساتھ روانہ ہوا۔ جہانگیر نے جمعیتِ خاطر کے لئے خسرو کو شاہجہاں کے وکلا کے سپرد کیا۔"

"سلاطین ذیشان جن برادروں اور خویشوں کو معدوم کرنے کو بہبود عالم جانتے ہیں۔ ان سے دنیا کے خالی کرنے کو محض صواب سمجھتے ہیں اور مشیرانِ ملک و ملت بمقتضائے مصلحت و ناگزیر کار مطلق شرکاءِ دولت کا استیصال خیر اندیشی و بہبود اہل روزگار جانتے ہیں۔ دین و دولت کے صواب گویوں کی تجویز سے ربیع الثانی سنہ ۱۰۳۱ھ کو سلطان خسرو کو ملک عدم کو روانہ کیا۔ جہانگیر نے شراب کے نشہ کی بے خبری میں خسرو کو شاہ جہاں کو حوالہ کر دیا تھا۔ گفتگوے مرحوم کے رفع کے لئے دوسرے روز ارکانِ دولت اور اعیانِ حضرت نے تکبیر و درود پڑھ کر اس کی نعش کمال تعظیم و نہایت تکریم سے اُٹھائی۔ بُرہان پور سے لے جا کر عالَم گنج میں اُس کو مدفون کیا۔ اُس مظلوم کی بے کسی و بے چارگی پر عورت و مرد اُس کو درد کے ساتھ روتے تھے اور اس سانحۂ ناگزیر نے مدتوں تک دور و نزدیک کو رنج و الم میں رکھا۔ اور جب تک وہ شہر میں مدفون رہا شب جمعہ کو ایک عالم اسکے مرقد کی زیارت کو جاتا۔ پھر یہاں سے اُس کی نعش الٰہ آباد میں منتقل ہوئی۔ ہر منزل میں بدستور شہر اُس کی قبر نمودار کی گئی۔ برسوں تک پنجشنبہ کو اُس موضع کے آدمی گرداگرد سے جمع ہو کر رات کو اُس خالی قبر پر گزارتے تھے۔ سلطان خسرو کے مارنے سے غرض یہ تھی۔ . . . . ."[1]

"شاہ جہاں نے اول خسرو کو آنجہانی بنایا اور پھر از سرِ نو دولت خانۂ بُرہان پور کے در و دیوار کو جشنِ نوروزی سے آرایش دی۔ اور بزم فیروزی کی پیرایش کی اور اُس میں طلاء و نقرہ کی ریزش کی۔"[2]

اورنگ زیب عالمگیر اُس تمام تکریم و احترام کے ساتھ جو ایسے باپ کے شایانِ شان تھی، شاہ جہاں کو جواب میں لکھتا ہے۔

"......آنچہ در بارۂ برادران نوشتہ بودہ آں خود چرا بر بے ادبی محمول شود۔ اعلیٰ حضرت خسرو و پرویز را کہ پیش از ایامِ خلافتِ آں حضرت بوادی فنا شتافتہ بودند و ہیچ گونہ آسیبے و مضرتے ازاں ہا متوقع نہ بود، تا حال

[1] تاریخ ہندوستان۔ عہد جہانگیری۔ مطبوعہ ۱۸۹۰ء۔ جلد ہفتم۔ صفحہ ۲۹۔ یاد رہے کہ شاہ جہاں کے حکم سے شہریار وغیرہ کئی شاہزادے قتل کر دیئے گئے تھے۔ قصص ہند حصہ دوم، صفحہ ۱۱۹۔ [2] تاریخ ہندوستان۔ عہد جہانگیری، مطبوعہ ۱۸۹۷ء، جلد ہفتم، صفحہ ۳۰۔

چہ قسم یاد می فرمایند۔"

مُرتبِ رقعات مولانا نجیب اشرف اس کی تعبیر فرماتے ہیں۔ "آپ مجھے بُرا کیوں کہتے ہیں۔ کیا آپ اپنے بھائیوں خسرو اور پرویز کو بھول گئے۔ باوجودیکہ اُنھوں نے آپ کو کوئی گزند نہیں پہونچایا تھا مگر یاد کیجئے کہ آپ نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا۔"[51]

خافی خاں، نظام الملکی خود کو بچاتے ہوئے دوسرے کے حوالہ سے لکھتے ہیں[52] "خسرو را کہ ہمراہ شاہزادہ شاہ جہاں دادہ بودند بقول غیرت خاں مولفِ جہانگیر نامہ مسموم نمودند۔"

منشی المناشی لالہ سجان رائے فرماتے ہیں[53] کہ جلوس کے پندرھویں سال اسی زندان خانہ میں خسرو نے ودیعتِ حیات سپرد کی۔ و" درد با ہنا اُفتاد کہ بادشاہزادۂ شاہ جہاں اورا آنچناں تنگ کرد کہ در زندان فنا گرفتار گشت۔"

تقریباً یہی قول اور یہی الفاظ منشی غلام حسین خاں، صاحبِ سیر المتاخرین کے بھی ہیں[54]۔

شمس العلماء آزاد دہلوی نے تحریر کیا ہے کہ[55] "۱۰۳۰ھ میں خسرو مر گیا۔ شاہجہاں مہم دکن پر رخصت ہوا تھا۔ وہ اکثر باپ سے اس بدنصیب بھائی کی سفارش کیا کرتا تھا۔ اس موقع پر جہانگیر نے اُس سے کہا۔ میں دیکھتا ہوں خسرو ہمیشہ آزردہ اور مکدر رہتا ہے اور کسی طرح اُس کا دل شگفتہ نہیں ہوتا۔ اُسے تم اپنے ساتھ لیتے جاؤ اور جس طرح مناسب ہو حفاظت میں رکھو۔ وہ دکن میں بھائی کے ساتھ تھا کہ دفعۃً دردِ قولنج اُٹھا اور مر گیا۔ بعض مورخ یہ بھی کہتے ہیں رات کو اچھا بھلا سویا صبح دیکھو تو فرش پر مقتول پڑا ہے۔"

سر ولیم سلی مین کی روایت ہے[56] کہ "شاہزادۂ ولیعہد کی ماں کے مار ڈالنے سے نورجہاں کو توقع تھی کہ اس طرح تخت خود بخود اُس کے آوردہ و متوسل[57] (شہریار) کے لئے خالی ہو جائے گا۔ خسرو کو وحشیانہ

---

[51] رقعاتِ عالمگیری، مطبوعہ دار المصنفین، جلد اول، صفحہ ۲۲۲، نمبر ۱۳۰۔ [52] منتخب اللباب، حصہ اول، صفحہ ۳۲۵۔
[53] خلاصۃ التواریخ، صفحہ ۴۲۵ قلمی۔ و صفحہ ۴۴۵، مطبوعہ ۱۸۴۵ء۔ [54] صفحہ ۲۳۹، جلد اول۔ [55] دربار اکبری، صفحہ ۲۰۹۔ [56] سیاحت و تذکرے (ریبلس اینڈ ری کلکشنس) جلد اول، صفحہ ۲۰۲۔ [57] داماد بھی تھا پہلے شوہر سے لڑکی کا شوہر۔

طور پر بصارت سے محروم کرادینے کے بعد نامہربان باپ مہربان ہو گیا۔ اور خسرو کے ساتھ بڑی شفقت و مہر سے پیش آنے لگا تھا۔ لیکن جب خسرو کا بھائی شاہ جہاں جنوبی ہند کی گورنری پر مقرر ہوا تو اُس نے اپنے بیچارے نابینا بھائی کی راحت و آسایش کے متعلق اپنی ناخاطر جمعی اور پریشان بالی کا نمایشی اظہار کیا۔ اندیشہ ظاہر کیا کہ دارالسلطنت میں اُس کی فراغت و آرام کا اتنا خیال کون رکھے گا۔ اس لئے وہ خسرو کو لے کر اپنے صوبہ دکن چلا گیا اور وہاں اُس کو قتل کرادیا۔ کیونکہ یہی ایک صورت تھی جس میں وہ اپنے لئے یقینی طور پر تاج و تخت کو محفوظ سمجھتا تھا۔"

اس پر ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ اپنے نوٹ نمبر ایک میں صرف اسی قدر اضافہ کرتے ہیں[۱] کہ سالِ قتل ۱۰۳۱ھ یعنی ۱۶۲۱-۲۲ تھا۔

مسٹر کین لکھتے ہیں[۲] کہ "سنہ ۱۶۱۵ء (؟) میں ناعاقبت اندیش و بدنصیب خسرو مر گیا اور الہ آباد میں اپنی ماں کے برابر اُسی باغ میں جو آج تک اُس کے نام سے منسوب ہے' دفن ہوا۔ شاہ جہاں کے ولی عہد سلطنت ہو جانے کا اعلان (اگرچہ) ہو چکا تھا تاہم وہ اپنے سوتیلے بھائی کی موت کے شبہ سے پاک نہیں رہا۔ البتہ یہ الزام کبھی اُس کے خلاف ثابت نہیں ہوا۔ اور خود اُس کے طریقِ عمل میں بھی کوئی ایسی بات پائی نہیں جاتی جس سے ایسی ستمگاری کی تہمت کا وہ سزاوار ہو۔"

اس طویل سلسلۂ نقل و حکایت اور روایت و درایت کو ڈاکٹر اسٹینلے لین پول Lane-Poole کی اس تحریر پر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ کہ "جہانگیر کا دوسرا بیٹا شاہ جہاں' خسرو کو ملکی معاملات میں انتہا درجہ کا پرخطر مدمقابل شمار کرتا تھا۔ جو بات کہ دراصل واقع ہوئی ہے کبھی بھی منکشف نہ ہوگی۔ البتہ جب شاہزادہ خرم دکن کو فتنہ و فساد کے استیصال کے لئے سنہ ۱۶۲۱ء میں گیا تو اصرار کرکے اپنے بڑے بھائی کو بھی ساتھ لیتا گیا۔ بدنصیب خسرو وہیں مرا۔ کہا تو جاتا ہے کہ بخار سے۔ گو مشرق میں بعض اوقات ایسے بخار نہایت ٹھیک وقت پر آجاتے ہیں۔"[۳]

---

[۱] سیاحت و تذکرے (ریبلس اینڈ ری کلکشن)' جلد اول' صفحہ ۳۰۳-۳۰۴۔ [۲] کین کی مغل ایمپائر' صفحات ۱۱۸ و ۱۱۹۔
[۳] قرونِ وسطیٰ کا ہندوستان تحتِ حکومتِ مسلمانان' صفحہ ۳۲۱۔

مسٹر ہنری بیوریج "تزک جہانگیری" کے ترجمہ کے دیباچہ میں ارقام فرماتے ہیں کہ "جہانگیر کے بعد شاہجہاں تخت نشین ہوا۔ اُس نے اپنے رشتہ داروں کو رخصت کر دینے میں تاخیر نہیں کی۔ ایک ترک کی طرح اُس نے کسی قریب (قریبی) کو تخت کے قریب نہیں رہنے دیا۔ فی الحقیقت اُس پر بڑا (قوی) شبہ کیا جاتا ہے کہ اُس نے اپنے بڑے بھائی خسرو کو کئی سال پیشتر قتل کرا دیا تھا۔"[۵۱]

لاہور کے مشہور مصنف و مورخ سید محمد لطیف اپنی تاریخِ ترکی (روم) میں لکھتے ہیں کہ کچھ مغلوں ہی پر منحصر نہیں۔ عثمانی خاندان کے ترک سلاطین بھی مصالحِ ملکی اور اغراضِ ذاتی کے لحاظ سے اپنے اقارب و اعزہ کے خون کے دشمن رہے ہیں۔ محمد مخاطب بہ شریف نے جو مراد اعظم کا باپ اور ایک نیک نہاد انسان تھا اپنے بھائی کی آنکھیں نکلوا لی تھیں۔ بھتیجے کو قتل کرا دیا تھا..... اور شاید زیادہ رحم کا اقتضا یہی ہوتا تھا کہ انھیں فوراً ختم کر ڈالتے تھے۔[۵۲]

تاریخ اورنگ زیب و زوالِ سلطنتِ مغلیہ میں مسٹر اسٹینلے لین پول Stanley Lane Poole فرماتے ہیں کہ اسی خاندان کے سلطان بایزید نے اپنے بھائی شاہزادہ جم سے جب سلسلۂ مصالحت چھیڑا تو یہ لکھا تھا کہ Kingship counts no kinship بادشاہت میں رشتہ کا سررشتہ قائم نہیں رہتا۔ یہی ضرب المثل انگریزی میں بھی چلی آتی ہے۔[۵۳]

تزک کی تولیخ والی اطلاع کے متعلق مسٹر بیوریج کا خیال ہے کہ "یہ تاریخ ۲۰ اور ماہ 'بہمن' ہونا چاہیے۔ خسرو دکن میں فوت ہوا اور ماننا پڑے گا کہ برہان پور یا آسیر میں۔ ۲۰ بہمن سنہ ۱۰۳۱ھ تقویمِ قدیم سے ۲۹ جنوری سنہ ۱۶۲۲ء کے مطابق ہوتی ہے۔ لیکن اُس کے مرنے کی تاریخ ہنوز محقق و مشخص نہیں ہوئی ہے۔"[۵۴] کہا جاتا ہے کہ خسرو اخیر سال سولھویں جلوس میں مرا ہے۔[۵۵]

اس قدر ثابت ہے کہ خسرو کی لاش بڑی عجلت کے ساتھ برہان پور[۵۶] میں سپردِ خاک کر دی گئی تھی۔

---

۵۱ صفحہ ۶ دیباچہ۔ ۵۲ ہسٹری آف ٹرکی مطبوعہ ۱۸۸۸ء صفحہ ۳۹۔ ۵۳ مطبوعہ آکسفورڈ صفحہ ۶۱۔ و۔ ترجمہ اردو صفحہ ۸۶۔
۵۴ ترجمہ تزک انگریزی صفحہ ۲۲۸۔ ۲ نوٹ۔ اور۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا رسالہ بابت سنہ ۱۹۰۷ء صفحہ ۶۰۱۔ ۵۵ ترجمہ صفحہ ۲۲۸۔ ۵۶ تاریخ اپنے کو دہراتی ہے۔ یہ وہی برہان پور ہے جہاں ذیقعدہ ۱۰۴۰ھ (مئی ۱۶۳۱ء) میں ممتاز محل ارجمند بانو بیگم نے انتقال کیا تھا جہاں باغ زین آباد

اس کا باعث خواہ سیاسی ہو یا کچھ اور مصلحتیں رہی ہوں، بادشاہ جہاں کی ذاتی کاوش و مآل اندیشی یا میدانِ جنگ اور جدال و قتال کی ہنگامی ضرورتیں۔ لیکن غالباً خفیہ (کانفیڈنشل) اطلاعات کے پہونچنے اور چند در چند شبہات کے پیدا ہونے پر چند ماہ کے بعد قبر کھولی گئی[1] اور مئی ۱۶۲۲ء میں بادشاہ کے حکم سے (خسرو کی) لاش نکالی اور دارالسلطنت آگرہ کو روانہ کی گئی۔ آگرہ میں ۲۰ جون ۱۶۲۲ کو پہنچی[2]۔ وہاں سے الہ آباد لائی گئی[3]۔ اور بالآخر خلد آباد کے باغ میں اپنی مادرِ گرامی نژاد کے قریب اُس کے پہلو میں دفن کر دی گئی۔ یہ دولتِ اسلامی کے عروج اور زر پاشیوں کا وقت تھا۔ راستہ[4] میں جنازہ جہاں جہاں سے گزرا اور جن جن مقامات پر ٹھہرا گیا مختلف قسم کی یادگاریں قائم ہوتی گئیں۔ کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے باغ لگا دئے گئے۔ کہیں کہیں مقبروں کی وضع کی خانقاہیں اور مسافر خانے بنائے گئے۔

وہ کشتہ ہوں کہ مری لاش جسطرف گزری　　زمیں پکار اُٹھی قابلِ مزار ہوں میں

ایک یوروپین سیاح فرینچسکا پیلسور صاحب Francisco Pelsaert اپنے سفرنامہ میں ۱۶۲۶ء کے احوال میں لکھتے ہیں[5] کہ "ان مقامات پر فقیروں کی ایک کثیر تعداد متصرف و دخیل ہو گئی ہے۔ یہ لوگ مُزوِّر، مجاور یا خادم زود اعتقاد عوام الناس کو یقین دلا دیتے ہیں کہ خداوندِ عالم و عالمیان نے عالمِ رویا میں ہم کو ایسا حکم دیا ہے کہ جو لوگ تم سے صلاح و مشورے کے طالب ہوں اُن کو نجات و برأت کی بشارت دیتے رہو۔ اس طریقۂ وریاضت سے ان اشخاص کو کثیر رقمیں اور نقد و جنس خوب وصول ہو جاتا تھا۔"[6]

میں اس کی لاش امانتہً دفن کر دی گئی تھی۔ پھر چھ سات مہینے بعد اکبر آباد منتقل ہوئی۔ (ڈنکن صاحب کی آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۱۴۹۔ اور منشی معین الدین کی تاریخ تاج، صفحات ۱۰ و ۱۲۔ و بادشاہ نامۂ عبدالحمید لاہوری، جلد اول، صفحات ۴۰۲ و ۴۰۳۔ و تاریخ آگرہ از مولوی سعید احمد، ص ۴۶۔ و مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۵۲۔ خسرو کے ہلاک کرا دینے کے کچھ ہی زمانہ بعد، اسی موقع پر، بیگم کا ناگہاں مرنا شاہ جہاں کا مکافاتِ عمل تھا، یا شاید قدرت کا انتقام۔ تاریخ جہانگیر از پروفیسر بینی پرساد، صفحہ ۳۴۹۔

[1] تاریخ جہانگیر، صفحہ ۳۴۹ بحوالہ نکولس بانگھم وغیرہ۔ [2] ایضاً، صفحہ ۳۴۹ بحوالہ رابرٹ ہیوز۔ [3] ایضاً، صفحہ ۳۴۹ بحوالہ پیٹر منڈی۔

[4] پیٹر منڈی، جلد دوم، صفحہ ۱۰۱۔ [5] ترجمہ صفحہ ۱۵۱۔ [6] بادشاہ نامہ (جلد اول، صفحات ۴۰۲ و ۴۰۳) سے پایا جاتا ہے کہ ممتاز محل کی نعش جس وقت برہان پور سے چلی تھی تو آگرہ تک برابر اسی طرح خیر خیرات ہوتی آئی تھی اور غربا و مساکین کو کثیر مقدار میں نقد و جنس تقسیم و مرحمت ہوتا آیا تھا۔ تاریخِ تاج، صفحہ ۱۳۔

برہان پور والی قبر سے نعش نکالنے کے کچھ شواہد و اسناد اور بھی ہیں۔

Nicholas Bangham and Justiman affy نکولا بانگھم اور جسٹی مین آف لے نے ۹ مئی ۱۶۲۲ء کو برہان پور سے سورت فیکٹری کو رپورٹ کی تھی[۵۱] کہ سلطان خسرو کو قبر سے نکالا ہے۔ دہلی لئے جاتے ہیں۔ بادشاہ کا حکم ایسا ہی آیا ہے۔

قاتل! ترے دامن پہ مرے خون کے دھبّے   کچھ اور بھی خنجر سے چُھٹانے نہیں لگتے ہیں

پروفیسر بینی پرشاد کا خیال ہے اور یقیناً صحیح خیال ہے کہ آگرہ کی بجائے دہلی سہو کتابت یا لغزشِ قلم سے نکل گیا ہے[۵۲]۔ پیٹر منڈی صاحب Peter Mundy کا بھی یہی بیان[۵۳] ہے کہ خسرو کی لاش برہان پور سے آگرہ لائی گئی تھی۔ اس کی تائید دوسرے ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔ آگرہ کے کارکن رابرٹ ہیوز صاحب Robert Hughes نے اس تاریخ (۹ مئی ۱۶۲۲ء کو) سورت فیکٹری[۵۴] کو تحریر کیا تھا کہ آج سلطان خسرو کا تابوت برہان پور سے یہاں آیا ہے۔ کل الہ آباد چلا جائے گا۔ وہاں اپنی ماں کے قریب دفن ہوگا[۵۵]۔

منڈی صاحب بظاہر ایک بیہودہ و لغو سی روایت بھی نقل کرتے ہیں کہ "خسرو فی الواقع آگرہ میں پیوندِ زمین کر دیا گیا تھا۔ لوگ اُس کی حرمت و پرستش ولی و شہید کی طرح کرنے لگے تھے۔ نور محل، جو اس سے زندگی بھر نفرت و عناد رکھتی رہی، کیسے ضبط و برداشت کر سکتی تھی کہ مرنے کے بعد خسرو کا یہ ادب و احترام ملحوظ رکھا جائے۔ اس نے بادشاہ سے کچھ اس طرح منت و سماجت کی کہ وہاں سے بھی ہٹا کر 'مردہ آباد' یا 'کزرو آباد' Cazrooabad یا حقیقۃً الہ آباد اس کو منتقل کر دینا پڑا"[۵۶]۔

اس قول کی تائید یا تصدیق کسی اور اہلِ قلم سے نہیں ہوتی۔ یہ تسلیم ہے کہ اس واقعہ سے گیارہ بارہ برس پیشتر نور جہاں (۱۰۱۹ھ مطابق ۱۶۱۰ء میں) شبستانِ جہانگیری میں داخل ہو چکی تھی اور بادشاہ پر پورا قابو حاصل کر لیا تھا۔ ابھی یہ واقعات تازہ تھے اور مقبرہ کی تعمیر کو دس برس بھی نہ گزرے ہوں گے کہ پیٹر منڈی صاحب ۱۶۳۲ء میں

---

۵۱ ہندوستان کی انگریزی کوٹھیاں، بابتہ ۱۶۲۲ء و ۲۳، صفحہ ۵، ۵۲ تاریخ جہانگیر، ۳۳۹۔ ۵۳ سیاحت نامہ، جلد دوم، صفحہ ۱۰۵۔

۵۴ انگریزوں کی تجارتی کوٹھی سب سے پہلے یہیں سورت میں ۱۶۱۲ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے پانچ سات برس بعد آگرہ، ۱۶۲۰ء میں (سفرنامہ پیٹرو ڈیلا ویلے، صفحہ ۱۹ نوٹ)۔ ۵۵ انگریزی فیکٹریاں، بابتہ ۲۳-۱۶۲۲، صفحہ ۹۔ ۵۶ جلد دوم، صفحات ۱۰۵ و ۱۰۶۔

یہاں (الہ آباد) آئے اور مقبرہ دیکھا تھا۔ فرماتے ہیں کہ" چوٹی کے قریب لکڑی کا کٹہرہ یا جنگلا لگا ہے۔ اس میں سچے موتیوں کی سیپیوں سے ترصیع (جڑائی) کا کام کیا گیا ہے۔ اس میں مخملی زرکار شامیانہ (کینا پی) سایہ گستر ہے۔ سر پر شاہزادہ کی دستار ہے۔ پہلو میں مصحف (قرآن مجید) رکھا ہے۔"خوش عقیدہ سیّاح کا بیان ہے کہ" اسکے قتل کے لئے جسوقت لوگ اُسکے سر پر پہنچے ہیں تو خسرو اپنی شریعت کی اسی کتاب کو پڑھ رہا تھا۔"[1]

لیکن آج کیا حالت ہے۔ ڈاکٹر بینی پرشاد لکھتے ہیں[2] "کہ دیکھنے والا وہاں پہنچ کر صرف ایک بری سی سادہ قبر پاتا ہے۔ آپ بھی جائیں اور دردانگیز و رقت خیز فارسی کتبہ کو پڑھ لیں" یا اتنا انتظار فرمائیں کہ آگے چلکر مقبول ہیچمدان کا قلم مساعدت کرے اور انھیں ناچیز صفحات پر مقبرہ کا ایک دھندلا سا خاکہ کھینچ سکے۔

بدنصیب خسرو اور اس کی قبر کا مادّی احترام کرنے والا اب کون ہو سکتا ہے۔ اس کا ماتم کرنے والی اسکے باپ دادا کی سلطنت مدت ہوئی مٹ چکی۔[3] اُمرا کے قصر و ایوان صفحۂ ہستی سے یکقلم معدوم و ناپید ہو چکے۔ کچھ پرانی یادگاریں باقی ہیں تو صرف مشائخ و فقرا کی۔ جن کی عظمت و استحکام کو بھی زمانہ کا زبردست ہاتھ رفتہ رفتہ مٹا رہا ہے

اب خاک پہ ہیں، کل تخت پہ تھے، اک زیست کی حالت وہ بھی تھی

اللہ کی قدرت یہ بھی ہے، اللہ کی قدرت وہ بھی تھی

جلد باز انسان کا قلم اِس قدر جلد کہاں سے کہاں پہونچا۔ کہنا یہ تھا کہ جہانگیر اور اُس کے بیٹے پوتے کا زمانہ جسکو مورخ دولتِ مغلیہ کے شباب کا وقت بتاتے ہیں دیگر اسلامی مزارات و مقابر کی طرح، مقابرِ خسرو باغ

---

[1] سیاحت نامہ، جلد دوم، صفحہ ۱۰۶۔ [2] تاریخ جہانگیر صفحہ ۳۴۲۔ [3] ۲۴ شعبان ۱۲۷۳ھ (۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء) کو سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ہونا سمجھا جاتا ہے، جو دہلی پر برٹش گورنمنٹ کے قبضہ اور بہادر شاہ کی معزولی کی تاریخ ہے۔ سر رچارڈ برن Sir Richard Burn کے حساب سے ۹۳۲ سے ۱۲۷۵ھ تک یعنی ۳۴۳ سال کے قریب بابر کی اولاد ہندوستان میں حکمراں رہی ہے۔ میرے نزدیک شاہزادہ خسرو کے سالِ انتقال ۱۰۳۱ سے صرف ۲۷ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ (۱۶ اپریل ۱۷۴۸ء) تک شمار کرنا مناسب ہے، جس روز محمد شاہ دنیا سے رخصت ہوا تھا۔ اسکے بعد کے بادشاہ تو محض بے اختیار اور شطرنج کے بادشاہ تھے۔ خود الہ آباد میں شاہ عالم کا قیام دس گیارہ برس رہا ہے۔ مگر وہ حقیقتاً انگریزوں کا وظیفہ خوار اور کرنیل اسمتھ کی قید و بند میں (قلعہ میں) گرفتار تھا۔ شاہ عالم ۱۱۸۵ھ یعنی ۱۷۷۱ء میں الہ آباد سے دہلی روانہ ہوا۔ البتہ خود شاعر اور شعرا اور اہلِ کمال کا بڑا مربی و قدر شناس تھا۔

کے لئے بھی اچھا گزرا۔ چمن کی گلکاریاں اور پھولوں کی روشیں صدیوں بعد کیا کہہ سکتی ہیں۔ ہم بھی تو سمجھتے تھے کہ شاہزادہ ایک خیابانِ دلکش یا بہشتِ برین کے ٹکڑے میں دفن ہے۔ اُس کی یہ آرزو کہ

لطف آتے اسیری میں، اے کاش قفس اپنا　　　پھولوں سے لدا ہوتا پھولوں سے بھرا ہوتا

بعدِ مرگ پوری ہو گئی۔ لیکن حسرت ہے اور عبرت کہ اس ازلی حرماں نصیب کی تربت اس سے بھی محروم ہے۔ نہ وہاں پھولوں کی چادر ہے نہ کلیوں کا ہار۔۔ بیدرد و سنگدل انسانوں کی مجوزہ ترتیب و تنظیم کے ساتھ وہی پتھروں کا ڈھیر ہے اور بس۔

اس دستور کی مذہباً اصلیت و صحت سے بحث نہیں، لیکن معمولاً ممتاز مسلمانوں کی قبر پہ، خواہ وہ امتیاز کسی گروہ و ملت کے پیشوا ہونے کی حیثیت سے حاصل ہو خواہ دنیوی وجاہت و مرتبت سے، دو چیزیں ضرور ہوتی ہیں۔ ایک روشنی دوسری خوشبو۔ مقبرے کے چبوترہ پر پہونچتے ہی زائر و متزاور کی نظر ایک سفید نویس سیاہ تختہ اور منجملہ اُس کی متعدد ہدایاتِ احترامی و انتظامی مجریہ و دستخطی حاکمِ ضلع کے، پہلے ہی دفعہ پر پڑتی ہے جس کے رو سے دیواروں کے طاقوں پر چراغ جلانے کی ممانعت ہے۔ رہی خوشبو۔ اگر کی بتیوں اور عطر و عنبر کے مرکبات کی بحث ہیں غالباً کوئی مد نہیں۔ پھولوں کا سلسلہ یوں قطع ہو چکا۔

پھول کیسے مرمٹوں کی قبر پہ، 　　　خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائے گی

کچھ اوپر سو برس ہوئے۔ اس کی گئی گزری حالت میں بشپ ہیبر Bishop Heber الہ آباد آئے تھے۔ اپنوں کے جور و جفا کے مظلوم و بے زبان فریادی یا اپنی حوصلہ مندی و بلند ہمتی کے شکار خسرو کی قبر کو دیکھا تھا۔ یہ عظیم المرتبت واجب التقدیس سیاح لکھتا ہے[۱] کہ "سرا سے ملحق ایک نذرِ غفلت باغ ہے۔ جس میں عمدہ قسم کے آموں کے پرانے درخت ہیں۔ جس میں تین خوبصورت مقبرے ہیں۔ دو تو دو شاہزادوں پر اور ایک، ایک شاہزادی پر، بنائے گئے ہیں جو شہنشاہی خاندان کے تھے۔ یہ بڑے بڑے بلند چبوتروں پر بنے ہیں۔ ان کے نیچے تہ خانے ہیں۔ بیچ والے میں عمدہ منقش کام کیا ہے۔ قبر پتھر کی، تابوت کی طرح ہے۔ اس پر ایک نہایت بلند مدوّر (گول) کمرہ سا بنا ہے۔ اس پر ایک گنبد سایہ کئے ہے۔

---

[۱] ہیبر صاحب کا جرنل، جلد اول، صفحہ ۳۴۴۔

جس کے اندر نہایت خوب و عمدہ رنگ آمیزی کی گئی ہے۔ باہر کی طرف اس سے بھی زیادہ خوشنما نقاشی ہے۔ یہ سب نہایت پاکیزہ و سنجیدہ اور دل پر اثر ڈالنے والے ہیں۔ پُر تکلف ہے مگر گل و گلزار یا زیبائشی و نمائشی نہیں۔ یہ خیال جو عام طور پر انگلستان میں پھیلا ہوا ہے کہ مشرقی تعمیرات وحشیانہ اور بدمذاقی کا نمونہ ہوتی ہیں، ان کو دیکھ کر غلط اور بالکل جھوٹ ثابت ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر بینی پرشاد اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ پورب طرف کو' بالکل اُس موقع کے قریب جہاں میونسپلٹی کا واٹر ورک کا کارخانہ ہے اور پانی صاف کرنے کے حوض بنے ہیں وہ خاص' اور اس باغ کی تمام عمارتوں میں سب سے زیادہ شاندار' سلطان خسرو کا مقبرہ ہے۔[1]

ان عمارات میں سے داہنی طرف کو پہلی' بالکل اخیر' پورب جانب' خسرو کی دائمی خوابگاہ ہے۔ اور اس وقت مجھے اسی قدر کہنا ہے کہ مقبرہ سنگین و مستحکم' گنبد دار ہے۔ اس پر نہایت خوب نقش و نگار ہیں۔

قطعۂ تاریخِ وفات روضہ کے اندر گنبد کے قریب حاشیہ کے دور میں تحریر ہے۔

آہ۔ افسوس آسماں را سیرتِ بیداد شد	آرے آرے کار چوں بر ظلم آمد داد شد
زندگی زد خیمہ بیروں از دیارِ خسرمی	دید چوں بنیاد عالم را خراب آباد شد
اہلِ وا و باش اند آگاہ از فلک کا مدلتِ او	ہر کجا از شعلۂ خاکسترش برباد شد
گُلبنے ہر جا کہ بینی برگ ریزاندر پئے ست	بلبلِ ایں باغ بودن مصلحت از یاد شد
گلعذارے را طراوت چیست کاخر خارِ مرگ	از پئے چاکِ قبا صد سوزنِ فولاد شد
چوں ملب رانم حدیثے را کہ می سوزد باہ	مشکل است اما جہاں تا ہست ایں معتاد شد
آں گلِ رعنا کہ بود آرائے گلشن صد دریغ	عندلیباں را برنگ و بوئے او دل شاد شد
چاک پیراہن شد از خارِ قضا در باغِ عمر	ہم زمیں بگریست ہم از آسماں فریاد شد
شد قبا بر قامتِ مردم قبا در ماتمش	شاہ خسرو را بسوئے خلد چوں ارشاد شد
آں تنِ نازک کہ بر دے بود پیراہن گراں	در تہِ خاکِ جفا افسوس استعداد شد

---

[1] تاریخ جہانگیر' صفحہ ۴۴۲۔

شد عزیق رحمتِ حق چوں ولیِ پاک بود　　خاصِ درگاہِ خدا و ہمدم افتاد شد

سلمیٰ ارشد سالِ فوتش "فیضِ لایق" بازگو　　صفۂ جنت ز جانِ پاک او آباد شد

کتبہ سلطان سرہندی

مسٹر الیسٹ وک، مسٹر بیل اور مسٹر بیوریج نے اس قطعہ کو نقل کرکے ہندوستان کی تاریخ پر احسان کیا ہے۔ ورنہ یہ وہ جرم تھا جسکے ارتکاب سے ہمارے فارسی مورخ محترز و گریزاں رہے تھے۔ ممکن تھا کہ خسرو کی ہمدردی و ماتم پر جہانگیر و شاہ جہاں کے عہد میں کچھ دار و گیر ہو جاتی، لیکن ان کے بعد پوچھنے والا کون تھا۔ رہا اورنگ زیب۔ اُس نے تو خود خسرو اور اپنے دوسرے چچا پرویز کی بیگناہی اور اپنے باپ کی چشمِ عنایت کا ذکر ایک رقعہ میں کیا ہے۔[۵۱] مسٹر بیوریج نے اپنے ہمزبان دوستوں کی سہولت اور سمجھنے کے لئے اس قطعہ کا ترجمہ بھی کر دیا اور بعض اشعار و الفاظ پر حاشیہ (حسب ذیل نوٹ) لکھا ہے۔[۵۲]

"۱- خرمی کے لفظ سے مسٹر برن خیال کرتے ہیں کہ یہ شاہ جہاں کی طرف اشارہ ہے، جس کا نام خورم تھا۔[۵۳]

۲- شاید لفظ خسرو کی تلمیح ہے جس کے معنی آفتاب کے ہیں۔ یہ وہی لفظ ہے جو Cyrus کہا جاتا ہے۔

۳- بیل صاحب بجائے "اہل دَاوباش" کے "اہل واُوباش" لکھتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو معنی ہوں گے "لوگ عام طور پر"۔

---

[۵۱] رقعات عالمگیر، جلد اول، صفحہ ۲۲۲- نمبر ۱۳۰/۷ مطبوعہ دار المصنفین - [۵۲] جورنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن- جولائی ۱۹۰۷ء - صفحہ ۷۰۵ - [۵۳] ان صاحبوں کی ذہانت، بالغ نظری و نکتہ سنجی اس سے بھی زیادہ قابلِ احترام ہے۔ مولوی ذکاءاللہ اپنی تاریخِ ہندوستان جلد ہفتم میں سلطان خورم کی ولادت کے سلسلہ میں نقل فرماتے ہیں کہ "ٹوڈ صاحب نے اس نام کی نسبت یہ لکھا ہے کہ غالباً اصل میں وہ 'کورم' تھا جس کے معنی کچھوے کے ہیں۔ جو اس کی رجپوتنی ماں کی قوم کا نام تھا۔ یہ قیاس اس سبب سے درست نہیں معلوم ہوتا کہ مسلمانوں میں بیٹے کے نام میں ماں کی قوم کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔ باپ دادا کا نام رکھا کرتے ہیں۔"

۴۔ اوتاد۔ لغواً خیمے کی کھونٹیاں۔ pegs

۵۔ "سلمے" محبوبہ کے لئے ایک عام لفظ ہے اور شاید یہاں انھیں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایسٹ وک صاحب اس کے معنی لیتے ہیں Ask at Thou۔ تاریخ فیض لائق سے ۱۰۳۱ھ (۱۶۲۲ء) برآمد ہوتا ہے۔ مصرع اخیر سے بھی یہی پایا جاتا ہے۔ خسرو ۲۴ امرداد ۹۹۵ یعنی ۴ اگست ۱۵۸۷ کو پیدا ہوا تھا۔ اور آخر جنوری ۱۶۲۲ میں فوت ہوا۔ مرنے کے وقت اس کی عمر ساڑھے چونتیس (۳۴½) سال رہی ہوگی۔ اس کی پیدایش کا تذکرہ اکبر نامہ جلد سوم میں صفحہ ۵۲۳ پر ہے۔"

مسٹر بیوریج کا علم و فضل مسلم ہے۔ میرے دل میں اُن کی بڑی عزت و وقعت ہے۔ مرحوم نے بھی اپنے ترجمۂ مآثر الامرا میں اس ناچیز کو یاد کیا ہے۔[1] تاہم اظہار حقیقت پر مجبور ہوں کہ اُن کی بعض تشریحات کی حقیقتِ لفظی، باریک بینی یا نکتہ نوازی سے زیادہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ مجھے تسلیم ہے کہ متعدد، مطبوعہ و قلمی، متداول نیز کمیاب تذکروں کی ورق گردانی سے اُس عہد کے کسی شاعر کا نام سلمی نہیں ملتا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ عرب و عجم میں یہ کلمہ ہر معشوقہ کے لئے، فرضی ہو یا حقیقی، مستعمل ہوتا ہے۔ لیکن سلمے کی موشگافی کر کے "سل ما" Ask at Thou "اسئل انت" کہنا کسی ترکیب سے صحیح نہیں ہو سکتا۔ سل بمعنی اسئل ضرور ہے اور قرآن حمید میں بھی آیا ہے۔ لیکن مے یا ما کے معنی کیا ہوں گے؟ ان کا خیال صحیح ہو یا غلط، مگر ان کی کوشش و تلاش قابلِ تحسین ضرور ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اس کتبہ کی آج بھی وہی حالت ہے جو مسٹر بیل نے تقریباً ایک صدی اور مسٹر ڈیوہرسٹ نے چہارم صدی پیشتر دیکھی تھی۔ ڈیوہرسٹ صاحب ہمارے صوبہ کے نامور سویلین (اور وظیفہ یاب تقاً) اور مشرقی زبانوں اور علوم کے فاضل متبحر تھے۔ پچیس چھبیس برس پہلے تعلقاتِ حکومت کے سلسلہ میں الہ آباد وارد تھے تو یہاں کے کتبوں پر بھی توجہ فرمائی تھی۔ لکھتے ہیں کہ "خود خسرو کی قبر پر طویل قطعہ بارہ بیت

---

[1] جلد اول، صفحہ ۷۴۳، فٹ نوٹ بحوالہ ۵۰۳، شایع کردہ ایشیاٹک سوسایٹی بنگال، ۱۹۱۳ء۔

کاہے اور اچھی حالت میں ہے۔ بالکل صاف ہے اور پڑھا جاتا ہے۔ البتہ چوتھی بیت کے شروع کے کچھ لفظ یعنی "گلبنے ہرجا کہ" بالکل مٹ گئے ہیں۔ اس کے سوا پورا کتابہ ٹھیک اور مکمل ہے[۵۱]۔ ممدوح نے وہ کتابت یا ٹائپ کی چند غلطیاں جو بیورج صاحب کے مطبوعہ قطعہ (مشمولہ آرٹیکل) میں پائی جاتی تھیں، ظاہر کردی تھیں[۵۲]۔ تیسری سطر کے پہلے مصرع کی تصحیح کردی تھی۔ پانچویں میں خار بجائے خاک درست کردیا تھا۔ اتفاق سے ۱۹۰۷ء میں شاعر کا نام "معلمی" چھپ گیا تھا اس کو بھی ظاہر فرمادیا تھا۔ نیز طریقِ املا یا بعض حروف کو ملا کر لکھنے پر توجہ دلائی تھی جو اُس وقت (عہدِ شاہی) میں رائج تھا اور اس کتبہ میں نمایاں ہے۔ مثلاً "عندلیبانرا" بجائے "عندلیباں را" و "دلشاد" بجائے "دل شاد" و "لایق" بجائے "لائق"۔ کتبہ کی عبارت کا پچھم یعنی کعبہ کی طرف سے شروع کیا جانا' یہ بھی آپ ہی کی نظرِ دقیقہ رس کا ادراک اور نکتہ نواز قلم کا التماس تھا[۵۳]۔

دو کلموں کو ملا کر لکھنے سے نسخ و نستعلیق میں خواہ کتنی ہی دلکشی و نظر فریبی پیدا ہو جاتی ہو مگر پڑھتے وقت نگاہ کو اُلجھن ضرور ہوتی ہے۔ یہ آج کی بات نہیں۔ ایک صدی پیشتر مسٹر فرنسیس بیلفور F. C. Balfour نے یہی شکایت کی تھی۔ انھوں نے جب ۱۸۳۱ء میں شیخ علی حزیں کے خود نوشت احوال کو مدون و مرتب کرکے لندن میں بڑے اہتمام سے فارسی ٹائپ میں چھپوایا تو ایک مستقل مقالہ انگریزی میں "اعلام" Advertisement کے نام سے لکھا تھا[۵۴]۔ اور معذرت کی تھی کہ دو دو لفظوں کا ایک جا لکھنا (مثلاً آنشہر، یکسال، وغیرہ) فارسی کتابت اور قلمی کتابوں میں ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔ جن کا جدا کرنا کسی شخص، خصوصاً اہلِ مطبع کے لئے دشواری سے خالی نہیں

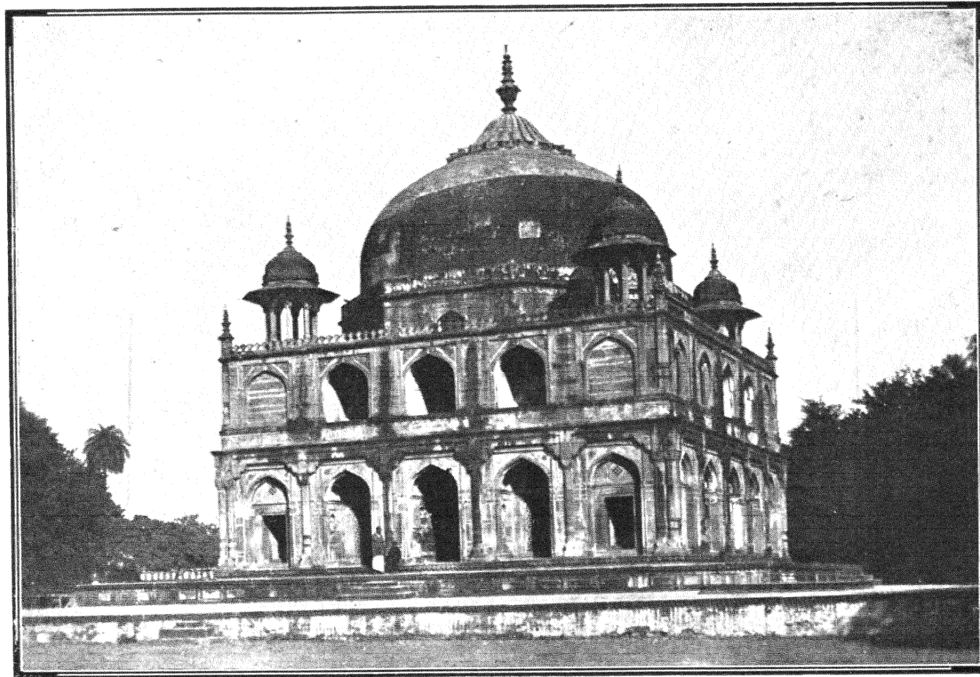
---

۵۱ جورنل رایل ایشیاٹیک سوسائٹی لندن، جولائی ۱۹۰۹ء، صفحہ ۷۴۶۔ ۵۲ جورنل رایل ایشیاٹیک سوسائٹی لندن، جولائی ۱۹۰۹ء صفحات ۷۴۶، و ۷۴۷۔ ۵۳ جورنل رایل ایشیاٹیک سوسائٹی لندن، جولائی ۱۹۰۹ء صفحہ ۷۴۸۔

۵۴ صفحہ ۳۔

(۶)

مقبرۂ شاهزادۂ خسرو



مقبول صمدنی

عمارت مقبرۂ خسرو

سر جھکا اے زندہ دل سیاحِ نیچی کر نگاہ ۔۔۔ سامنے ہے بارگاہِ خسروِ کیواں پناہ

یہ مقبرہ ایک کنارے پر واقع ہے، اُس کے بعد کوئی مقبرہ نہیں، نہ اور کوئی چیز۔ باغ کے صدر (جنوبی) دروازہ سے وہاں تک پہنچنے کے لئے کوئی مستقل راستہ بھی نہیں بنایا گیا۔ آپ کیاریوں کے کنارے کنارے یا روشوں پر ہو کر نکل جائیے۔ "رہ راست برو اگرچہ دور است" پر عمل فرماتے ہوں تو پھاٹک سے سیدھے سڑک پر ہو کر شاہ بیگم کے روضے تک (۴۰۰ اقدام) تشریف لے جائیں۔ اور وہاں سے مقبروں اور حوضوں کو دیکھتے ہوئے، خسرو کی قبر تک۔ یہ بھی کچھ دور نہیں۔ مقبروں کے باہم درمیانی فاصلہ شرقاً غرباً تیس تیس قدم ہوگا۔ سیر و تفریح کا شائق، یا آثارِ قدیمہ کا دلدادہ چار سو قدم آسانی و خوشی سے طے کر لیتا ہے۔

مقبرہ ایک مرتفع پختہ (خشتی) چبوترہ پر بنا ہے، جس کی بلندی ڈھائی فٹ (خسرو باغ کے باقی مقبروں سے ایک فٹ زائد) ہے۔ چڑھنے کے لئے پتھر کی تین سیڑھیاں موجود ہیں۔ چبوترہ مربع اور خوب وسیع و فراخ ہے، ہر ضلع اُنچاس گز۔ اس چبوترہ پر پھر ایک اور چبوترہ بلند اور سنگین نقشدار (پتھروں کا) واقع ہے۔ یہ بھی چوکور ہے، ہر پہلو چھبیس گز۔ بلندی ایک گز کے قریب۔ مقبرہ کی عالیشان تعمیر اسی پر ہوئی ہے۔ سب ملا کر کرسی کی بلندی پونے دو گز سے بھی زیادہ ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ اصلی لحد حسب دستورِ عام خام اور سطح زمین پر، تہ زمین یا تہ خانہ میں ہے۔ مقبرہ کے فرش بالائی سے نیچے یا اُس کے اندر پہنچنے کے لئے کبھی راستہ رکھا گیا تھا۔ اب مسدود ہے۔ قفسِ زندگی کے ہم جیسے زندانیوں کی رسائی وہاں تک دشوار ہے، اس لئے اُس کی صورت کشی یا موجودہ حالت کے بتانے سے معذور و قاصر ہوں۔

عمارتِ مقبرہ ایک منزل کی ہے۔ مگر دُور سے دو منزلہ معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ دروں اور محرابوں کی قطاریں جیسی اوپر ہیں، ویسی ہی نیچے بھی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اوپر والے دروازے اور بند در اتنے اونچے نہیں ہیں، جتنے کہ نیچے والے ہیں۔ مگر دونوں قطاریں ایک ہی بنیاد پر قائم ہیں۔ ہر ضلع یا پہلو میں پانچ پانچ دروازے (ہر سمت) ہیں۔ بلند سادہ وضع کی محرابیں ہیں۔ دروں کی چوڑائی چھ چھ فٹ ہوگی۔ کناروں کے دو دو دروازوں میں زینہ

ہے۔ دوسرا اور چوتھا ہر طرف کا بند ہے۔ طریقِ تعمیر اور محرابیں اور نشانات سب کے یکساں ہیں۔ محرابوں کے اندر دیوار میں طاق ہیں۔ ان کے پتھروں پر خطِ نستعلیق میں ابھرے ہوئے حروف میں اللہ اللہ کندہ ہے۔ اسی طرح زیر و بالا محرابوں پر نقطۂ مماس کے دونوں جانب کلمۂ طیبہ خوبصورت دائروں کے اندر کھدا ہے۔ گنبدِ مقبرہ کے چاروں سمت، بیچ والی محرابوں کے اوپر بڑے بڑے طاقچے ہیں۔ ان میں پتھر کی جالیاں اندر کی طرف پیوست ہیں، آپ اُن کو ایک قسم کی گیلری تجویز کر سکتے ہیں۔

سامنے کے رُخ دوسرے چبوترہ پر چڑھنے سے داخلہ کے دروازہ کے آس پاس اخیر کی دونوں محرابوں میں اوپر جانے کے لئے آمنے سامنے زینے ملیں گے۔ سیڑھیوں کی تعداد اُنیس اُنیس ہے۔ ایک خوش خیال مسلمان کا قیاس ہے کہ حروف بسم اللہ کی رعایت سے یہ عدد فرد (۱۹) اختیار کیا گیا ہوگا۔ حفاظت و نگہداشت کے لئے ان زینوں میں کواڑ لگا دئے گئے ہیں۔ نیچے شروع میں صرف پتھر کی چوکھٹ بازو ہے، اوپر پہنچ کر زینہ کے ختم پر دروازے میں کواڑ ہیں کھولنے پر ایک چھوٹی سی سطح جگہ اور اُس کے بعد ایک قسم کی تنگ کنگنی (کارنس) ملتی ہے۔ کسی وقت لوگ باحتیاط کھسک کھسک کر محرابوں میں آجاتے تھے، اور محرابوں کے پاس سے جو گھومتا ہوا زینہ اوپر گیا ہے، اُس پر چڑھ جاتے تھے یہ مرحلہ خطرہ سے خالی نہ تھا۔ اس لئے کواڑ اب بند رہتے ہیں۔ اس انسداد میں ایک مصلحت ظاہری مزار کی حرمت و تعظیم بھی کار فرما ہے۔

چھت کے چاروں کونوں پر نہایت مختصر بلکہ برائے نام منارے ہیں۔ گوشے خالی نہیں چھوٹے۔ لوہے کی سیخوں پر مختلف چڑھاؤ اُتار کے کَلَس پہنا کر ایک مخروطی شکل و ہیئت پیدا کر دی گئی ہے۔ اُس سے کچھ ہٹ کر گنبد کے متصل (دونوں کے وسط میں) ایک ایک گلدستہ بنا ہے۔ اس کو بعض معمار گومڑی اور انگریز انجینیر کی اوسکا (Kiosk۔) ترکی میں کوشک) کہتے ہیں۔ یہ چاروں نثار بانو کے روضہ کے گلدستوں سے بڑے ہیں۔ یہ ضرور خوشنما اور مشرقی تکلفاتِ تعمیر کے علمبردار و یادگار ہیں۔ ہلکے پھلکے چھوٹے چھوٹے آٹھ آٹھ ستونوں پر چھجے کے لئے پتھر لگا کر بقدر مناسب باہر نکال کر، اوپر کو ایک خوبصورت گول قبہ بنا دیا ہے۔ کم و بیش گولائی، اونچائی، اور مختلف وضع کے کلس اُس کی رونق بڑھا رہے ہیں۔ یہ ایک ہوادار خوبصورت نشیمن ہے مگر وہاں تک پہنچنا یا بیٹھ کر لطف اُٹھانا دُشواری و نزاکت سے خالی نہیں۔

مقبرہ پر ایک بہت بڑا گنبد سایہ افگن اور قبر کے پورے دَور پر محیط ہے۔ یہ عظیم الرفعت بُرج سقفِ عمارت کے وسط یا ضخیم دیوار کے اندر والے حصّے پر سے اُٹھایا گیا ہے؛ جس سے نہ صرف عمارت میں حُسن پیدا ہوگیا، بلکہ دوبالا ہوجاتا ہے۔ اور اس مقبرہ کو خسرو باغ کی تمام تعمیرات سے ممتاز و شاندار بنا رہا ہے۔ حسبِ معمول اس پر بھاری بھاری اُلٹے پتے بنے ہیں۔ چوٹی پر کلس ہے۔

عمارت تمام و کمال سنگِ سُرخ کی ہے۔ اس کے ساتھ سنگ کھٹو یعنی زرد رنگ کے مرمریں پتھروں کا استعمال و اشتمال ایک خاص کیفیت و لُطف پیدا کرتا ہے۔ جالیاں سب لال پتھر کی ہیں۔ ان کا قدرتی رنگ چونے کی سفید قلعی سے اب بے رونق و بدزیب ہوگیا ہے۔ اندر چونے اور گچ کی استرکاری ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ ایسی سنگ تراشی و نقاشی کے نمونے الٰہ آباد کی بعض پُرانی مساجد اور خانقاہوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ کوئی بے نظیر چیز نہیں۔ دیوار کی چوڑائی ٹھوس ہو یا نمائشی چودہ فٹ ہوگی۔ یہ بھی تعجب کی بات نہیں جہانگیر کے مقبرہ واقع شاہدرہ (لاہور) کی دیواروں کا آثار پانچ گز سے کم نہیں پایا جاتا۔ مقبرہ میں داخل ہونے کے لئے ہر طرف صرف ایک ایک دروازہ وسط کا کھلا رکھا گیا ہے، باقی دروازے سنگی خوشنما پھولوں اور خانہ دار جالیوں سے بند ہیں۔ فی الحال صرف دکھن رُخ کا بیچ والا دروازہ قبر تک آنے جانے کے واسطے نامزد ہے۔ باقی سمتوں کے مقفل رہتے ہیں۔ چوکھٹ بازو پتھر کے ہیں، اور کواڑ لکڑی کے، ہندوستانی طرز کے، مگر معمول سے کسی قدر زیادہ خوش وضعی کے ساتھ بنائے گئے ہیں۔ تقریباً مربع ہیں، بعض حصّوں پر کہنگی اور دیرینہ سالی نمودار ہے۔ پچھم والا یقیناً تبدیل کر کے نیا لگایا گیا ہے، اس میں بھی اصلی نمونے کی پابندی کی گئی ہے۔ مجموعی حیثیت سے بدنما نہیں قرار دئے جاسکتے۔ سُرخ لاکھی رنگ پھرا ہے۔

اسی جنوبی (وسطی) دروازے کے اوپر محراب کے اندر دو پریاں بنی ہیں۔ رنگین ہیں۔ بظاہر اُس وقت کا درباری لباس زیبِ تن ہے۔ ایک کی شبیہ پوری پوری ہے۔ جو اُڑ رہی ہے یا آمادۂ پرواز ہے۔ اور کتاب کی سی کوئی چیز ہاتھ میں لئے ہے۔ دوسری کا، صرف چہرہ اور پر بنے ہیں۔ یہ تصویریں کسی اور دروازہ پر نہیں ہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ چابکدست مصور یا نقاش نے اُس وقت کی تصویر کھینچی ہے کہ جس وقت (حسبِ روایت پیٹر منڈے صاحب) ملک الموت نازل ہوا تھا، اور شاہزادہ قرآن پڑھ رہا تھا۔ فرشتہ کی صورت اہلِ ہنر پریوں سے مشابہ بناتے ہیں۔ ہاتھ کی کتاب سے خدا کی کتاب مراد ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رحمت کا فرشتہ نذر و نیاز، درود و سلام کا پیشکش

ہاتھ میں ہے کہ ایصالِ ثواب کی اجازت لینے عالمِ بالا کو جا رہا ہے۔ کسی ممتاز مسلمان کی گور پر تصویر کا بنایا جانا ایک نئی اور تعجب خیز بات ہے۔ مگر یہاں تو وہی ع۔ سرِ مزار مجاورِ ہی نوحہ گر بھی ہے۔

حجرۂ قبر اندر کی جانب کچھ بلندی تک جہاں محرابیں ختم ہوتی ہیں چوکور بنا ہے۔ جہاں سے گنبد کا دَور دَورہ شروع ہوتا ہے، گول ہوتا گیا ہے۔ چھت بھی خوب بلند ہے۔ اس کے نقطۂ علو کے گرد ایک دائرہ اور اُس دائرہ کی ہر طرف ہشت پہل، اُبھرے ہوئے اور ایک دوسرے سے ملے، اور ملاتے ہوئے دائرے، اور پھر دائرہ بناتے ہوئے رنگین پھول ہیں۔ اُنھیں سے متصل، اُبھرے ہوئے مثلث اور قوسیں اور پھول بھی بنتے چلے گئے ہیں۔ یہ مثلثوں، قوسوں، اور دائروں کا لگاتار سلسلہ ایسا ملا جلا چلا آتا ہے، جیسے کوئی پھولوں کا جال دَرجال اوپر سے نیچے تک بچھا ہو۔ اس جال دار اور پیچ دار کام کو دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اس کام کو اصطلاحِ عمارت میں "غالب" کہتے ہیں جو حقیقۃً تمام تکلفات اور صنعتوں پر غالب ہے۔ حسرت ہے اور افسوس، کہ ناواقفیتِ فن وعدمِ ذہانت و مہارت کے باعث سے میرا قلم اس چیز کی صحیح صورت کشی سے عاجز ہے، اور اس طلسمِ رنگین کو محض ایک گورکھ دھندا بنا کر چھوڑنا چاہتا ہے۔ ورنہ اہلِ نظر کا فتویٰ ہے کہ یہ کام اور یہ رنگ آمیزی مغلوں کے عہدِ زریں کی پینٹنگ اور نگار بندی کی بہترین یادگار ہے، اور الٰہ آباد کے لئے مایۂ ناز۔

اس کارنامۂ رنگ و جمال کے نیچے، مگر محرابوں کے اوپر، چاروں سمت اشعار لکھے ہیں۔ یعنی تاریخ کا پورا قطعہ گردنے میں سیاہی سے مرقوم ہے۔ مقبرہ کے اندر اُس حصہ پر جو مربع ہے، طاقوں پر "اللہ" "اللہ" اور محرابوں کے دونوں جانب خوشخط نستعلیق میں کلمۂ طیبہ لکھا ہے (کندہ نہیں ہے)۔ در و دیوار پر چاروں طرف پھول پتے بنے ہیں۔ محرابوں اور طاقوں کے گرد کے بیل بوٹے بالخصوص دلآویز ہیں۔ سرو و شمشاد کے جھاڑ بھی ہیں۔ یہ تمام نقش و نگار پختہ شوخ رنگ، مصالحوں سے بنائے گئے تھے۔ یہاں پچی کاری نہ ہو سکی تھی تو وہ کمی مضبوط رنگ و روغن اور چینی گری اور کمالِ فن سے پوری کر دی گئی تھی۔ دست برد زمانہ سے اب یہ بھی مٹتے جا رہے ہیں۔ مرمت میں عمارت کے حفظ و بقا کا انتظام کیا جاتا ہے۔ نقوش اور گلکاریوں کے قائم اور برقرار رکھنے کا التزام مدِّ نظر نہیں رہتا۔ اسی طرح طاقوں پر جو کچھ کام تھا یا تکلفات تھے، ان کو صدیوں کے استداد اور چراغوں کے اندھیرے نے تقریباً محو و مسخ کر دیا ہے۔

مولوی سعید احمد فرماتے ہیں کہ "جہانگیری دَور کی عمارات کی آرائشوں میں صراحی اور پیالے کا عام طور سے استعمال کیا گیا ہے"[۱] میں نے ان دونوں کو اس عمارت میں خاص کر تلاش کیا۔ صراحیاں اور گلدان تو بہت سے پائے گئے۔ پیالہ کی صورت یا اُس کے مشابہ کوئی چیز نظر نہیں آئی۔

سلطان خسرو کی قبر عرفِ عام میں، اُس کی بے گناہی اور خونِ ناحق کے سبب سے پارسا اور داتا مزار کہلاتی ہے۔ مسٹر فرنیچ اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں[۲] کہ "مسلمان بادشاہوں کی قبریں عام طور پر متبرک مانی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ان کا بڑا ادب و احترام کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی نسل کا یہ ایک طرۂ امتیاز ہے کہ وہ اپنے بادشاہوں کو پیوندِ خاک ہو جانے کے بعد بھی یاد رکھتے اور بڑے خلوص و وفا کے ساتھ اظہارِ تعظیم و طاعت کرتے ہیں"۔ تربت سوا تین فٹ بلند چبوترہ پر واقع ہے۔ جس کا طول و عرض یکساں ہے، ساڑھے تیرہ تیرہ فٹ۔ تعویذ دو فٹ اونچا ہوگا، آٹھ فٹ لمبا، چار فٹ چوڑا۔ سب ملا کر قبر کی بلندی سوا پانچ فٹ ہوئی۔ اس تعویذ پر بلند قلمدان بنا ہے۔ جو قبر کے وسط میں ہے۔ سینہ کی جانب مائل نہیں بنایا گیا ہے۔ چبوترہ کی بغلی دیواروں میں تین تین دلہے خوشنما چدروں سے محصور ہیں۔ قبر پر ایک انچ موٹا، مضبوط چونے کا پلاسٹر ہے، جس کو اُس وقت کے طریقہ پر پالش کر کے جِلا دے دی گئی تھی، سنگِ مرمر کے مثل چمکنے لگا۔ مگر مرورِ زمانہ سے اب اس میں وہ آب و تاب باقی نہیں رہی، ماند ہوتی جاتی ہے۔ دھندلاپن اور خاکستریت چھا گئی ہے۔ ایک دو جگہ مصالحہ بھی اُکھڑ گیا ہے، جس سے یہ کیفیت و حقیقت کُھل گئی۔ ورنہ اس لطیف و نازک صناعی کی بدولت ہر دیکھنے والا سنگِ مرمر کا دھوکا کھا جاتا ہے۔

تعویذ کے باہر چاروں گوشوں پر چودہ چودہ انگل کے فصل پر چوکور سوراخ ہیں۔ خادم و مجاور کہتے ہیں، کہ کچھ زمانہ پہلے یہاں چاندی سونے کے ستون نصب ہوتے تھے، جو زبردستوں کی درازدستی کے نذر ہو گئے۔ اوراقِ تاریخ شاہد ہیں، کہ انھیں نقرئی کھمبوں پر مخمل کے زریں شامیانے کھڑے کئے جاتے تھے۔ پادری منڈے صاحب نے لکڑی کا خطیرہ (کٹھہرہ) اور سچی سیپیوں اور موتیوں کی جڑائی یہیں دیکھی تھی۔ آج اُس کا نشان بھی باقی نہیں، نہ کوئی پتہ دینے والا ہے۔ ع۔ حسرت سے دیکھتا ہوں در و بام کی طرف۔ خیال رہے

---

[۱] تاریخ آگرہ یعنی مرقع اکبرآباد، صفحہ ۶۔ [۲] صفحہ ۶۷۔

کہ اس قسم کی قیمتی تندروں، نفیس دباریک دستکاری کی چیزوں اور آبنوس پر لطیف و نازک پچی کاری کے چپر کھٹوں کا مقابر پر چڑھانا اور لگانا صاحبِ مقدرت لوگوں میں عام طور پر رائج تھا جس کے قابل دید نمونے شیخ سلیم چشتی کے روضہ (فتحپور سیکری)[1] اور خواجہ نظام الدین اولیا کے مزار (دہلی)[2] پر اب تک موجود اور اپنے اولوالعزم عقیدتمندوں کی یادگار ہیں۔

خسرو کی قبر کے اِدھر اُدھر (پورب پچھم) نسبتہً چھوٹی چھوٹی دو قبریں شہ نشینوں میں ہیں۔ایک داہنے پہلو میں ہے، دوسری بائیں میں۔ان پر کوئی کتبہ نہیں جس سے صاحبِ قبر کا پتہ چل سکے۔ایک کے پتھر پر صرف اللہ اللہ کندہ ہے۔مجاوروں کا بیان ہے کہ پورب والی قبر مرد (لڑکے) کی ہے، پچھم والی لڑکی کی ہیئت کذائی بھی اس قول کی تصدیق کرتی ہے یعنی صرف ایک پر قلمدان موجود ہے۔کس کا لڑکا تھا اور کون سی لڑکی؟ یہاں کیسے پہنچے؟ کیا نام تھا؟ تاریخ کی زبان اس بارہ میں خاموش ہے۔الہ آباد میں مدت تک شہنشاہ زادے گورنری پر متعین ہوتے رہے تھے۔ممکن ہے کہ اُن میں سے کسی کا جگر گوشہ ہو۔یا شاہ عالم ثانی کے قیام الہ آباد کے طویل زمانہ میں کوئی بچہ دفن ہوا ہو۔

قبر کے دکن ایک تنگ کھڑکی ہے جس کے اندر کوئی زمین دوز سا راستہ بتایا جاتا ہے مگر اس وقت بند ہے۔غیر مستند و غیر محقق روایت ہے کہ اکبر اکبر کے قلعہ تک جاتا تھا جس کو بعض مصلحتوں سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اربابِ حل و عقد نے مسدود کرا دیا۔میرے نزدیک سرنگ کا قصہ بداہتہً غلط اور ایک بے بنیاد افسانہ ہے۔یہ راستہ نیچے قبر والے تہ خانے یا تہ زمین کسی حد تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہوگا۔اسی طرح ایسے قابل احترام مقام یعنی قبر کے قریب کی کھڑکی، یقیناً اس مصرف کی نہیں ہو سکتی۔وہ جائے ادب ہے نہ کہ آمد و رفت عوام کی جگہ۔یہ بھی مان لیا جائے کہ باغ سے قلعہ تک اندر اندر جانے کے لئے کسی راستہ کی ضرورت سمجھی گئی تھی تو اس تجویز و تکمیل کے واسطے شاہ بیگم کے مقبرہ کی تعمیر کا زمانہ مناسب تھا نہ کہ وہ وقت جب بدنصیب و فراموش شدہ خسرو سپرد خاک کیا جا رہا ہو۔

امپیریل گزیٹیر آف انڈیا کے ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی یہ مختصر تحریر[3] بجز، اُدرست ہے کہ مقبرہ

---

[1] سیاحتِ مقبول صفحہ ۹۰۔ سفرنامہ مسٹر فرینچ، ص ۱۲۰۔ [2] آثار الصنادید ص ۳۵۔ مفتاح التواریخ ص ۱۲۴۔ تحفۃ الابرار، ص ۳۲۔ تذکرۃ العابدین، صفحہ ۱۶۱۔ [3] مطبوعہ ۱۸۸۳ء، جلد اول، ص ۱۹۸ نیز، صفحہ ۱۸۳، مطبوعہ ۱۸۸۵ء۔

پر ایک خوبصورت گنبد دار عمارت تاج کے طرز کی بنی ہے۔ اس کے اندر پھولوں اور چڑیوں کی تصویریں ہیں۔"
بے شبہ مقبرۂ خسرو اپنی وُسعت وُسعت اور عالی شان بُرج کے لحاظ سے یا یوں کہیے کہ بہ حیثیتِ مجموعی، اپنے ہمسایہ مقابر بلکہ ضلع الٰہ آباد کی تمام متفرق شاہی عمارتوں سے نمایاں اور بلندی و خوبصورتی میں ممتاز ہے۔ لیکن تاج کے ساتھ اُس کی مماثلت کیا ہو سکتی ہے۔ تاج، دُنیا کا تاج، اُس کے سالہائے دراز بعد بنا ہے۔ مقبرۂ خسرو کے لئے اُس کی نظیر شاید بے نظیر شہرت و نام کی وجہ سے دی گئی ہو۔

خسرو نے بھری جوانی میں جان دی تھی۔ فرزانگانِ فن کا تجربہ ہے کہ جس درخت کی شاخیں بہار میں اُٹھان کے وقت کاٹ دی جاتی ہیں، وہ خوب بڑھتا اور پھیلتا ہے۔ خسرو کی نو دپودہ تو برابر قطع ہوتی رہی۔ بڑھنے نہیں پائی۔ مگر شاید اس کلیہ کے ماتحت مزارِ خسرو کے خادم و مجاور یا مقبرہ کے محافظ اچھی عمر پاتے رہے ہیں۔ موجودہ خادم اسّی سال کا ایک پیر مرد ہے۔ اس کا پیشرو اس کا بڑا بھائی سو برس کا ہو کر دنیا سے رخصت ہوا۔ مگر اب باغ میں کسی خادم کا دخل نہیں، نہ کوئی پشتینی مجاور ہے۔ مشاہرہ یاب سرکاری ملازم، باغبان و فراش ہیں جو محکمۂ آثارِ قدیمہ و باغات سے تنخواہ پاتے ہیں۔

خسرو اور اُس کی مادرِ گرامی نژاد کے مقابر کے گرد و پیش کی آبادی اور تعمیراتِ شاہی کا سلسلہ 'خلد آباد' کہلاتا ہے۔ گورِ سلاطین کے متصل بستیوں کا یہ نام تبرکاً و تیمناً اور جگہ بھی رکھا گیا ہے۔ زمان و مکان کی قید نہیں۔ دکن میں اورنگ آباد کے قریب شہنشاہِ عالمگیر کے روضہ کے اطراف کو بھی یہی شرفِ تسمیہ[1] حاصل ہے۔ سرکاری گزٹیئر کی روایت ہے کہ خسرو کی جلاوطنی کی حالت میں خلد آباد کے سادات نے اُس کی رفاقت کی تھی مگر اپنے ماخذ یا کسی

---

[1] ایلورا کے غاروں سے پون میل، اور دولت آباد سے سات آٹھ میل کے فاصلہ پر حضرت شاہ برہان الدینِ غریب کا روضہ (مرقدِ مبارک) مسلمانوں کی مشہور زیارت گاہ ہے۔ صفر ۷۳۸ھ (۱۳۳۷ء) میں انتقال فرمایا تھا جس کے پائین دفن ہونے کو نظام الملک آصف جاہ نے بھی سعادت و برکت کا باعث سمجھا تھا۔ یہ مقام پہلے روضہ کہلاتا تھا اور اورنگ زیبِ خلد مکان دفن ہوا، تب سے 'خلد آباد' کہلاتا ہے۔ مآثر الامرا (ترجمہ مسٹر بیوریج) صفحہ ۲۳۴۔ اسی خلد آباد میں دوسرا متبرک مقام شیخ زین الدین اولیا خلیفۂ شیخ برہان الدین کا مقبرہ ہے جنھوں نے سلطان محمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں ربیع الاول ۷۷۱ھ (۱۳۶۹ء) میں رحلت کی تھی۔ روضۃ الاولیا، صفحات ۳۴ و ۴۰۔ و منتخب التواریخ صفحات ۴۱۴ و ۴۹۵۔ و تاریخ آگرہ صفحہ ۱۶۔ و قاموس المشاہیر، صفحہ ۱۲۶۔ [2] سلسلۂ جدید، جلد ۲۳، صفحہ ۹۶۔

تاریخ کا حوالہ نہیں دیا، جس سے ان شرفا کے ناموں اور کارناموں کا علم اور عصرِ حاضر میں ان کے اخلاف کی تحقیق و تصدیق ہوسکے نہیں جانتا کہ زمانہ بجلائے وطن سے لکھنے والے کا مقصود کیا ہے۔ خسرو کی پوری زندگی میں کچھ دن بھی ایسے نہیں پائے جاتے، جن پر اس کی تعریف صادق آسکے۔ بچپن اور کچھ جوانی دادا جان (اکبر) کے دربار اور سایۂ شفقت میں امن و عافیت، عیش و فراغت کے ساتھ گزری۔ اس کے بعد باپ کی نظربندی و نگرانی میں رہا۔ بھاگا۔ لڑا۔ پکڑا گیا۔ اور عمر بھر قید و حبس میں رہا۔ بھائیوں کا بھی خون کرایا۔[1] خسرو کی تمام کارزارِ حیات اور کارناموں میں اس کے رفقا، اور جاں نثاروں کی فرد میں جو گرفتار اور بعد ازاں لقمۂ نہنگِ اجل ہوتے رہے کسی "الاباسی"[2] کا نام نہیں ملتا۔

کہہ چکا ہوں کہ شاہزادہ کی عظمت اور اُس کے روضہ کی حُرمت عوام میں اب بھی باقی ہے۔ برسات کے موسم میں یہیں اس کے مزار پر ہر سال میلا لگتا ہے۔ شیرینی چڑھائی جاتی ہے۔ رات کو روشنی ہوتی ہے، گانا بجانا بھی۔ خسرو باغ کا بڑا پھاٹک جو سینہ قواعد و احکام کے بموجب معمولاً بند کر دیا جاتا ہے، اس شب کو کھلا رہتا ہے، ہمیں رات اس پھاٹک اور اس باغ کے لئے شبِ برات (رونق اور چہل پہل) کا باعث ہوتی ہے، جنت نصیب شاہزادہ کی بدولت باغ کے دن بھی پھر جاتے ہیں۔ اسی رات میں پھاٹک پر نعل چڑھائے جاتے، کیلوں سے جڑے جاتے ہیں۔ پہلے سونے چاندی کے بھی ہوتے تھے، جن کی دیکھنے والی آنکھیں اور شہادت دینے والے لوگ اب تک باقی ہیں لیکن کفایت شعاری کے خیال یا حقیقتاً افلاس کے مارے اب عموماً لوہے کے رہ گئے ہیں۔ اس اجتماع میں حسبِ [illegible] ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے یا ہوتی تھی، مسلمانوں کی کم خوش اعتقاد مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے یہ ایک قسم کا سالانہ عُرس سمجھا جاتا ہے، اور ہندوؤں کے دستور یا رسوم کے اعتبار سے، ملک کی بول چال میں میلا۔ گزیٹیر والوں نے اپنی میلوں کی فہرست میں اس کو شامل نہیں کیا ہے۔ بعض اور میلے بھی جن کی نوعیت بالکل مذہبی رہ گئی۔ بے نظر انداز کر دئے ہیں۔[3] بہر صورت حاجت مندانِ عقیدت کیش خسروِ شہید کے بابرکت مزار سے اب بھی منتیں مانتے، مرادیں مانگتے، اور سب کچھ پاتے ہیں۔ مشعلیں اور روشنی ساتھ لاتے اور قبر پر حسبِ حیثیت نذریں چڑھا جاتے ہیں۔ رات کے آٹھ نو بجے تک ایک اچھا خاصہ صاف ستھرا، تہری

---

[1] سوانح عمری اورنگ زیب (سلسلۂ مشاہیر فرمانروایانِ ہند) صفحہ ۸۷۔ [2] ڈسٹرکٹ گزٹیر جدید، جلد ۲۳، صفحہ ۶۶۔

نیز داتی، بلا مُسلا، مجمع دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ البتہ یہ جماؤ روز بروز کم ہوتا جاتا ہے۔ کچھ تو اعتقادات میں فرق آنے کی وجہ سے، اور کچھ مخلوق کے اپنے اپنے اشتغالات اور موجودہ اختلافات کے باعث سے۔

حتیٰ کہ اب شہر کے اعالی و ادانی بھی اس سے کم واقف ہیں کہ بھادوں میں جب کہ یہاں سے پچھم جانب کچھ فاصلہ پر سلیم سرائے کے قریب، ماموں بھانجے کا میلہ دیو گیری میں، ہندوؤں کا لگتا ہے، تو اسی کے ساتھ اسی مہینہ (یعنی اگست) کی پہلی دو جمعراتوں کو یہاں بھی ہوتا ہے۔ مقامی شہرت واہمیت گھٹ جانے کے سبب سے، یا یہ کہ حسبِ دستورِ سابق، غریب مجاوروں کو کسی قدر اہتمام و اعلان کرنا پڑتا ہے۔ پھاٹک پر نقارہ بجایا جاتا ہے، لوگ آجاتے ہیں، اور شاہزادہ سے عقیدت و محبت رکھنے والے جمع ہو کر اُس کی تربت پر دو پھول چڑھا دیتے ہیں۔ آپ جائیں گے اور کتنی ہی مدت گزری ہوگی تو بھی کچھ نہ کچھ باسی ہار اور بکھری ہوئی پژمردہ و افسردہ کلیاں وہاں دیکھیں گے۔

سطوتِ تیموریاں، اے خسروِ عالی وقار مرجعِ انس و ملائک آج ہے تیرا مزار
پھول رحمت کے ہوا کرتے ہیں روز اُس پر نثار تو ہے زندہ، عظمتِ باقی ہے تیری زندہ دار

جب ترے روضے کی جانب رُخ کیا کرتے ہیں ہم
اک "سلامِ عجز" تجھ کو کر لیا کرتے ہیں ہم

پھاٹک پر چڑھائے اور جڑے ہوئے نعل نووارد تماشائی کے لئے سب سے پہلے جاذبِ توجہ ہوتے ہیں۔ یہ مرادیں بر آنے والوں کے حُسنِ عقیدت کے نگینے ہیں۔ ان کی تعداد اب بھی کافی ہے۔ ان میں ہر قسم اور ہر نمونے کے موجود ہیں۔ بڑے بھی، چھوٹے بھی۔ گھوڑوں کے بھی، بیلوں کے بھی۔ حتیٰ کہ جوتوں کے بھی، ہندوستانی اور انگریزی دونوں وضع کے۔ حال کے لگائے ہوئے نعلوں میں تازگی اور چمک بخوبی نمایاں ہے۔ اس فلزاتی (معدنی) نذر و نیاز یعنی آہنی نعلوں سے منت پوری کرنے کی کوئی معقول اور جلد باور ہو جانے والی وجہ نہیں بتائی جاتی۔ مختلف روایتیں زبان زد ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور و مقبول قصہ یہ ہے کہ مرزا خسرو کا گھوڑا نہایت عمدہ، اچھی نسل اور شریف ذات کا تھا۔ کسی نازک موقع پر اُس نے کود کر جان بچائی اور داد رفاقت دی تھی۔ یہ صحیح ہو سکتا ہے۔ خسرو کے مقبرے کے سامنے یا اُس کے دامن میں ہو ایک سطح پست سا چبوترہ (کچھ کم ایک بالشت اونچا) چار

گز دو فٹ لمبا، ساڑھے تین گز چوڑا) مع ایک مختصر نشانِ تعویذ کے بنا ہے وہ اسی غازی مرد کی قبر بتائی جاتی ہے۔

میں اس روایت کو باور کرنے اور اس رسم اور اس کی اصلیت کو اس طرح ماننے سے معذور ہوں۔ خادموں کی حاضر جوابی اور فضول گوئیوں کی شکایت ہمیشہ سے چلی آتی ہے حتّٰی کہ آج سے ایک صدی پیشتر مسٹر فرنیچ[۱] بھی اس کو برداشت نہ کر سکے تھے میں نے تو اس قسم کے نعل اکثر قلعوں، پرانی عمارتوں اور مشہور روضوں پر دیکھے ہیں۔ ان کی نسبت مجھے معلوم ہوا تھا کہ کواڑوں کی استواری و استحکام اور آہن پوش بنانے کے لئے لگائے گئے ہیں۔ ان کی خوش اندامی اور جامع و مانع ہیئت کو ان کی برتری و انتخاب کی سب سے بڑی سند سمجھا جاتا ہے۔ فتحپور سیکری کی درگاہ کے بلند دروازہ[۲] (جس کو مسٹر فرنیچ سیاح وسیع النظر، تمام عالم کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ جلالت و عظمت والا پھاٹک اور ایک عجیب و غریب چیز لکھتا ہے[۳]) کے سیکڑوں موٹے موٹے اور بھاری بھرکم نعل اسی خیال کے سوید ہیں۔ یہی صاحب لکھتے ہیں[۴] کہ "قلعۂ بھرت پور کے ہیبت پھاٹکوں پر پیتل کی موٹی موٹی چادریں جڑی ہوئی ہیں۔ ان پر بڑی بڑی کیلیں اور اسی دھات کے لٹو لگے ہیں"۔ میں نے بھی دیکھا ہے کہ دروازہ کی یہ شان اب تک قائم ہے۔ روضۂ ممتاز محل کے عالی شان دروازہ کو ملاحظہ فرمائیے۔ جس میں بڑے بڑے ہشت دھاتی کواڑ لگے ہیں۔ ان کی بے تعداد پیتل کی کیلیں کیسا لطف دکھاتی ہیں[۵]۔ قلعۂ آگرہ کے باہر، بیرونی فصیل کے نیچے، جنوبی پھاٹک کے پچھم امر سنگھ دروازہ پر اُس بہادر راجپوت کے گھوڑے کی مورت بہتوں نے دیکھی ہوگی۔ اس شریف نژاد جانور کے متعلق واقعات اور اس کی جولانیوں کی داستانیں بہت سی زبانوں پر ہیں، کتابوں میں بھی لیکن خسرو کے کسی خاص گھوڑے کا ذکر یا اس کا کوئی کارنامہ صفحاتِ روزگار پر درج نہیں۔

مولوی خدا بخش خانِ مرحوم کے ذخیرۂ نوادر یعنی پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ میں بادشاہوں اور شاہزادوں کی تصاویر کا ایک نایاب البم محفوظ ہے۔ اس مرقع میں خسرو کی شبیہہ بھی ہے۔ وہ جوانی کی عمر اور اپنے زمانے کے چست مردانہ لباس میں اونچی بنا ہوا ایک چاق چوبند گھوڑے پر سوار ہے۔ ہاتھ پر کلائی کے قریب، ایک شاہباز[۶] متمکن ہے۔ وہ توسنِ راہوار، فرضی و خیالی نہ ہو، تاہم اُس کا وجود، اور الٰہ آباد میں آمد تخیلات و

---

[۱] سیاحت نامہ بالائی ہند، ۱۸۳۸ و ۳۹ء، صفحہ ۱۱۸۔ [۲] مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۶۳۔ [۳] سیاحت نامہ صفحہ ۱۲۱۔ [۴] ایضاً، صفحہ ۱۱۱۔ [۵] معین الآثار، صفحہ ۶۷۔ [۶] اکبری مراسم میں دسہرے کو باز کا ہاتھ پر لینا ضروری اور شگونِ نیک سمجھا جاتا تھا۔ (قصص ہند، حصہ دوم، صفحہ ۹۶)۔

موہومات سے خالی نہیں۔ میں اپنی تحقیق و تفحص کے نتیجہ اور قرائن و قیاسات کو اُس قبر نما چبوترہ کے حالات میں درج کروں گا، جس کا ذکر ابھی کیا ہے۔

اس قدیم رسم کے پرستار کچھ ہم ہی نہیں۔ ایشیا کے حدود سے نکل کر آپ یورپ میں بھی اس کو پائیں گے۔ عہد برطانوی کی تاریخِ حکومتِ ہند میں محمودِ غازی کے مقبرے کے دروازوں[1] کا غزنین سے لے آنا ایک عظیم معرکہ شمار کیا جاتا ہے۔ لارڈ ایلن برا نے اپنے اعلان میں اس کو بڑی اہمیت[2] دی تھی۔ انگریزوں کی سعیِ تحقیق، کاوش اور دقتِ نظر مسلّم ہے۔ مسٹر ڈبلیو سمپسن W. SIMPSON نے دیکھا۔ شبہ کیا اور قوی وجوہ و دلائل کے ساتھ لندن ڈیلی نیوز کو لکھا کہ یہ پھاٹک تو پٹن سومناتھ والے ہو نہیں ہو سکتے۔ مسٹر فرگوسن نے خوردبین سے جانچ کی۔ تشخیص فرمایا کہ "صنوبری دیودار کی لکڑی ہے۔ حالانکہ تمام تاریخوں سے ثابت ہے کہ سومناتھ کے مندر کے کواڑ چوبِ صندل کے تھے۔ جن پر اعلیٰ درجہ کا نفیس کام تھا۔ جن کی بڑی شہرت تھی۔ جن کو محمود اپنی فتحمندی کے اظہار کے لئے گجرات سے کابل لے گیا تھا۔ جو اُس کی وفات کے بعد اُس کے مقبرہ میں لگا دیئے گئے تھے۔ بیشک یہ کواڑ بھی نئے نہیں ہیں۔ کہنگی اور دست بردِ زمانہ کے بہت سے بدیہی آثار ان پر نمودار ہیں۔ دِلے چور چور ہو گئے ہیں۔ بہت سا

---

[1] ان کواڑوں کے متعلق مسٹر بیل نے بعض باتیں اپنے علم و آگاہی اور بعض منشی موہن لعل کے حوالہ سے لکھی ہیں۔ (مفتاح التواریخ، صفحہ ۵۴)۔ مولوی سعید احمد تحریر فرماتے ہیں کہ انگوری باغ (قلعہ) کے ایک دالان میں محمود غزنوی کے مقبرہ کا صندلی پھاٹک رکھا ہوا ہے، جسے ابتدا میں غلطی سے سومناتھ کے مندر کا پھاٹک سمجھا گیا تھا (تاریخ آگرہ، ص ۸۰) ..... چنانچہ اس مضمون کا اشتہار انگریزی، اُردو اور ہندی میں اس پر چسپاں ہے (صفحہ ۹۷)، مسٹر سے دی ویدیا لکھتے ہیں "یہ قصہ کہ محمود سومناتھ کے مندر کے صندل کے پھاٹک غزنین لے گیا تھا، عصرِ موجودہ کے فُضلا اعتبار نہیں کرتے۔ وہ پھاٹک جس کو انگریز ۱۸۴۲ء میں افغانستان فتح کرنے کے بعد لے آئے تھے قلعۂ آگرہ میں نذرِ غفلت پڑے ہوئے ہیں۔ (زمانۂ وسطیٰ کا ہندوستان، جلد سوم، ص ۹۲)۔

[2] گورنر جنرل لارڈ ایلن برو نے ملکہ کو لکھا تھا کہ "سومناتھ کے مندر کے پھاٹکوں کو میجر جنرل ناٹ NOTT لے آئے ہیں ..... " لارڈ ایلن برو جہاں پناہ کی اطلاع کے لئے اُس ایڈریس (بیان) کی نقل بھیجتے ہیں، جس کو شائع کرنے کا وہ عزم رکھتے ہیں۔ تاکہ اس بات کا اعلان ہو جائے کہ مندر کے پھاٹک

(بقیہ صفحۂ آئندہ پر)

آرائشی کام ضائع ہوچکا ہے۔ بدنما بھدی مرمت لکڑی کی چھپڑیوں، ٹکڑوں اور لوہے سے کر دی گئی ہے۔ (سب سے بڑھ کر یہ کہ) مشرق و مغرب کے اتصال کی عجیب و غریب کڑی یہاں بھی جلوہ فرما ہے، یعنی ان پرانے کواڑوں پر گھوڑوں کے نعل کثیر تعداد میں کیلوں سے جڑے ہیں۔[۱]"

یورپ کے ہنرمندوں نے کامل غور و فکر اور تجربہ کے بعد اپنی کثیرالاجتماع محفلوں اور درباروں کے لئے ایمفی تھیئٹر اور کونسل ہال کے واسطے نعل کی شکل کی عمارتیں پسند و اختیار فرمائی ہیں۔ کیسا اس انتخاب و قرارداد میں آپ مقبرۂ خسرو کی نعل والی رسم کی ذرا سی بھی جھلک دیکھتے، یا اس سے کچھ دور کا لگاؤ تجویز فرماتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) پھر لگا دئے جائیں گے۔ ان پھاٹکوں کا فیروز پور سے سومناتھ تک لوائے جانا ایک بڑی قومی ٹرائمف (فتح و ظفر) ہوگی۔ اور ان کو ہندوستان واپس لے آنے سے تمام رعایا میں گورنمنٹ عزیز ہوجائے گی۔" اسی وقت ڈیوک آف ونگٹن DUKE OF WELLINGTON کو لکھا "بخلاف اس کے ہندو مسرور ہیں۔ اس لئے میری دانست میں یہ نادانشمندی ہوگی کہ جب ہم کو ایک عشر کی عداوت کا یقین ہے تو باقی ۹/۱۰ کی پُر جوش و سرگرم امداد کیوں نہ حاصل کریں، جو وفادار ہیں۔ اپنی کامیابیوں اور مندر کے پھاٹکوں کی بازیافت کو بڑھ سے بڑھ کر دکھاؤں گا اور اس کو بڑی ہی طور پر ایک بڑی فوجی نعمندی بتاؤں گا۔ مگر خوب جانتا ہوں کہ ہندو اس کی بڑی قدر کریں گے اور اس کو خود اپنے اور اپنے مذہب کی حفاظت کا ضامن مسلمانوں کے خلاف سمجھیں گے۔ وہ تمام لوگ جو ہندوستان کو اچھی طرح جانتے ہیں مجھ سے کہتے ہیں کہ فی الحقیقت اس کا بہت بڑا اثر ہوگا اور میں بھی خیال کرتا ہوں کہ ضرور ہوگا۔" (عیسوی قوت کا ہندوستان میں عروج، جلد پنجم، صفحہ ۴۸۔ فٹ نوٹ)۔ ڈاکٹر ہنٹر بھی اس پھاٹک کو جعلی اور مصنوعی اور جھوٹی شیخی بازی کا آلہ بتاتے ہیں۔ دو کواڑ نہیں ہیں، ایک ہی ہے۔ (صفحہ ۱۹۷، مختصر تاریخ اہل ہند، مطبوعہ ۱۸۸۶ء۔ A BRIEF HISTORY OF THE INDIAN PEOPLE-W.W. HUNTER. 1886) منشی معین الدین اپنی تاریخ تاج آگرہ میں اس کی تائید کرتے ہیں۔ (صفحہ ۳۴۷، انگریزی)۔

صفحہ ہٰذا: [۱] فریزر صاحب کا سفرنامہ، صفحہ ۱۲۹ نوٹ، آگرہ و نواحِ آگرہ۔

رہی معذرت و عفو خواہی کی ضرورت نہیں۔ بعض شرق نواز شرفا کی خفیف سی غلط رائی و غلط آرائی سے اختلاف و گریز پر بر خود غلط "مقبول" مجبور تھا۔ ورنہ ان فرزانگانِ فرنگ کی تحقیق پسندی اور علم دوستی کا کون نا احسان شناس قائل نہ ہوگا، جو غیر ملک، غیر قوم، غیر زبان کی ایسی گراں ارز خدمت فرما رہے ہیں۔ اپنے اوقاتِ عزیز کی ساعاتِ فرصت میں جتنا غور کرتا ہوں، ان کی کرامتِ نفس، کمالِ علمیت و عزت میرے دل میں بڑھتی جاتی ہے۔

خسرو کا تذکرہ نویسِ حال، خسرو کے اولین تاریخ نگار یا اُس کو حیاتِ جاوید بخشنے والے شاعر کا بھی شکر گزار و منت پذیر ہے۔

ہائے شوقِ جستجو کو کیا کروں   لب پہ بے قصد اُس کا نام آ ہی گیا

یہ تسلیم ہے کہ سلمٰی کا نام شعرا کے زمرہ میں پایا نہیں جاتا۔ میں نے خود بہت سے مطبوعہ و مخطوطہ تذکروں میں تلاش کیا۔ ناکام رہا۔ چند وسیع النظر کرم فرماؤں اور اساطینِ علم و فضل کو بھی زحمت و تکلیف دی۔ کوشش و کاوش فرمائی۔ سعی نامشکور ثابت ہوئی۔ نواب والاجناب مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی، صدر یار جنگ بہادر، اپنے ملاطفۂ عالی میں ارقام فرماتے ہیں۔

"میں اوّل مرتبہ الٰہ آباد اُس وقت حاضر ہوا تھا جب کہ مسلم بورڈنگ کا سنگِ بنیاد مولوی سمیع اللہ خانِ مرحوم کے زیرِ اہتمام رکھا گیا تھا۔ اُس موقع پر پہلی دفعہ خسرو باغ دیکھا۔ تاریخ پڑھی۔ نقل کی۔ اب تک محفوظ ہے۔ کبھی کبھی نظر بھی پڑ جاتی ہے۔ جب سے اب تک سلمٰی ارشد والا مصرع کھٹکتا ہی رہا۔ گرامی نامہ کو پڑھ کر مزید کاوش کی۔ بے ڈھنگا ہی رہا۔ ایک شاہزادے کی تاریخِ فوت "فیض لائق" واقعۂ رحلت سے کیا مناسبت رکھتی ہے۔ میرا قاصر ذہن اس کے فہم سے عاجز ہے۔ پھر ارشد، بازگو کی کیفیت۔ بھرتی ہی بھرتی ہے۔ اب لفظ "سلمٰی" سامنے آتا ہے۔ بفتحِ سین، بکسرِ میم تخلص ہے، تو یہ نسبت کس طرف ہے۔ کوئی مناسب معنی سَلِمٰی کے نظر سے نہیں گزرے۔ بکسرِ سین و میم ہے، تو البتہ سِلم بمعنی صلح یا اسلام کی طرف نسبت ہو سکتی ہے۔ بہرحال پیشِ نظر تذکرے اس تخلص سے خالی ہیں۔ ریاض الشعرا، داغستانی، مخزن الغرائب، تذکرۂ حسینی دوست سنبھلی، مرآۃ الخیال، صبحِ گلشن دیکھے گئے۔ کسی میں یہ تخلص نہ پایا۔ اگر سلمٰی ہے تو

کسی بی بی کا تخلص ہوسکتا ہے۔ کیا ضرورت ہے کہ جس کی تاریخ ایک معتوب شاہزادے کے مقبرہ پر کندہ ہوجائے وہ بانام و نشان شاعر بھی ہو، قابلِ تذکرہ۔ رہا یدِ بیضا میدانِ سخن، وہ مجموعۂ خرافات ہے سوائے تخلص کے کوئی اور لفظ یہاں آہی نہیں سکتا۔"

میں ان جامع تذکروں کی فہرست میں شیخ محمد افضل، سرخوش دہلوی کی مبسوط و مشہور تالیف "کلمات الشعراء" کو بھی داخل کرنا چاہتا ہوں، جو ۱۰۹۵ھ میں شروع ہوکر، ایک قرن ممتد کی مسلسل محنت و عرق ریزی سے بارھویں صدی کے عشرۂ دوم میں مکمل ہوئی تھی۔ اس میں جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے عہد کے تمام مستند شعراء کے حالات مندرج ہیں۔ سرخوش کا دعویٰ ہے [۱]

داخلِ اہلِ سخن نیست بہ پیشِ دانا   آنکہ نامش نہ بود در کلمات الشعرا

وہ بھی سَلمیٰ کو اہلِ سخن کی صف میں جگہ نہیں دیتے، نہ نام لیتے ہیں۔ میر غلام علی آزادِ بلگرامی نے اپنے نقوشِ اوّلین یدِ بیضا اور سروِ آزاد میں، جو فی الجملہ جامع اور ہر صنف کے شعراء کے احوال پر حاوی ہیں سَلمیٰ کا ذکر نہیں کیا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ تاریخ گوئی کی حیثیت سے اُن کا پایہ اُس وقت (۱۰۳۱ھ = ۱۶۲۲ء [۲] میں) یا اُس کے بعد بھی چنداں بلند نہ رہا ہو۔ شاید یہ بھی اعترافِ حقیقت ہوگا کہ ایک بادشاہزادہ کی موت کی تاریخ "فیضِ لائق" کسی طرح قابلِ داد نہیں ہوسکتی۔ لیکن میرے نزدیک دوسرا مصرع (تاریخ) بلکہ پورا قطعہ، زبان کی لوچ، خیال کی برجستگی، بیان کے زور، حسرت و درد کا قصہ سُنانے، دل کی چوٹ دکھانے کے اعتبار سے کس سے کم ہے۔ جس نے ان کے عنفوانِ شباب میں باوجود نومشقی و کمی مہارت ایک مہتم بالشان بادشاہی عمارت، ایک عالی مرتبت سلطان کے مرقد پر جگہ پائی۔ واقعہ یہ ہے کہ سَلمیٰ نے ایک دوسری حیثیت سے شہرت و نمود حاصل کی تھی۔ صاحبِ

---

[۱] خزانۂ عامرہ، صفحہ ۲۶۳، نولکشوری۔

[۲] تاریخ جہانگیر، از گلیڈون، صفحہ ۱۶۰۔

"مجمع الواصلین"، سید[1] محمد فاضل، ان بزرگ کا پورا نام و نژاد، ملا سلمیٰ ہندی سرمست خاں اور سالِ وفات ۱۱۰۷ھ بتاتے ہیں[2]۔ یہ اورنگ زیب عالمگیر کا زمانہ تھا۔ ظاہر ہے کہ خسرو کے مرنے کے وقت سلمیٰ محض نوخیز یا جوان رہے ہوں گے۔ ساتھ ہی دلخستہ و جگر ریش، زمانہ کی سردی و گرمی سے کم آشنا، تلخی ناچشیدہ، دنیا سے دل ہٹائے گوشہ گزیں بسر کرتے ہوں گے، زہد و ریاضت میں مشغول۔ اپنے قطعہ میں وہ دردبھری باتیں کہہ گئے ہیں جو سن رسیدہ باکمالوں کو بھی نہیں سوجھتیں۔ وہ خدمت بجا لائے ہیں جس کی انجام دہی کی جرأت کسی جاہ طلب اہلِ قلم کو نہیں ہو سکتی تھی۔ سید فاضل کے ایسے مرتبہ شناس نے جب دنیا بھر کے مشائخ اور اہل اللہ کو یاد کیا اور ہر ایک کی وفات کی تاریخیں نکالیں، تو اس شہرت و نمود سے گریزاں و نفور انسان کے متعلق تین قطعے لکھے۔ سب کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں، یہ شعر کافی ہیں:۔

(۱) سلمیٰ ہندی کہ سخن سنج بود — رفت ز دنیا بہ رُباطِ بہشت

(۲) مستِ مئے صلاح سلمیٰ بود ست — تاریخِ وصالِ او ازیں نیز بداں

(۳) چہ در دنیا و عقبیٰ جز خدا و مصطفیٰ ہرگز — ندارد التجا و تکیہ بر کس سلمیٰ ہندی

(۴) بماہِ صوم تاریخ وصالِ آں سخن آرا — بگفتا ہاتفم بودہ خدا رس سلمیٰ ہندی

پہلے اور چوتھے شعر کے پہلے مصرعوں کو میں نے کئی بار پڑھا۔ "سخن سنج" و "سخن آرا" سلمیٰ کی شاعری کا درجہ مجھے نہایت ممتاز و رفیع نظر آتا ہے۔ ان کے صلاح و تقویٰ، بزرگی و مشیخت کے ساتھ ان کا کمال و کلام بھی مسلم ہے۔ "ملا" کا لقب اُس دَور میں اکابرِ علما و فضلا کے لئے مخصوص تھا۔ کون تھے؟ کہاں کے تھے؟ یہ مراحل ہنوز جلبابِ خفا میں ہیں۔ قرینہ مقتضی ہے کہ بلادِ دکن کو ان کے توطن اور بود و باش کا شرف حاصل رہا ہوگا۔ اگر اطرافِ الہ آباد کے ہوتے تو ان کی شہرت و بلند نامی کا کچھ نہ کچھ

---

[1] ابو عبداللہ محمد فاضل بن سید احمد بن سید حسن، مظہر الحق ترمذی، اکبر آباد کے باشندے تھے۔ ۱۱۰۸ھ (۱۶۹۶ء) میں وفات پائی۔ اپنی کتاب میں ۱۱۰۸ھ تک کے مادہائے تاریخِ وفات لکھے ہیں۔ (قاموس المشاہیر، ص ۵۰)۔

[2] صفحہ ۱۱۹، مطبوعہ ۱۲۶۵ھ، مصطفائی۔ و صفحات ۱۵۱ و ۱۵۲، مطبوعہ کلکتہ، ۱۲۴۹ھ۔ نیز گلستانِ مسرت، صفحہ ۳۹۸، مطبوعہ ۱۲۶۷ھ۔

نشان اب تک ضرور باقی رہتا۔[1]

---

[1] فقیر ہیچمداں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ خانِ سرمست کا یہ تخلص یا لقب نسبی امتیاز سے وابستہ تھا، یا انتسابی سے۔ نسب کا علو و تعلق فریدوں کے پسر بزرگ سَلْم تک پہنچاتا ہے اور انتساب کی برتری و اعزاز صوفیۂ صافیہ کے ایک مشہور اور پرانے خانوادے "سَلمی" تک، جس کو غالباً صحابی جلیل حضرتِ سلمان فارسی سے شرف اختصاص حاصل ہے۔ اس سلسلہ کے چند برگزیدہ شیوخ کے نام مولانا فریدالدین عطار کی لاجواب کتاب، اور درویش صفت، صوفی مشرب، پروفیسر نکلسن کے مایۂ ناز کارنامے "تذکرۃ الاولیا" (مطبوعہ لائیڈن، ہولانڈ، ۱۹۰۵ء عیسوی) میں جا بجا ملتے ہیں۔ (۱) عطاءِ سلمی، ان میں متقدم الایام پائے جاتے ہیں، جنھوں نے بعض بعض باتیں عبداللہ مبارک کے حوالہ سے اور بعض خود ابراہیم ادہم سے نقل کی ہیں، (صفحہ ۹۶)۔ (۲) احمد سَلمی ذوالنون کے معاصر و معتقد تھے، (صفحہ ۱۲۱)۔ (۳) عبداللہ سَلمی نے وصیت کی تھی کہ میں جب مروں، تو ابوحفصِ حدّاد کے پاؤں پر میرا سر رکھ دیا جائے۔ جن کا حضرتِ جنید بھی ادب کرتے تھے (صفحہ ۳۳۱)۔ ان صورتوں اور اعرابوں کے علاوہ جو نواب محتشم نے تحریر فرمائے ہیں، اس لفظ کی ایک اور صورت بھی ہو سکتی ہے۔ "سُلَمی"۔ ابو عبدالرحمٰن السُّلَمی۔ (ت ۴۱۲ھ، تمہید انگریزی ا۔ ۱۰) جس کی زندۂ جاوداں مثال موجود ہے۔ مگر وزنِ شعر اس کو قبول نہیں کرتا۔ انھیں بزرگ ابو عبدالرحمٰن محمد بن حسین السُّلَمی النساپوری کا ملّا عبدالرحمٰنِ جامی نے نفحات الانس کے "طبقات الصوفیہ" میں بڑے احترام و ادب سے ذکر فرمایا ہے۔

متصوفین کے سوا عرب کے شاعروں میں بھی یہ نام و لقب اور اس لفظ (سَلْم) کے بعض مشتقات و مصروفات و منسوبات بہت محبوب و رائج تھے۔ نامور کاتب عبداللہ بن مسلم ابن قتیبہ کی "طبقات الشعراء" (مطبوعہ لیڈن، ۱۹۰۲ء) میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ جیسے عُقبہ بن سَلْم (صفحہ ۴۷۷) اور سعید بن سُلْم صفحہ ۵۳۱)۔ وغیرہ۔ اَشجع السُّلَمی (۵۶۲) کے حالات سے واضح ہے کہ سلمیوں کا خاندان برامکۂ عجم کا قرابت دار تھا۔

صحابۂ پاک میں بھی حضرت عمرو عتبہ سلمی اور عتبہ بن عبد السلمی کے نام ملتے ہیں (سیرۃ النبی صلعم، مجلد سوم، صفحات ۳۸۲ و ۳۳۵)۔ نیز حجاج بن علاط السلمی (المستطرف، جزو دوم، صفحہ ۱۳۳)۔ اور طلحہ بن معاویۃ السلمی کا (المنار، مجلد ۳۲، جزو ۹، صفحہ ۷۰۹)۔

خُسرو کی رفیقۂ زندگی

مبادا کہ ان اوراق کا کوئی بے حس و بے درد پڑھنے والا اس کے ذکر پر چونک پڑے، اور لکھنے والے پر بیراہ روی و فضول نگاری کا الزام لگا دے۔

مقامی راوی اور موروثی خادم اسی بیگم کی نسبت کہتے اور یورپ کے بعض اہلِ قلم گمان کرتے ہیں کہ خسرو باغ میں دفن ہے۔ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اپنے مشاہدہ یا کسی قرینہ یا سند و حوالہ سے اس مجسمۂ شرافت و عفت خاتون کے ساتھ خسرو باغ کا انتساب ثابت پانے سے معذور ہوں۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا نام کیا تھا؟ کہاں پیوندِ خاک ہوئی؟۔ اس قدر جانتا ہوں

جس پر اب تک ناز کرتی ہیں خواتینِ وطن ایک ایسی ہی امانت خاک کی خلوت میں ہے

اُس نے اپنے مظلوم شوہر کا ساتھ تو عمر بھر دیا! لیکن نور جہاں اور جہانگیر یا ممتاز محل اور شاہ جہاں کی طرح بظاہر بعد مرگ یکجائی اور خاوند کے برابر جگہ پانے سے محروم رہی۔

تاہم خسرو کی ذات کے ساتھ اس ملائک سرشت عورت کی وابستگی و وفاشعاری کا ذکر نہ کرنا میرے نزدیک معصیت کوشی اور انصاف کا خون کرنا ہے۔ خسرو باغ کے متعلق یہ اوراق لکھتے وقت عالم تخیل و تحقیق میں مَیں نے مصائب و مصاعب کے بہت سے کوہ و وادی طے کئے، اور دوسروں کی زندگی کے دردناک سوانح اخذ و نقل کرنے سے پہلے اپنے اوپر بھی ویسے ہی روحانی رنج و اندوہ انگیز کئے ہیں۔ اپنے دل اور دل کے جذبات کو بارہا مجروح کرنا پڑا ہے۔

پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے اور میری زندگانی کا وہی سامان بھی ہے

وہ مورخ جنھوں نے خسرو کا ذکر خلافِ مصلحت و مآل اندیشی نہیں سمجھا ہے، اس نیک اور خیر مجسم عورت کی شوہر پرستی، وفاداری و غمگساری کے مداح و رطب اللسان ہیں۔ اس کی حق گزاری و فرض شناسی کی داستانیں سُنانے کا یہاں موقع نہیں "تذکرۂ خسرو" کا بے پایاں میدان سامنے ہے، وہ اس کے بیان

وتفصیل کے لئے کفایت کرے گا۔ پھر بھی وہ قلم (راقم خسرو باغ کا) جس نے خسرو اور اُس کے اَلم وغم اور مصائب وشدائد کا کم وبیش ذکر کیا ہے، یہاں بھی اُس کی عفت مآب شریکِ حیات اور اُس کی رفاقت وجاں نثاری کے اظہار سے کیسے خاموش رہ سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نازپروردہ امیرزادی نے اپنے ناشاد ونامراد شوہر کی جس قدر خدمت کی، کنیزانہ محنت وغمخواری فرمائی، اور اُس کے لئے مصیبتیں اُٹھائی تھیں، اُس کی نظیر کم ملتی ہے۔ مقابلہ کی بات نہیں، نہ کسی پہلو سے پورا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ ہمارے ملک کی مایۂ نازش، وفاکوش ووفاکیش خاتون، سیتاجی کی مصیبت جھیلنے کا زمانہ تو معین اور پورے چودہ سال تھا۔ لیکن خانِ اَعظم کی بیٹی اپنے جہیز میں انبوہ انبوہ رنج واندوہ لائی تھی، جس نے مرتے دم تک پیچھا نہیں چھوڑا۔ جس کی بدولت یا یوں کہوں کہ جس کے جبلّی تعلق، پدری محبت اور فطری خیراندیشی ونیک سگالی کی وجہ سے باپ[١]، بیٹی اور داماد، تینوں، ہمیشہ موردِ عتاب ومبتلائے آفات رہے ہیں۔

یہ بیگم خانِ اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کی دختر تھی[٢]

اس کی شرحِ زندگی ہے جنتِ اہلِ نظر وہ بھی اک عنوان، تاریخ نسائیت میں ہے

اس بیگم سے خسرو کے بچوں کا ذکر جہانگیر نے کئی جگہ محبت کے ساتھ کیا ہے[٣]۔

خانِ موصوف کثیرالاولاد تھے۔ ان کے چھ بیٹے تھے اور اتنی ہی بیٹیاں[٤]۔ لڑکیوں کے نام کسی مورخ نے تحریر نہیں فرمائے۔

١٠١٠ھ (١٦٠١ء) میں جب کہ خسرو باغ نصب ہو چکا تھا، آقا رضا اُس کا پہلا ٹھک بنا رہا اور اپنے ولی نعمت آقا اور اپنے نام کا پتھر لگا رہا تھا، شہنشاہِ اکبر نے مرزا عزیز کو ہفت ہزاری وشش ہزار سوار کا منصب عطا فرمایا جو اُس وقت بادشاہ زادوں کے سوا کسی کو نہیں ملتا تھا۔ اکبر اُس کی سپہ سالاری ووزارت

---

١ ترجمۂ مآثرالامرا، صفحات ٣٢٧، ٣٢٨، ٣٢٩۔ ٢ منتخب اللباب، حصہ اول، صفحہ ٢٣٣۔ دربار اکبری، صفحہ ١٥٥۔ و۔ ترجمۂ تزک، جلد اوّل، صفحہ ٢٥٨۔ نوٹ۔ وصفحہ ٣٢٧۔ ٣ تزک، صفحہ ١٧۔ و۔ ترجمۂ تزک، صفحہ ١٤٩۔ دوسرے موقع پر صفحہ ٣٧۔ و ترجمہ ١٥٣۔ نیز۔ مآثرالامرا، جلد اول، صفحہ ٦٨٩۔ و۔ دربار اکبری، صفحہ ٢٧٧۔ ٤ مآثرالامرا، جلد دوم، صفحہ ٦٩٣۔ و۔ ترجمۂ انگریزی، صفحہ ٣٢٦۔

سے زیادہ اُس کے دل و دماغ کی خوبیوں اور ذاتی قابلیت کی قدر اور اُس کے دودھ شریک بھائی ہونے کا لحاظ و احترام کرتا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ عزت بخشی کہ اُس کی بیٹی کی نسبت شاہزادۂ خسرو سے کر دی[1]۔

شایانِ شان تیاریاں ہوئیں۔ آرایش و اہتمام شاہانہ تھا۔ ساچق کا سامان گراں بار و گراں قدر بھیجا گیا۔ ایک لاکھ روپیہ نقد تھا۔ دربار کے بڑے بڑے اُمرا اور حاشیہ بوسان بساطِ دولت یہ تحائف و ہدایا لے کر مرزا کے گھر گئے[2]۔ بیگم کی آمد اور تزک و احتشام کی تفصیل سے "خسرو باغ" کے صفحات کو "دامنِ گلچیں" بنانا نہیں چاہتا۔ چھوڑتا ہوں۔

پرتگیزی سیاح اور اہلِ قلم پیٹرو ڈیلا ویلے ۱۶۲۳ء میں اس ملک میں وارد ہوا تھا۔ کچھ دن قیام بھی کیا تھا۔ اُس نے اپنے وطن اور وطن کے اربابِ حل و عقد کو متعدد خطوط، وقتاً فوقتاً یہاں کے حالات میں لکھے تھے۔ شاہنشاہِ جہانگیر کے فرزندوں کے نام بھی ضروری حالات و تفصیلات کے ساتھ گنائے ہیں۔ لکھا ہے کہ "سب سے بڑا سلطان خسرو، بڑی اُمیدوں والا شاہزادہ، رعایا میں نہایت محبوب تھا[3]۔" سیاحِ موصوف اور اُن کے رقعات کے پہلے محشی مسٹر جی ہیورز G. HAVERS نے خسرو کی درد بھری داستان اور قید میں جان دینے کا واقعہ اضافہ فرمایا ہے[4]۔ پیٹرو صاحب نے یہ بھی لکھا تھا کہ "میں یہ واقعات گجرات میں بیٹھے ہوئے قلمبند کر رہا ہوں[5]۔"

ورودِ ہندوستان اور یہاں کے حالات جاننے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔

"نور محل کو یہ خیال گزر رہا تھا کہ سلطان خسرو باپ کی جگہ تخت پر بیٹھے گا۔ وہ چاہتی تھی کہ اُس کا پایہ بھی مضبوط رہے اور زور اچھی طرح قائم ہو جائے۔ اُس نے ۱۰۳۰ھ (۱۶۲۱ء) میں شہریار[6] سے شادی کر دینے کے قبل، اپنی بیٹی مہرالنسا[7] سلطان خسرو کو دینا چاہی۔ مگر وہ کبھی رضامند نہ ہوا۔ اس کی وجہ خواہ یہ رہی ہو کہ خسرو کی ایک بی بی موجود تھی، جس سے وہ خوب محبت کرتا تھا اور جس سے بے وفائی و بے مہری پر وہ کسی طرح

---

[1] دربارِ اکبری، صفحہ ۲۷۴۔ [2] دربارِ اکبری، صفحہ ۲۷۴۔ [3] سیاحت نامہ، جلد اول، صفحہ ۵۵۔ [4] ایضاً، صفحہ ۵۲، نوٹ ۲۔ و صفحہ ۵۹، نوٹ ۲۔ نیز صفحات ۵۶ تا ۵۹۔ [5] ایضاً، صفحہ ۵۔ [6] معین الآثار، صفحہ ۳۔ [7] بیلس ڈکشنری، صفحہ ۵۴۔ و رسالہ مخزن لاہور، صفحہ ۴۲، نمبر ۲، جلد ۱۴، بابتہ ماہ نومبر ۱۹۰۷ء۔

تیار نہ تھا، خواہ اس سبب سے کہ وہ نور محل کی بیٹی کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ حتیٰ کہ خسرو جب زندان خانۂ بلا میں تھا تو اُس کے پاس متواتر و متوالی پیغام پہنچے تھے کہ نور محل کی لڑکی سے شادی کر لوگے تو فوراً رہائی پا جاؤگے۔ مگر با ایں ہمہ وہ کسی طرح اس فرمائش کی بجا آوری کے لئے راضی و آمادہ نہیں ہوا۔[۱]"

"بخلاف اس کے اس کی بی بی نے، جو ایک دوسرے کو بے حد محبت و پیار کرتے تھے، خسرو کے پاس خدمت گزاری کے لئے قید خانہ میں رہنے کی رخصت و اجازت حاصل کرلی، اور شوہر کے پاس وہاں چلی گئی۔ وہ جب تک وہاں رہا یہ بھی اُس کے ساتھ برابر رہی۔ یہ بیگم اُس کو ہمیشہ ترغیب دیتی رہی کہ نور محل کی دختر سے شادی کرلو تاکہ تم کو ان صعوبات و مصائب سے نجات تو حاصل ہو جائے۔ خود جہاں تک کہ میری ذات کا تعلق ہے، میں تسلیم و رضا اور صبر و شکر کے ساتھ فیصلۂ تقدیر پر قناعت کروں گی اور لونڈی بن کر آپ کی خدمت بجا لاتی رہوں گی۔ آپ کو آزاد پانا اور اچھی حالت میں دیکھنا میری آرزوئے حیات ہے۔ لیکن شاہزادہ پر اس کی عاجزی والتجا کا کبھی کچھ اثر نہیں ہوا، نہ اس نے کسی طرح منظور کیا۔ اُس کا ایک ہی جواب تھا

اسیری زیر پروازِ گلزار بہتر — بکنجِ قفس بال و پر می فروشم

اس طرح وہ قید خانہ میں اپنی وفا گستر و محبوب زوجہ کے ساتھ رہا۔ یہاں تک کہ ستمگاروں کی کینہ وری اور اُس کے باپ کا غیظ و غضب بھی عاجز آگیا۔[۲] ....."

اسی عہد کا مشہور و وسیع الاطلاع جہاز ران و سیاح ولیم فنچ WILLIAM FINCH اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ "اس جلیل القدر گھرانے کے لوگوں کی عجیب کیفیت تھی۔ ان کا مذہب مختلف ہو، مدارج و مراتب مختلف ہوں، مگر عقلِ انسانی اور قوتِ حاسّہ سب کی یکساں تھی۔ ظاہری اختلافات خواہ کیسے ہی ہوں، افعال پر اُن کا اثر نہیں پڑتا تھا۔ اتحادِ روح و اصل نمایاں تھا۔ نتیجہ ایک ہی رہتا تھا۔ بدنصیب و ناشاد خسرو کی بی بی کا عمر بھر اصرار رہا کہ زندان خانہ میں شوہر کی رفیق اور مصائب و آلام میں شریک و غمگسار ہو کر رہوں۔ یہ قید خانہ کیا تھا؟ ایک تاریک برج۔ جہاں قیدیوں میں سے اگر کوئی مر جاتا اور بادشاہ سلامت کہیں باہر ہوتے تو اُن کی واپسی تک لاش بے گور و کفن رہتی۔ دروازہ

---

[۱] سیاحت نامہ، صفحہ ۵۶۔ [۲] ایضاً، صفحہ ۵۷۔

ہر وقت بند رکھا جاتا تھا۔"[۱]

حُسنِ انجام ظاہر ہے۔ بقول ایک امریکن مصنف مسٹر بے آرڈ ٹیلر BAYARD TAYLOR کے "مشیت الٰہی نے عشق و محبت کو وہ شے مرحمت کر دی، جس کے عطا کرنے سے کبھی انکار فرمایا تھا۔" یا جیسا کہ منشی معین الدین رقم پرواز ہیں "تقدیر نے محبت کا ارمان پورا کر دیا۔"

کہا جاتا ہے کہ اسی بیگم سے خسرو کی اولاد بھی زیادہ تھی۔ لیکن تاریخ کی زبان اس کی تفصیل یا ناموں کے بتانے سے قاصر، کم سے کم خاموش، پائی جاتی ہے۔ جہاں تک پتہ چلتا ہے خسرو کی اولاد میں صرف دو کو کچھ عمر یا شہرت نصیب ہوئی تھی۔ (۱) سلطان داور بخش عرف مرزا بُلاقی[۲]۔ (۲) ہوشمند بیگم[۳]۔

اس وفاشعار و مہرپرور عفیفہ کے سوا تاریخ کے صفحات پر، خسرو کے تعلق سے تین بیگموں کا نام اور آتا ہے۔

(۱) مقیم خاں ولد مہتر فاضل، رکاب دار (سولہی) کی بیٹی۔ اس سے ایک لڑکا بھی تھا۔ جس کی پیدائش کا ذکر جہانگیر نے تزک میں کیا ہے[۴]۔

(۲) دخترِ مرزا مظفر حسین صفوی۔ شاہزادہ خسرو کے ساتھ اس کی شادی رچائے جانے کی تصوّر

---

۱ کین کی مغل ایمپائر، صفحہ ۱۱۷۔ ۲ جہانگیر کی وفات ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ (بحساب قدیم ۸، اکتوبر ۱۶۲۷ء) کو ہوئی۔ آصف خاں وزیر نے اپنی مصلحت و بیتیں بینی سے داور بخش کو قید و بند سے نکالا اور لاہور میں تخت پر بٹھا دیا۔ تین ماہ بعد جب شاہجہاں کی سریرآرائی و فرماں روائی کا اعلان کیا تو داور بخش کو مع اُس کے دونوں چچازاد بھائیوں (ایک بہنوئی) کے جمادی الثانی سال مذکور میں قتل کرا دیا۔ الفنسٹن صاحب کی یہ روایت کہ داور بخش موقع پاکر بھاگ نکلا اور ایران پہنچ گیا تھا جہاں سفیران ہولسٹین HOLSTEIN نے اُس کو دیکھا تھا، چنداں مستند نہیں بتائی جاتی۔ ۳ اس شاہزادی کی شادی مرزا ہوشنگ پسر مرزا دانیال سے ۱۰۳۵ھ (۱۶۲۵ء) میں ہوئی تھی۔ اس کے دو سال بعد شاہ جہاں کے حکم سے ہوشنگ کو مع اور بھائیوں کے جام شہادت پلا دیا گیا تھا۔ (بیلس ڈکشنری، صفحات ۸۰ و ۱۰۸ و ۱۲۸ و ۲۴۸ و ۲۴۹)۔ ۴ تزک صفحہ ۱۵۷۔ و۔ ترجمۂ تزک، صفحہ ۳۲۱۔

پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ قرابت اکبر کی تجویز تھی۔ اور اُسی کے سامنے عمل میں آئی۔[1]

(۳) والیٔ ٹھٹھہ کی ہمشیر۔ غالباً مرزا غازی ترخان[2] کی بہن تھی، مرزا جانی بیگ[3] کی بیٹی۔ یہ نسبت بھی اکبر نے ٹھہرائی تھی۔ معلوم نہیں کہ تقریب کی نوبت پہنچی تھی یا نہیں۔ سعید خاں کی عرضداشت کے جواب میں جہانگیر نے اس سگائی کا ذکر کیا ہے۔ شادی کے لئے اصرار پایا جاتا ہے[4]۔

اے نیک دل پڑھنے والے! اس کریم النفس شریف الخصائل عورت، اس ہمہ تن شوق ایثار سرتا بہ پا اُلفت و وفا خاتون کی یاد میں چار آنسو بہالے۔ اور رحمت وسلام کے پھول نثار کر۔ اور سُن۔ اے دل میں درد رکھنے والے انسان! سُن!!

چار دن کی سیر ہے دُنیا کے مہماں کے لئے ہے قبائے زندگی چاکِ گریباں کے لئے
چاہیئے کچھ نورِ عبرت چشمِ انساں کے لئے ورنہ چشم و گوش تو یکساں ہیں حیواں کے لئے

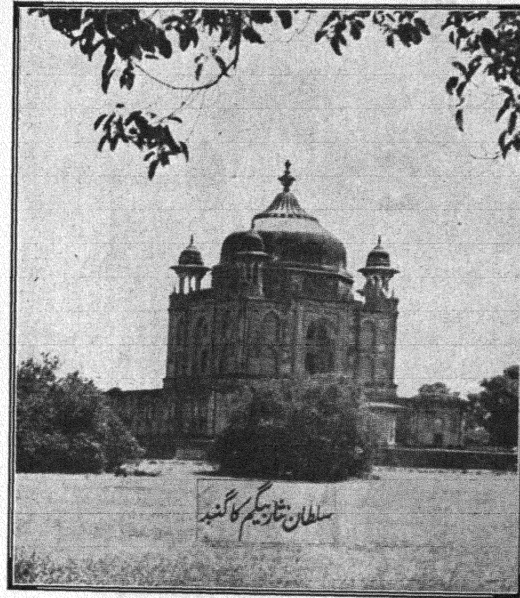
گاہ گاہے باز خواں ایں دفترِ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

---

[1] رسالہ "ادبی دنیا"، لاہور، اپریل ۱۹۳۱ء، صفحہ ۲۷۲۔ بحوالۂ بادشاہ نامہ۔ [2] ترخان ایک پرانا ترکی اعزازی لقب ہے۔ اس خطاب کے لوگ ادائے ٹیکس سے معاف تھے۔ پروفیسر آرمی نیس وام بے ری A. VAMBERY نے اپنی تاریخِ بخارا (مطبوعۂ لندن) میں اس کے منگولین اشتقاق اور وسعتِ حقوق و استحقاق اور حدودِ اختیارات کے متعلق پوری تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ [3] طبقاتِ اکبری، از ملا نظام الدین ہروی، صفحہ ۶۳۸۔ و منتخباتِ ابوالفضل علامی، مطبوعۂ نولکشور ۱۸۷۹ء، صفحہ ۱۴۴۔ و رشحات الفنون، قلمی، ورق ۲۰۰، از سید امین الدین خان ہروی۔ و سیر المتاخرین، صفحہ ۱۷۲۔ و مسلمان تاجدارانِ ہند، جلد اوّل، صفحہ ۸۰۔ [4] تزک، صفحہ ۸، سال اوّل۔ و ترجمہ، صفحہ ۲۰۔

(۷) (۸)

دو بے قبر کے مقبرے خسرو باغ میں





مقبول صمدني

دو بے قبر کے مقبرے

مقبرۂ شاہ بیگم اور مقبرۂ خسرو کا ذکر تو ہو چکا۔ اب خسرو باغ کی دو عمارتیں رہ جاتی ہیں، جن میں قبر تو نہیں مگر مقبرے کہلاتی ہیں۔ ایک تو شروع ہی سے آباد نہیں ہوئی نہ کسی کے جسد خاکی نے اُس میں ٹھکانا پایا تھا۔ دوسری آباد ہو کر ویران ہو گئی۔ مدفن تھی۔ مسکن بنی۔ یہاں ان کی تعمیری خوبیوں یا خامیوں اور کوتاہیوں سے بحث کرنا مقصود نہیں، بلکہ ان کی صورت و کیفیت دیکھ کر اُسی پہلو پر نگاہ ڈالنا مدِنظر ہے، جو علمی و ادبی یا کسی نہ کسی معنی میں تاریخی سمجھا جاتا ہے۔ خدا کرے کوئی باکمال صاحبِ قلم اس طرف توجہ فرمائے اور صفحاتِ کاغذ پر باقی رہ جانے کے لئے باقی اشعار کو بھی تحقیق کر کے پورا کر دے۔

سُلطان نثار بیگم کا گنبد

ہر سمت اور ہر حساب سے یہ دوسرا مقبرہ ہوتا ہے، اور اُن دونوں مقبروں کے درمیان واقع ہے۔ یعنی اس کے ایک جانب خسرو کا مقبرہ ہے اور دوسری طرف شاہ بیگم کا۔ اس کا فصل ہر ایک سے بقدر تیس (۳۰) قدم کے ہوگا۔ نخلبندانِ زیب و تزئین کے زرپاش فیض بخش ہاتھوں کی بدولت یہ فصل (رقبہ سرزمین) بھی خالی اور بیکار نہیں چھوٹنے پایا، بلکہ اس میں دونوں طرف دو خوشنما سنگین حوض، ہشت پہل بنادئے گئے ہیں۔ کبھی صاف شفّاف پانی سے لبریز رہتے تھے۔ پاس کے کنوئیں آب رسانی کرتے تھے۔ فوارے چلتے تھے۔ آبشار اور نالیوں کا ظاہری سلسلہ و انتظام تو اب تک وہی باقی ہے، مگر بے سود و بے مصرف۔ اپنی حالت اور کس مپرسی پر آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے۔ حوض خشک پڑے ہیں، فوارے بند۔ البتہ ان میں کچھ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے تو گُلکار و منقوش رُخام کی جگہ سادہ پتھر لگتا ہے یا صرف چونا۔ پیوند بدنما ہوتے ہیں اور نازیب۔

یہ مقبرہ وسطِ باغ میں بڑے دروازے کے مقابل ہے۔ یہی کرنیل نیویل کے حساب سے دوسرا ہوتا ہے[۱]۔ اور مسٹر بیل کی تحریر سے تیسرا[۲]۔ اوروں کے مقابلے میں کسی قدر چھوٹا ہے۔ یہ جسمانی کمی ایک معنوی حیثیت یعنی اس کے بلند و سبق آموز اشعار و قطعات کی افراط و کثرت سے پوری کردی گئی تھی۔ زمانہ کے جفاکار ہاتھ نے ان کو بھی برقرار و قائم نہ رہنے دیا۔

پریاگ ہینڈ بک میں لکھا ہے کہ پورب والا مقبرہ خسرو کا ہے اور تیسرا اس خاندان کے اور بچّوں کا[۳]۔ مولفِ کتاب کی مُراد کس تیسرے (مقبرے) سے ہے۔؟ وہ بچے کون تھے؟ اور کس کس کے؟ ان کی قبریں کہاں تھیں؟ کیا ہوئیں؟ ان کا نہ لکھنا، لکھنے والے کی عدمِ واقفیت اور کوتاہیِ تحقیق کو عالم آشکار کرتا ہے۔

---

[۱] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، صفحہ ۲۰۳۔ [۲] مفتاح التواریخ، صفحہ ۳۳۵۔ [۳] صفحہ ۵۳۔

یہاں کے بعض خادمانِ بلاخدمت و بلامخدوم اس کو خسرو کی بیوی کا مقبرہ بتاتے ہیں، اُس کا نام لیلیٰ بیگم دختر شاہنواز خاں۔ تاریخ کی زبان اس بارے میں قطعاً خاموش، اور اس کی تصدیق سے عاجز ہے۔

انگریز مورخوں اور اُن کے خوشہ چیں، ہمارے اہلِ وطن کی روایت یہ ہے کہ یہ مقبرہ خسرو کی ایک بہن نے ۱۰۳۴ھ (۱۶۲۵ء) میں اپنے لئے تعمیر کرایا تھا، مگر اتفاق سے بیگم نے کسی اور جگہ انتقال کیا، اور وہیں دفن ہوئی، اس لئے یہاں اُس کی جگہ خالی رہی۔ بہت سے اشعار گنبد کے اندر اور باہر لکھے تھے جو گردشِ روزگار سے مٹ گئے ہیں۔[۱]

ڈسٹرکٹ گزیٹیر والے بھی اس کی تائید، یا اسی کو نقل، کرتے ہیں۔ مسٹر اسٹیل اس کو جہانگیر کی راجپوت ملکہ کی بیٹی کی قبر بتاتے ہیں۔[۲] کرنیل نیول فرماتے ہیں کہ اس میں بہت سے کتابے لگے ہیں لیکن اکثر اب شکستہ حالت میں ہیں۔[۳]

اگر یہ قول اور ان غرزانگانِ فرنگ کا قیاس صحیح ہے تو یہ شاہزادی، شاہ بیگم کی بیٹی تھی[۴] اور خسرو کی ہمشیر۔[۵] شاید انھیں تعلقاتِ قلبی کے داعیے اور محبت و خون کے جذبے سے اُس نے الہ آباد میں پیوندِ خاک ہونے کی آرزو کی ہوگی۔ یا خاکِ پاکِ پریاگ کی کشش رہی ہو۔ شریف الملک معتمد خانِ محمد ہادی تزک (کے دیباچے) میں[۶] اس کا نام سلطان نثار بیگم لکھتے اور خافی خانِ محمد ہاشم منتخب اللباب میں صرف سلطان بیگم تحریر کرتے ہیں۔[۷] تزکِ جہانگیری اور تذکرۂ خسرو (مولفۂ راقم) سے پایا جاتا ہے کہ وہ جہانگیر کی پہلی بیوی سے تھی اور اُن کی اولاد میں سب سے بڑی یعنی پہلوٹھی۔[۸] مسٹر پرائس Price تاریخِ جہانگیر میں ناقل ہیں کہ سلطان نثار بیگم خسرو سے سال بھر بڑی تھی۔ ایک سال پیشتر فوت ہوئی۔ اُس نے خسرو باغ الہ آباد میں اپنے لئے مقبرہ بنوایا تھا، مگر وہاں دفن ہونا نصیب نہ ہوا۔ اُس نے

---

[۱] مفتاح التواریخ، مولفۂ مسٹر بیل، صفحہ ۲۲۵۔ ڈاکٹر فوہرر، صفحہ ۱۴۸۔ قاموس المشاہیر، صفحہ ۲۹۷۔ [۲] گزیٹیر سابق ضلع الہ آباد، ۱۸۸۴ء، صفحات ۱۳۸ و ۱۶۹۔ [۳] گزیٹیر جدید، صفحہ ۲۰۳۔ [۴] ادیماق، مغل، صفحہ ۳۸۴۔ [۵] جہانگیر نامہ خواجہ ابوالحسن معتمد خانِ بخشی، صفحہ ۲۷۷۔ قاموس المشاہیر، صفحہ ۱۳۹۔ [۶] تزک جہانگیری، صفحہ ۷۔ دیباچۂ تزک، صفحہ ۷۔ دیباچۂ تزک انگریزی، صفحہ ۱۹۔ [۷] جلد اول، صفحہ ۲۴۵۔ [۸] ترجمہ از مسٹر بیوریج، صفحہ ۱۵۔

۴ شعبان سنہ ۱۰۵۶ھ مطابق ۵ ستمبر سنہ ۱۶۴۶ء کو وفات پائی اور اپنی خواہش و وصیت کے مطابق اپنے دادا کے مقبرے واقع سکندرہ میں سپردِ خاک کی گئی۔[۱] قاموس المشاہیر میں بھی یہی حال اور نام سلطان النساء تحریر ہے۔[۲] بادشاہ نامہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے[۳]۔ مسٹر بیل نے اورینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری[۴] میں، مرزا امینا (مرزا امین) نے اپنے بادشاہ نامہ[۵] میں اور مسٹر بیوریج نے رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے[۶] میں اس کے حالات بقدرِ ضرورت درج کئے ہیں۔ بیوریج صاحب اپنے نوٹ میں اضافہ فرماتے ہیں کہ اس کا اصلی نام سلطان النساء تھا۔ اکبر نامہ[۷] میں اس کی ولادت کا ذکر ہے۔ ۱۶ اردی بہشت سنہ ۹۹۴ھ مطابق ۲۶ اپریل سنہ ۱۵۸۶ء کی شام کو پیدا ہوئی تھی۔ اُس کی ماں راجہ بھگوانداس کی بیٹی اور راجہ مان سنگھ کی بہن مانی اور سمجھی جاتی تھی۔ سلطان نثار باپ سے پہلے مری تھی۔ باپ سنہ ۱۰۳۴ھ یعنی[۸] سنہ ۱۶۲۷ء میں فوت ہوا ہے۔ تاریخِ جہانگیر میں مسٹر گلیڈون GLADWIN اس کا نام سلطان النسا اور سال پیدائش ۱۵۸۹ لکھتے ہیں۔[۹]

شاہزادی کی تاریخِ وفات کے بارہ میں جو اختلاف ہے اُس کو رفع کرنے یا صحت و تحقیق کا یہاں موقع نہیں، نہ ضرورت ہے۔ البتہ بہشت آباد (سکندرہ) میں اُس کے دفن ہونے کی روایت پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے۔ مولوی سعید احمد تاریخِ آگرہ میں فرماتے ہیں "اس کمرے (مرقدِ اکبر) کے برابر والے دوسرے کمرے میں جو خوشنما جالیوں اور فرش اور تعویذ سے مزین ہے ایک قبر ہے ..... اس میں جہانگیر بادشاہ کی بڑی لڑکی سلطان النسا بیگم دفن ہیں، جو شاہزادۂ خسرو کی بہن تھیں۔ ان کا انتقال ۴ شعبان سنہ ۱۰۵۶ھ کو بعہدِ شاہجہاں بادشاہ ہوا تھا۔"[۱۰] یہ تاریخ ۶ ستمبر ۱۶۴۶ء کے مطابق ہوتی ہے۔

---

۱ صفحہ ۲۰۰۔ ۲ صفحہ ۲۹۰۔ ۳ یہی نہیں سلیمان شکوہ پسرِ شاہ عالم بھی یہاں سنہ ۱۸۳۸ء میں دفن ہوئے تھے۔ اُن کی دو بیگمیں بھی یہاں راحت گزیں ہیں۔ (ڈاکٹر فوہرر صفحہ ۷۷)۔ ۴ صفحہ ۲۹۳۔ ۵ جلد دوم، صفحات ۴۶۳ و ۴۶۴۔ بادشاہ نامہ خود شاہجہاں نے نام رکھا تھا۔ مرزا صاحب درباری مورخ اور شاہجہاں کے منشی تھے۔ ۶ بابتہ ماہ جولائی سنہ ۱۹۰۶ء، صفحہ ۶۰۷۔ ۷ جلدِ سوم، صفحہ ۴۹۳۔ ۸ شاید کتابت یا طباعت کی غلطی ہے۔ جہانگیر کی وفات کی تاریخ ۲۸ صفر سنہ ۱۰۳۷ھ، روز یکشنبہ ہے۔ (از جہانگیر نامہ، صفحہ ۲۶۵)۔ اور یہی ۱۶۲۷ء کے مطابق ہوتی ہے۔ ۹ صفحہ ۱۶۰۔ ۱۰ مرقع اکبر آباد، صفحہ ۱۵۸۔

پیٹر منڈے صاحب نے اس کو سنہ ۱۶۳۲ء میں دیکھا اور نامکمل پایا تھا۔[1] لکھتے ہیں کہ مقبرہ نیا بنتا شروع ہوا ہے[2] پروفیسر بینی پرشاد فرماتے ہیں " مگر یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ مادۂ تاریخ جو روضۂ پاک سے جو مقبرہ پر تحریر ہے سال ہجری ۱۰۳۴ نکلتا ہے، جو سنہ ۱۶۲۵ء کے مطابق ہے۔"[3] میرے خیال میں کسی توضیح کی ضرورت نہیں۔ ۱۰۳۴ سالِ بنا یعنی عمارت کی بنیاد پڑنے یا شروع ہونے کا ہے، ختمِ تعمیر کا نہیں۔

مفتاح التواریخ میں مرقوم ہے کہ گنبد کے اندر بہت سے اشعار خوشخط نستعلیق میں لکھے ہیں۔ لیکن بعض کہن سالی و گردشِ روزگار سے مٹ گئے ہیں۔[3] سو برس گزرے مسٹر بیل کو اعتراف کرنا پڑا تھا کہ وہ بھی بعض کو پڑھنے اور پڑھوانے سے قاصر رہے تھے۔ اس لئے اسی قدر لکھ دینے پر اکتفا کیا تھا، جہاں تک پڑھا جاتا ہے پہلا مصرع یہ معلوم ہوتا ہے۔ خرّم آنروز کہ مارخت ازیں خانہ بریم۔ اس گنبد کی تعمیر کا قطعۂ تاریخ تین شعروں کا تھا جو دروازے کی پیشانی پر کندہ تھا، مگر پہلا شعر یا مطلع بالکل پڑھا نہیں جاتا۔ باقی دو شعر یہ ہیں" جو اُبھرے ہوئے حروف میں لکھے ہیں۔ ان کے گرد موقع موقع سے سبز رنگ کی گلکاری ہے۔

زہے نمونۂ خلدِ بریں بمرکزِ خاک | بر و ملائکِ رحمت ہمیشہ نور نثار

نوشت با قلمِ اختراع روضۂ پاک | خرد ز سالِ بنایش بصفحۂ فکرت

۱۰۳۴ [= ۱۶۲۵ء]

کتبہ فقیر سلطان سرہندی

پورے وثوق کے ساتھ تو شاید وہ خود بھی نہیں کہہ سکے کہ یہ مقبرہ کس کا ہے اور کس ضرورت سے تعمیر ہوا تھا، لیکن مسٹر ہیوریج کا خیال یہ ہے کہ اس قطعہ میں لفظ 'نثار' سے سلطان نثار بیگم کے نام کی طرف اشارہ ہے۔[4] اُس کی ماں راجہ بھگوان داس کی بیٹی تھی، مان سنگھ کی

[1] سیاحت نامہ، جلد سوم، صفحہ ۱۰۰۔ [2] تاریخ جہانگیر، صفحہ ۳۲۹ نوٹ۔ [3] صفحہ ۳۳۶۔ [4] جورنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی سنہ ۱۹۰۷ء، صفحہ ۶۰۷، نوٹ نمبر ۱۔

بسن مانی اور سمجھی جاتی تھی۔ مسٹر ڈیوہرسٹ فرماتے ہیں کہ اس کی بحر معمولی وزن کی ومجتث ہے[1]۔ یہ ادراک توچنداں بڑی بات نہیں۔ لیکن ایک یورپین ملکی عہدہ دار کی فنِ عروض پر ایسی گہری نظر اور اطلاع ضرور حیرت انگیز ہے۔ میرے ہم وطن، فارسی اُردو کے ممتاز سخنوران شاعرانہ نزاکتوں اور فن کی باریکیوں سے کتنے آگاہ ہیں۔ مرحوم نے تیسرے یعنی پہلے شعر کی نسبت کچھ تحریر نہیں کیا۔ منصبی خدمات کے سلسلہ میں وہ کچھ دن الہ آباد میں قیام فرما رہے تھے۔ یہاں کی عمارات و مقابر اور اُن کے کتبوں کے متعلق سعی و تلاش کی تھی۔ افسوس ہے کہ باقی ماندہ مٹے اور بگڑے ہوئے شعروں کو وہ بھی دریافت نہ کرسکے۔

مسٹر بیوریج نے اپنے قابلِ قدر مقالے میں لکھا ہے کہ خسرو کی ہمشیر سلطان النسا کی قبر پر بہ تفصیل ذیل کتبے ہیں۔

شمال کی طرف، اوپر۔

رو قطعِ تعلق بکن امروز کہ فردا — آسودہ زاغلال و ایمن ز سلاسل
از خود گزرا ے یار دریں در کہ کسے نیست — غیر از تو میان تو و مقصودِ تو حائل

دکھن، دروازہ پر۔

گر ہمہ مملکت و مالِ جہاں جمع کنیم — ما بجز پیرہنے ہیچ ز دنیا نہ بریم
یادشاہا تو کریمی و رحیمی و غفور — دستِ ما گیر کہ درماندۂ و بے بال و پریم
در شارعِ دیں کوہ صفت سنگی و کاہل — [دوسرا مصرع غائب ہے]
تن دِہ برضا کانچہ قضا بر تو نوشت است — از تو نشود دفع بہ تعویذ و حمائل
حق را بشناس از نظرِ چشم و دل و گوش — کایں ہا ہمہ بر قدرتِ حق اند دلائل

مسٹر ڈیوہرسٹ کا ارشاد ہے کہ پہلی بیت میں جو مصرع "در شارعِ دیں" والا بیوریج صاحب نے نقل کیا ہے وہ دراصل مصرعِ دوم ہے یعنی شعر کا نصفِ اخیر۔ اس لئے کہ اس میں قافیہ اور حرفِ روی موجود ہے۔ اسی طرح شعر کا پہلا مصرع بھی غلط تحریر ہو گیا ہے۔

---

[1] جورنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی سنہ ۱۹۰۹ء، صفحہ ۷۴۸۔

مسٹر ڈیو ہرسٹ نے ان کتبوں اور اشعار پر کامل غور و مطالعہ کے بعد رائے زنی فرمائی ہے[1] اس لئے پوری تفصیل کے ساتھ اُس کو درج کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

"تیسری عمارت کے کتبے بدنصیبی سے نہایت نامکمل اور بڑی ناقص حالت میں ہیں۔ عملی طور پر یہاں چار کتبے پائے جاتے ہیں۔ ایک تو چھوٹا سا، جنوبی دروازہ پر، جس سے ۱۰۳۴ھ تاریخ نکلتی ہے۔ [بروملائکِ رحمت۔ تا۔ روضۂ پاک]۔ عمارت کے مربع کے اندر دو لائنیں کتبوں کی ہیں جو گرداگرد یعنی چاروں طرف دوڑتی چلی گئی ہیں۔ اوپر والی قطار تقریباً بیس فٹ اور نیچے والی قریب نو فٹ کے فرشِ عمارت سے بلندی پر ہوگی۔ اوپر والی رَو میں ایک ہی نظم بحرِ ہزج CATALECTIC میں تھی اس میں زحافات بھی تھے جو خرب اور کف کہلاتے ہیں۔ اُن کا حرفِ رَوی 'ل' تھا۔ ابتداً اس میں سولہ بیتیں تھیں۔ ان میں سے اس وقت کلاً یا جزواً صرف دس محفوظ ہیں۔ نیچے والی قطار میں دو جدا جدا نظمیں تھیں۔ پہلی بحرِ رمل میں، جس کا حرفِ رَوی 'میم' تھا۔ دوسری بحر والی CATALECTIC ہزج میں اور اُس کا حرفِ روی 'الف' تھا۔ پہلی نظم میں ابتداءً آٹھ شعر تھے۔ ان میں سے دو اس وقت پورے پورے موجود ہیں۔ باقی دونوں میں سے پہلا آدھا اور ایک جزو نصفِ دوم کا رخصت ہو چکا۔ دوسری نظم اس سے بھی زیادہ مٹ چکی ہے۔ یعنی ابتداءً دس شعر تھے، ان میں سے صرف ایک ثابت دبرقرار رہ گیا ہے۔ تین شعر اور تھے، جن کا تقریباً النصف نصف موجود ہے۔ ان دونوں میں سے پہلی نظم کی ساڑھے چھ بیتوں کو 'غت ربود' (خلط ملط) کر دیا ہے اور ایک دوسرے کے مختلف اجزا ادھر ادھر لگا دئے ہیں۔

دوسری نظم فارسی کے مشہور شاعر خاقانی کی غزل ہے جو اُس کی کلیات مطبوعہ لکھنؤ کے صفحہ ۱۳۹ میں موجود ہے۔

پوری غزل یہ ہے۔

وقت آنست کزیں دارِ فنا در گذریم   کارواں رفتہ و ما بر سرِ راہِ سفریم

---

[1] جورنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی سنہ ۱۹۰۹ء، صفحہ ۷۴۷۔

۲ زادِ رہ ہیچ نداریم چہ تدبیر کنیم | سفرِ دور و دراز است و لے بے خبریم
۳ پدر و مادر و فرزند و عزیزاں رفتند | وہ چہ ما غافل و مستیم چہ کوتہ نظریم
۴ دم بدم می گزرند از نظرِ ما یاراں | ایں قدر دیدہ نداریم کہ بر خود نگریم
۵ خانۂ و خانقہ و منزلِ ما زیرِ زمیں | ما بہ تدبیرِ سر اساختن و بام و دریم
۶ خانۂ اصلی ما گوشۂ خوابستان است | خرم آں روز کہ ایں رخت بداں خانہ بریم
۷ گر ہمہ مملکت و مالِ جہاں جمع کنیم | لیک جز پیرہنِ گور ز دنیا نہ بریم
۸ بادشاہا تو کریمی و رحیمی و غفور | دستِ ما گیر کہ درماندہ و بے بال و پریم
۹ یارب از لطف و کرم عاقبتِ خاقانی | خیر گرداں تو کہ ما در طلبِ خواب و خوریم

اس کا چھٹا اور ساتواں شعر اب تک موجود ہے۔ البتہ چھٹے کا نصف دوم "ما بجز پیرہنے ہیچ ز دنیا نہ بریم" پڑھا جاتا ہے۔ چوتھے شعر میں "بر خود نگریم" آخر سے غائب ہے۔ کلیات کا پانچواں شعر غالباً کتبے میں شروع ہی سے نہیں لکھا گیا تھا۔ چھٹے شعر کا نصفِ دوم جس کو غلطی سے بیل صاحب نے ان نظموں کا پہلا شعر سمجھا ہے، اب بالکل نظر نہیں آتا۔ یہ امر قابلِ تحریر ہے کہ یہ نظم اور دوسری اور جو اس کے اوپر ہے، اور خسرو کی قبر کا کتبہ، سب کے سب عمارت کی پچھم سمت کے وسط سے شروع ہوتی ہیں۔ یعنی کعبہ (مکہ) کا رُخ ملحوظ رکھا گیا ہے۔

تیسری نظم سے صرف ایک شعر پورا باقی رہ گیا ہے۔

بگفتی حالِ شاں بودی زبانِ سوسن ار گویا | چہ می داند کسے حالِ گل اندامان بزیرِ گل

تلاش کی جائے تو کسی نہ کسی مشہور شاعر کے دیوان میں اس عمارت کی باقی ماندہ دونوں نظموں کا بھی پتہ چل جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ کلام یا اس طرح کا معمولی شعرا کا نہیں ہو سکتا، جو محض تاریخیں نکالنے اور موزوں کرنے میں مشاق ہوتے ہیں[1]۔"

ان تینوں فاضل مستشرقین کی سعی و التفات قابلِ تشکر و امتنان ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ پوری

---

۱ جورنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۹ء، صفحہ ۷۴۸۔

کوشش کرنے سے اب بھی بعض مزید اشعار کا پتہ چل سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کاتب وغیرہ کا نام بھی ملتا ہے۔ بہت سے شعر اور مصرعے بالکل محو و صحو ہو رہے ہیں۔ بعض کے مصرعے اور الفاظ اُدھ کٹے ہیں۔ نگاہ پر زور دینے اور فہم کی مدد سے ان بے نظم و ترتیب شعروں یا لفظوں کو جیسا کچھ میں پڑھ سکا ہوں، ذیل میں نقل کرتا ہوں۔ شاید کوئی ذی علم بزرگ توجہ فرما کر بقیہ اشعار و مصرعوں کو بھی پورا کر دے۔

قدم نہ بر سرِ ہستی کہ ہست مایۂ ادنا ....

... . ہستی را و ترکِ خود فروشی کن — کہ در بازارِ دیں خواہند ....

براق مکر ریک شب معراجِ حقیقت داں — بگوش سرِ جاں بشنو.........

در خوردن و خفتن چہ شوی ہمسر انعام — می کن سعی تا نشوی کم ز عوامل ...

.... افسر زِ گر خود — زآہن بود دست عرق و زبولاد مفاصل

.... — در شارع دیں کوہ صفت سنگی و کاہل

ایں طولِ امل چیست نداتی کہ زمانہ — شد عمر ترا تا بقید......... معطل

از نیست بہ ہستی و بہستی برہ نیست — تا شہر وجود است........

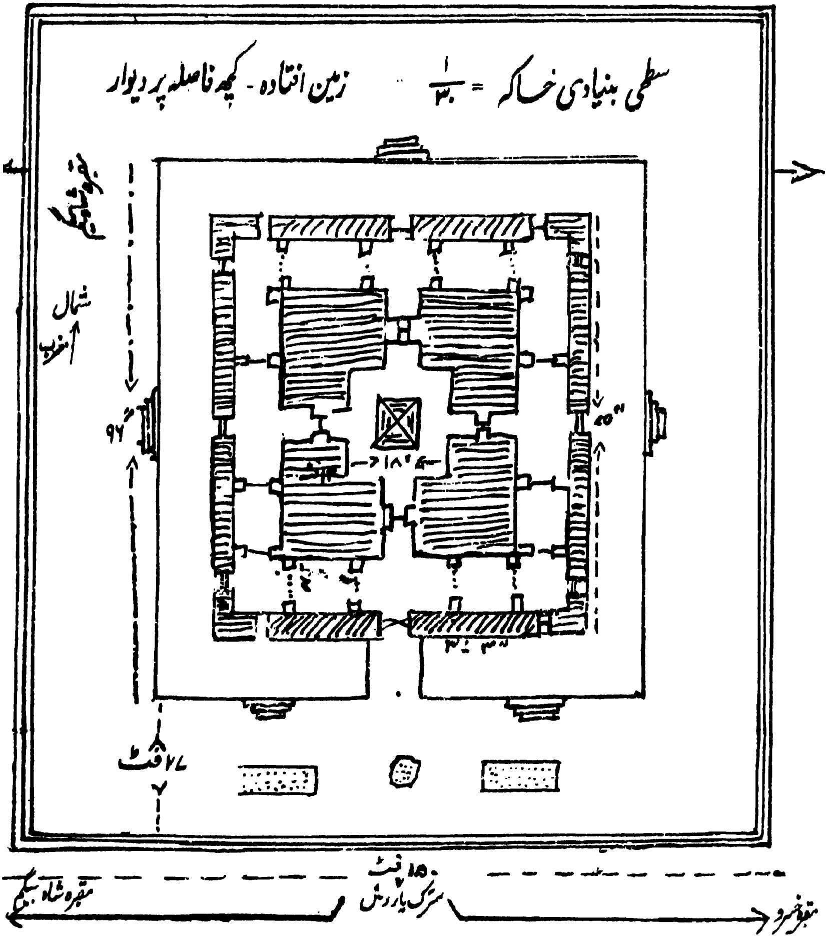
عمارت اور اُس کی خصوصیات

یہ مقبرہ (بلا قبر) اور مقبروں سے کئی باتوں میں، ساخت و خوش نمائی، پتھر کی مضبوطی و دیرپائی کے لحاظ سے ممتاز ہے۔ اس کا شلجم (شلغم) نما گنبد، بلند نوک دار محرابیں، خوبصورت نقش و نگار مخصوص وضع و قطع کے نیم وا مدور ستون، سب کے سب ایک حیثیت منفرد و جدا رکھتے ہیں۔ اور جو مغلیہ طرزِ تعمیر کے اچھے علمبردار کہے جا سکتے ہیں۔ مستزاد یہ کہ اس کے ابقا و درست حالی میں قدرتِ مطلقہ نے بھی اپنے دستِ کرم اور فیاضیوں سے زیادہ حصہ دیا اور پورا کام لیا ہے۔ صدیاں گزر چکیں۔ آب و ہوائیں بدلتی رہیں۔ سخت سے سخت موسم آئے اور چلے گئے۔ لیکن اس کے خارجی تکلفات، نمائشی گلکاریوں اور پتھروں کی اصلی رنگت پر بہت کم اثر ڈال سکے۔ آس پاس کے مقبروں کے پتھروں پر سیاہی دوڑ آئی۔ کائی نے بھی جا بجا کھا لیا۔ لیکن اس عمارت کے نیچے والے حصہ کو چھوڑ کر جہاں کہیں کہیں کائی اب اپنا قدم جمانے لگی ہے، باقی پتھروں کی سُرخی و سفیدی ہنوز باقی ہے۔ بالائی روکار کے پتھروں کی کھلتی ہوئی زردی، سنگ کسوٹی کی مرمریت، صاف نمودار ہے۔ اور خوب رونق دکھا رہی ہے۔ پتھر اپنے تمام اصلی منقوشات و مکتوبات و محکوکات کے ساتھ بالکل سالم اور محفوظ ہیں۔

اب یہاں سے بے لطف و بے کیف تفصیلات و جزئیات شروع ہوتی ہیں۔ اندیشہ ہے کہ تفریحاً پڑھنے والوں کو ان کے سمجھنے میں اُلجھن، اور سلسلۂ بیان کو ذہن نشین رکھنے میں زحمت و کُلفت ہوگی۔ مگر کم نصیب لکھنے والے کو اپنے فرض کی انجام دہی سے چارہ نہیں۔

حلقہ گردِ من زنید ای پیکرانِ آب و گل   آتشے در سینہ دارم از نیاکانِ شما

روضہ کی عمارت چار فٹ ایک انچ بلند چبوترہ پر اُٹھائی گئی ہے۔ مربع ہے۔ جس کا ہر ضلع بتیس (۳۲) گز ہوگا۔ برابر والے مقبروں کی طرح یہ بھی دکن رویہ بنی ہے۔ چاروں طرف نو نو گز کا سنگین فرش ہے۔ اصل عمارت یعنی پہلی منزل کی دیوار پچیس پچیس گز ہر طرف سے ہے۔ ساڑھے تین فٹ موٹی۔ دوسری دیوار اس سے آٹھ فٹ کے فصل پر اندر کی جانب ہے۔ اسی دیوار پر پوری عمارت کا



بوجھ پڑتا تھا، اس لئے اس کی چوڑائی چار گز (بارہ فٹ) رکھی گئی۔ حجرہ (برائے قبر) اندر اندر، طول و عرض میں مُساوی، چھ چھ گز ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ عمارت کے داخلی حصہ میں عمارت کی بنیادی زمین نے زیادہ رقبہ لے لیا ہے۔ کھُلے ہوئے حصہ نے کم پایا۔ اس تجویز و تقسیم کی اچھائی برائی کا فیصلہ تو اہل فن اور اربابِ کمال ہی کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ آشکارا ہے اور مُسلّم کہ غلام گردش اور حجرہ کو چھوڑ کر، بہت سی جگہ چونے اور پتھر کے تصرف میں آگئی ہے۔

صدر دروازہ چبوترہ کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ ہمسایہ مقبروں کے مقابلہ میں یہ دروازہ، اس کے اوپر والی محراب اور پیش طاق سب فراخ تر و کشادہ ہیں۔ محراب دس فٹ اونچی، چھ فٹ چار انچ چوڑی ہے۔ پیش طاق نقوش و گلکاری سے آراستہ و خوبصورت ہے۔ پھاٹک پر محراب کے دونوں جانب پتھروں پر ایک ایک دائرہ ابھرا ہوا تراشا گیا ہے۔ جس میں کلمۂ طیبہ مرقوم ہے۔ دکن رخ سنگی فرش پر سبزۂ و گل کے تر و تازہ خیابان ہیں۔ ٹھیک پھاٹک کے سامنے ایک ہشت گوشہ حلقہ میں مختصری کیاری ہے۔ گز بھر قطر۔ اسی کے برابر ادھر ادھر دو کیاریاں اور ہیں۔ فرحت بخش و نشاط افزا۔ امیر مرحوم نے کیا اچھی تشبیہ اسی سے پائی ہے۔

عارض ترا اے گلبدن اک اس طرف اک اس طرف
گویا کھلے ہیں دو چمن اک اس طرف اک اس طرف

یاد ہوگا کہ چبوترہ کی بلندی یعنی عمارت کی کرسی چار فٹ ایک انچ ہے۔ اس چبوترہ کے تین جانب، ہر جانب کے وسط میں، تین تین سیڑھیوں کا ایک ایک زینہ اوپر چڑھنے کے لئے بنا ہے۔ دکن کو دروازہ کے دونوں طرف سیڑھیاں ہیں۔ ۷ × ۵ فٹ زمین گھیری ہے۔ یہ سیڑھیاں ایک فٹ چار انچ چوڑی ہیں۔ ان سیڑھیوں اور چبوترہ کی دیواروں پر نقاشی تو نہیں، لیکن سنگ تراشی اچھی خاصی کی گئی ہے۔ پتھر گڑھ کر لگائے اور ان کے کنارے صفائی سے کاٹ کر خوب ملائے ہیں۔ پتھر کی چھ چھ کھٹیاں شامیانہ نصب کرنے کے واسطے چبوترہ کی دیواروں میں مضبوطی کے ساتھ لگی ہیں۔

چبوترہ کے بعد ہی عمارت کی پہلی دیوار، بارہ فٹ بلند ہے۔ عمارت کی پہلی منزل اس پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس دیوار کے ہر پہلو میں منقش ستون اور طاقوں اور محرابوں کے کچھ پست اور کچھ ابھرے ہوئے نشانات جلوہ ریز ہیں۔ یہ ہی آدھے کھمبے ہر طرف کی دیوار کو پانچ حصوں یا ٹکڑوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک حصہ میں تین تین طاق نو مختلف وضع و طرز کے بنے ہیں۔ ان کے نیچے ڈھائی ڈھائی انچہ پتھر اور کھدے ہوئے ہیں۔ اس طرح پر ہر جانب چھ چھ ستون ہیں۔ چار چار تو درمیان میں معین و مساوی فاصلہ پر ہیں اور دو دو دیواروں کے دونوں کناروں پر۔ لیکن دکھن طرف پھاٹک واقع ہوا ہے اور اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہیں، اس لئے ادھر صرف چار کھمبے ہیں۔ ستون اور طاقوں

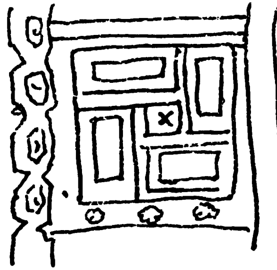
کی صورت نقشہ سے واضح ہوگی۔

یہ ستون دیواروں میں نیم پیوستہ ہیں۔ ان کی گولائی (موٹائی) نصف سے کم باہر نکلی ہوئی ہے۔ جیسا کہ کہہ چکا ہوں یہ کھمبے اور طاق اور ان کی پیشانیاں نقشین اور نہایت خوشنما بنی ہیں۔ شامیانہ و سایبان لگانے کے لئے ستونوں پر بھی توڑے نصب ہیں۔ طاقوں کی پیشانی بھی منقش ہے۔ محرابوں کے پہلوؤں پر "اللہ اللہ" لکھا ہے، مگر دیواروں کے درمیانی یعنی بیچ والے طاق پر پورا کلمۂ طیبہ۔ چبوترہ سے طاقوں کی بلندی پانچ فٹ دس انچ ہے۔

دیواروں میں تینوں جانب تین تین روشندان یا پتھر کی جالیاں ہیں۔ [سطحی خاکہ ملاحظہ ہو] ان میں سے ایک تو وسط میں ہے، اور ایک ایک دونوں کناروں پر۔ ان کا ارتفاع ڈھائی ڈھائی فٹ ہے۔ دو فٹ دو انچ چوڑائی۔ ان سے حجرہ (برائے قبر) میں کافی روشنی پہنچتی ہے۔

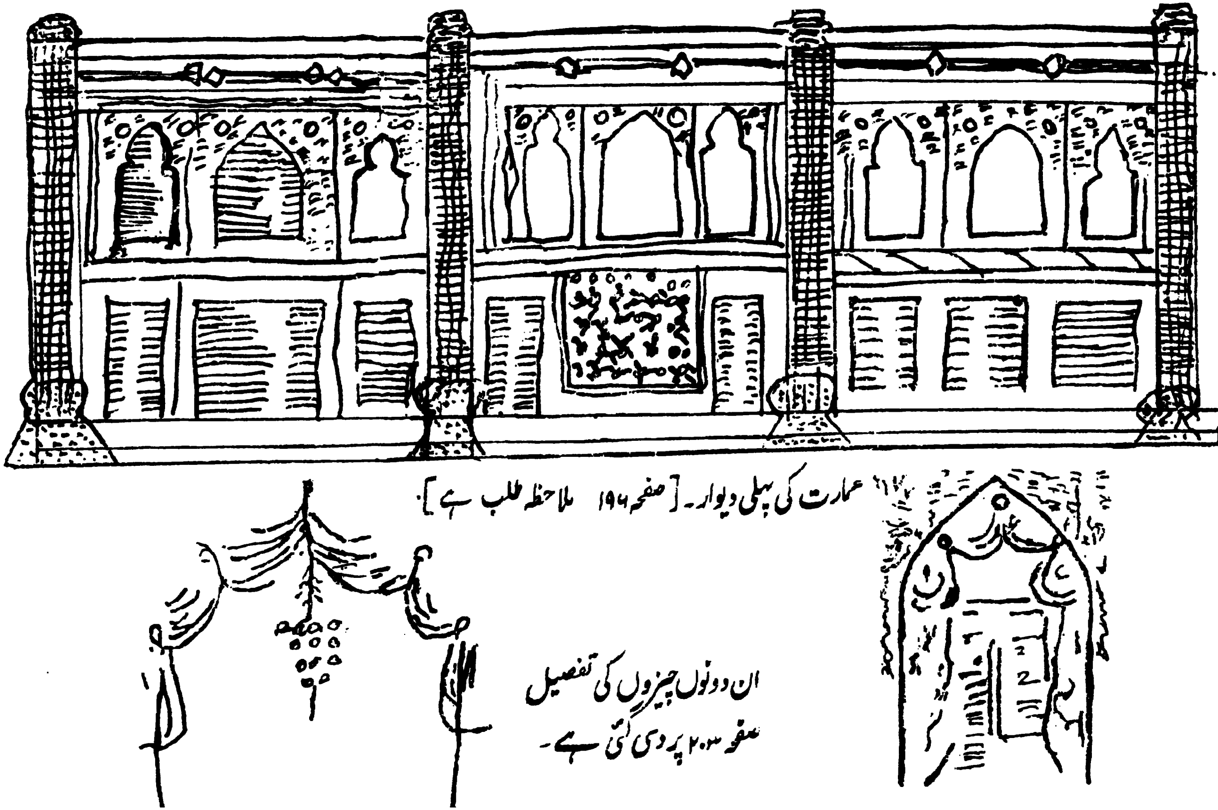
رُوکار میں سنگ سرخ استعمال کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں سفیدی بھی جھلکتی ہے۔ اونچی اونچی دیواروں کے اوپر والے حصہ میں سنگ کھٹو یا مرمر زرد[1] نے غالب حصہ پایا ہے۔ یہ موسمی اثروں اور سیاہی سے اب تک بچا ہوا ہے۔

پہلا دروازہ پانچ فٹ گیارہ انچ اونچا، تین فٹ آٹھ انچ چوڑا ہے۔ چوکھٹ بازو پتھر کے، کواڑ یا پلے لکڑی کے ہیں۔ ہر پلہ خوشنما کام کے ساتھ چار حصوں میں منقسم ہے۔ اس عمارت کے سب دروازے یکساں وضع و ساخت کے ہیں۔ ان کو پانی اور دھوپ سے بچانے اور رنگنے کے لئے سرخ لاکھی یا گیروا رنگ شاید ایک مدت دراز سے انتخاب و اختیار ہوتا چلا آیا ہے۔ صدر دروازہ سے گزر کر گیارہ فٹ کے بعد ایک دوسرا دروازہ ملتا ہے۔ پرانے نمونہ پر نئی لکڑی کا تیار ہوا ہے۔ دروازہ اور پھاٹک کے درمیانی حصہ میں دونوں گوشوں میں "استحفاظ آثار قدیمہ" کے متعلق سرکاری اعلان آویزاں ہیں۔ یہ نیلی خام آہنی تختیوں پر سفید روشنائی



---

[1] اس زرد پتھر (کھٹو) کی بابت میری اطلاع یہ ہے کہ اب ان اطراف میں دستیاب نہیں ہوتا۔ استعمال بھی کم ہے۔



عمارت کی پہلی دیوار۔ [صفحہ ۱۹۶ ملاحظہ طلب ہے]۔

ان دونوں چیزوں کی تفصیل صفحہ ۲۰۳ پر دی گئی ہے۔

اس کی کان دو جگہ تھی۔ ایک سندھ میں۔ بھکر، سکھر، ٹھٹھہ وغیرہ کے نواح میں، کوہ مکلی کی قبروں میں گیارھویں صدی اسلامی

سے خوشخط نستعلیق میں تحریر ہیں۔ پہلا نوٹس، حسبِ معمول زیرِ قانونِ تحفظ و احترام صنادید کہن ہے۔ عمارت کو ضرر پہنچانے والے کو جرمانہ کی وعید (دھمکی)۔ دوسرا حاکم ضلع کی طرف سے، ذیل کی چھ دفعات و مقاصد پر مشتمل ہے۔ (۱) دیواروں کو چراغ سے سیاہ کرنے کی ممانعت۔ (۲) اُن پر لکیریں کھینچنے کی ممانعت۔ (۳) مقبرہ کے فرش پر کھیل کود اور دعوتوں کی ممانعت۔ (۴) کتوں کو اندر لے جانے کی ممانعت۔ (۵) ہر اُس بات کی ممانعت جس سے مقبرہ کی حرمت میں خلل پڑے۔ خلاف ورزی کرنے والا نکال دیا جائے گا۔ مقدمہ بھی قائم ہوگا۔

خوانده، شائستہ، و مہذب تماشائی ان ہدایات کا استقبال و احترام تعمیل سے نہیں بلکہ موقع پاکر تنقص و انحراف سے فرماتے ہیں۔ روز روز کی بات ہے کہ بہت سے نام اور دستخط برابر لکھے جاتے اور مٹائے جاتے ہیں۔

دروازہ سے داخل ہو جانے پر پہلے غلام گردش ملتی ہے، اُس کے بعد حجرۂ قبر کا دروازہ۔ یہ پرانا یا اصلی معلوم ہوتا ہے۔ تیسرا دروازہ اگر کھلا ہو اور کوئی شخص پہلے دروازہ سے کھڑا ہو کر دیکھے تو اُس کی نگاہ دوسری سمت، حجرہ کے سامنے والی بڑی جھنجھری سے گزر کر دیوار کی باہر والی جالی سے پار نکل جائے گی۔ اسی طرح چاروں طرف سے ہلکی ہلکی روشنی آتی اور حجرہ کو منور رکھتی ہے۔ سطحی خاکہ میں اس کے منافذ و مخارج و مداخل دکھائے گئے ہیں۔

غلام گردش آٹھ فٹ چوڑی ہے۔ جس کو محرابوں سے سولہ حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ (نقشہ سے ظاہر ہوگا۔) اس کی چھت بہت نیچی ہے۔ چھ فٹ بلندی تک دیوار کو پہنچا کر چھت کی گولائی شروع، اور نیم دائرہ سے بھی کم پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ مجموعی ارتفاع گیارہ فٹ ہوگا۔ باہر اور اندر کی بلندی کا حساب لگانے سے پانچ فٹ کا تفاوت ہوتا ہے۔ اس لئے پہلی منزل کی چھت (اپنے منتہائے گولائی پر) پانچ فٹ موٹی ہے۔ چھت کی گولائی میں پست و بلند، مثلث نما قاشین تراشی، اور جال در جال بنائی بھلی گئی ہیں۔ ان میں ابتداءً یا کسی زمانۂ بعید میں سرخ، زرد اور نیلے رنگوں سے نظر فریبی پیدا کی گئی تھی۔ اب ان پر سفیدی کی تہیں یا تین موٹے موٹے پرت پڑے ہوئے ہیں۔ مرمت و قلعی ہیں

میں اکثر استعمال ہوا اور دیکھا گیا ہے۔ دوسری، پرگنہ ناگور میں۔ ایک پہاڑ، ایک ضلع دو موضعے اسی ایک نام کے ہیں۔ ریل اسٹیشن

احتیاط نہ ہونے سے، بعض بعض جگہ، ان پرتوں کے اکھڑ جانے سے یہ جال اور چھت کے کٹے ہوئے پھول اور زنجیرے نمودار ہو گئے ہیں۔ یہ خرابی جنوب و مشرق کے گوشوں میں خاص طور پر چشم کشا و بدنما ہے۔ سپاٹ چھت نکلتی آتی ہے۔ بیچ والے ٹکڑے میں بیچ کی محرابوں کے پھول بھی مائل زوال ہو رہے ہیں۔ موسمی ہواؤں اور رطوبت و نمی نے چھت کے بعض پتھروں کی بیرونی سطح کو کھانا شروع کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ رفتہ رفتہ یہ مثلث نقوش اور پھول بھی رخصت ہو جائیں گے۔ گوشوں اور بیچ بیچ میں جو کچھ باقی ہیں اب بھی اچھے اور اچھے کٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

غلام گردش کے گوشوں کی جالیوں پر محافظینِ عمارت نے تار کی جالیاں بھی لگا دی ہیں۔ اس سے باہر کی کوئی چیز اندر ڈالنا یا پہنچانا در کنار، خزاں زدہ خشک پتیاں بھی وہاں نہیں جا سکتیں۔ غلام گردش کی محرابوں کے درمیان، دیواروں کے دونوں جانب طاق بنے ہیں۔ دو فٹ اونچے ایک فٹ سات انچ چوڑے ہیں۔

حجرۂ قبر میں داخل ہونے کے لئے، دروازہ کے بعد بارہ فٹ کی دیوار طے کرنا ہوتی ہے۔ اس کا رقبہ چھ گز یا اٹھارہ فٹ مربع ہے۔ دیوارِ حجرہ ساڑھے چار فٹ بلند ہے۔ اس کے بعد چھت کی گولائی شروع ہو جاتی ہے اور محرابوں کے نشانات چھت کی گولائی کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک اوپر اوپر بلند ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان محرابوں کا شمار آٹھ تک پہنچتا ہے۔ محرابوں کے گرداگرد وہی مثلث و مدور پھولوں کے پیچ در پیچ سلسلے بنتے گئے ہیں۔ جو چھت کی منتہائے بلندی پر پہنچ کر ختم ہوتے ہیں۔ چھت مدور و محدب ہے۔ اس پر بھی مثلث نما پھول بنے ہیں اور اُن کی آرائش و زیبائش مختلف شوخ رنگوں سے کی گئی ہے۔ چھت میں جھاڑ فانوس لٹکانے کے لئے کڑا لگا ہے۔ دیواروں میں دونوں جانب طاق اور دو دو دیواروں کے اتصال پر گوشوں میں ڈھکے ہوئے چراغداں ہیں۔



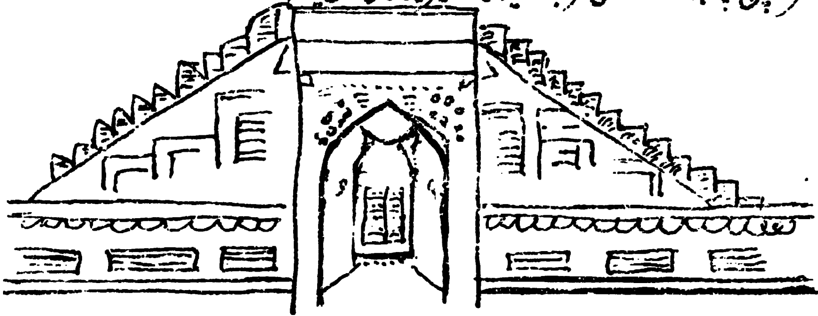
اس کمرہ میں ایک مسطح و ہموار چبوترہ ہے۔ سوا دو فٹ مربع۔ دو فٹ بلند۔ بعض اس کو قبر بتاتے ہیں۔

بھی ہے۔ اب کھاٹو بھی کہلاتا ہے۔ یہ نہایت پرانا اور اہم مقام ہے۔ بعض تعمیرات پر سلطان التمش (متوفی ۶۳۳ھ = ۱۲۳۵ء) کے

مگر صاحبِ قبر کا نام یا نشان نہیں جانتے۔ قبر ہونے کی معمولی علامتیں بھی اس میں پائی نہیں جاتیں۔ یوں، پھول سب چڑھاتے ہیں آ کر مزار پر۔ تھوڑی سی دماغی و ذہنی کاوش اور چشم و انگشت کی غمازانہ و رقیبانہ سازش و کاوش سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ چبوترہ کو محدود و مرتب کر کے اندر سے کھوکھلا (خالی) چھوڑ دیا ہے۔ انتظار ہوگا کہ کسی انسان کا جسدِ خاکی اس کا دعویدار اور اس کی مستقل آبادانی و تصرف کے واسطے تیار ہو۔ خاک بر سر، اُس وقت تک کے لئے اس کو خشک مٹی سے بھروا دیا تھا جو ہر وقت بہ آسانی نکالی جاسکتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کی اوپر والی سطح نہ ٹھوس ہے نہ محکم و استوار۔ قلعی اور سفیدی کی مرمت فریب تھوں نے محض ہنگامی ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ اس چبوترہ پر کسی قسم کے نقش و نگار بھی نہیں ہیں۔ فرشا دیواروں میں گڑھے ہوئے پتھر لگے ہیں جو ہر رُخ کو تین تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

اس کمرہ کی دیواروں میں جالیاں غلام گردش کی جانب لگی ہیں۔ پتھر کی ہیں پندرہ انچ موٹی۔ خانے بڑے بڑے۔

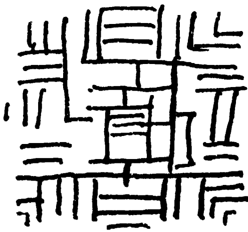
اب مقبرہ کا بالائی حصہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے۔ اسی (دکن) طرف، پھاٹک کے دونوں جانب، زینوں کا دوہرا سلسلہ اوپر کو چلا گیا ہے۔ ہر ایک میں تیرہ تیرہ سیڑھیاں ہیں۔ ہر سیڑھی ایک فٹ چوڑی اور ایک فٹ سے بھی کم اونچی۔ اوپر کی چاروں سیڑھیاں اور سیڑھیوں سے بھی نیچی ہیں۔ ان کا میدان یا زیر پائی صرف پانچ انچہ ہوگا۔ دروازہ کی محراب، زینوں اور سیڑھیوں کی شکل یہ ہے۔



پہلی منزل یا غلام گردش کی چھت ساڑھے گیارہ فٹ ہے۔ اس کے بعد ہی تیسری منزل کی دیوار شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے دروازہ میں داخل ہونے کے لئے چار قدموں کی سیڑھی ہے۔ دیواریں بلند

موجود ہیں۔ مگر شہرت اس کی زیادہ تر اسی پتھر یا بعض اولیا اللہ کی بدولت ہوئی۔ محمد شاہی عہد سے یہ علاقہ راجپوتوں کی جاگیر اور جودھپور کی ریاست میں رہا۔

ہیں۔ پھاٹک بلند تر۔ پھاٹک کے بائیں جانب یعنی پچھم زینہ چلا گیا ہے۔ پھاٹک کے بعد نہایت شاندار کھلا ہوا (ہال) کمرہ سامنے آجاتا ہے۔ اس کے اندر نیچے سے لے کر اوپر (زیر گنبد) تک تمام منقش ہے۔ اس کا رنگ ڈھنگ، اس کے مثلث نما پھول قریب قریب ویسے ہی ہیں، جیسے کہ نیچے کی عمارت میں دیکھے گئے تھے۔ یہ بالائی کمرہ تیئیس (۲۳) فٹ مربع ہے۔ اس میں پتھر باقاعدہ تراشوں اور شکنجوں سے جڑے گئے ہیں۔ شکل یہ ہے۔



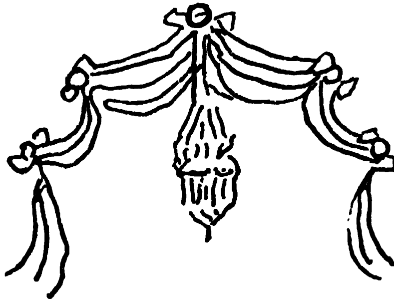
پتھر کے اس فرش کو دھونے اور صاف رکھنے کے لئے نالی بنی ہے۔ دروازہ کی سنگی چوکھٹ کے نیچے ہو کر پانی بہ آسانی کھلی چھت پر چلا جاتا ہے۔ اس کمرہ میں چار دروازے ہیں۔ چوکھٹ بازو پتھر کی۔ اس وقت خالی کھڑی ہے۔ کبھی اس پر جالی لگی ہوئی تھی۔ حسب معمول بغلوں میں کواڑوں کی جگہ چھٹی ہوئی ہے۔ پٹاؤ میں چولوں کے لئے سوراخ ہیں۔ نیچے گردہ کے لئے گول جگہ۔ خود یہ بازو بھی خالی نظر نہیں آتے ان میں بھی جابجا سوراخ ہیں۔

اس تعمیر بالائی کی دیوار نو فٹ سات انچہ موٹی ہے۔ چاروں دروازوں کی محرابیں چودہ چودہ فٹ بلند ہیں۔ ان کے قریب ہی سے اوپر کو بلند محرابوں کا دوسرا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ بھی آٹھ ہیں۔ ادھر کی چاروں بیچ والی محرابوں میں گلدستہ نما جالی ہے۔

بانیان عمارت کا ارادہ و مقصد جو کچھ رہا ہو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام کو آراستہ و پیراستہ رکھنے کے لئے خاص انتظام و اہتمام مدنظر رکھا گیا تھا۔ اس وسیع کمرہ کے لئے ہر قسم کا ساز و سامان شایان شان مہیا و فراہم کیا ہوگا۔ اِدھر اُدھر، اوپر نیچے، محرابوں میں اور فرش پر گڑوں اور چھلّوں کی ریل پیل، آلات و ادوات روشنی کی افراط، شاہانہ ٹھاٹھ اور سجاوٹ کا پتہ دیتی ہیں۔

سلہ کمرہ کے باہر کی جانب نقشی محرابوں میں اوپر کی طرف پانچ پانچ گڑھے۔ مجموعی ہیئت یہ ہوتی ہے۔





۲ اندر کی طرف محراب اور اُن کے کناروں پر بھی چھوٹے چھلے لگے ہیں۔ جس میں زنتار ڈوریاں کلابتوں و ریشم کی باندھی جاتی تھیں۔

۳ کمرہ کی دیواروں کے جوڑوں پر بالکل کونے میں، اوپر کو چاروں طرف، دو دو موٹے کڑے۔ چھت کی بلندی پر بھی ایک مضبوط موٹا سا کڑا۔ بتایا جاتا ہے کہ یہاں مخمل و کمخواب کے زرنادوز و زرکار شامیانے اور شادروان مثلاً چوبھاؤ اُوتار کے ساتھ لگائے جاتے تھے۔

۴ سنگی فرش کے چاروں گوشوں میں چھلے۔ غالیچوں اور فرش فروش کے بچھانے اور باندھنے کے کام آتے ہوں گے۔

اب نہ عمارت ہی اپنی اصلی حالت و شان پر نظر آتی ہے نہ اسکی آرائشوں اور تکلفات کا کوئی نشان باقی ہے۔ ہاں، دیکھنے والا گردن جھکائے گا تو جہانگیر و شاہجہاں کے عہد کی سطوت و شوکت، زیبائش و تمکنت، محلوں کی لطافت و نفاست اور سلیقہ انجمن آرائی کی ایک جھلک دیکھ لینے سے محروم نہ رہے گا۔

شب گزشتہ کے ساز و ساماں کے اب کہاں ہیں نشاں باقی
زبانِ شمعِ سحر پہ حسرت کی رہ گئی ہے داستاں باقی

شکر ہے کہ سلطان نثار بانو کے مقبرہ کی ناگوار و تصدیع افزا مرات و بیان، فنی اصطلاحات اور

تعمیری تفصیلات کا طول طویل جنجال ختم پر آیا۔ پھر بھی اس سے زیادہ نہ خود سمجھ سکا نہ دوسروں کو سمجھا سکا کہ بلند چبوترے بالائے چبوترہ بنائے ہیں یا ایک پہاڑی پر دوسرا پہاڑ رکھ دیا ہے۔ اب صرف اسی قدر اور کہنا باقی ہے کہ اس عمارت کے (بھی) چاروں گوشوں پر کوشک یا گلدستے بنے ہیں۔ خوش نما ہیں اور دلکش۔ آٹھ آٹھ نازک و سبک کھمبوں پر قائم ہیں۔ اپنے پاس والے مقبرہ یعنی خوابگاہ خسرو سے کسی قدر چھوٹے ہیں۔ اس عمارت کی ابتدائی تخییل و تشکیل، اس کا جامع و مکمل نقشہ، اس کی مجموعی خوبیاں اور شان، مضبوط استرکاری، بلیغ رنگ آمیزی، شاداب و نفیس مینا کاری، چمک، جلا اور آب و تاب، حیرت میں ڈالنے والی جالی دار اور پیچ دار تحریروں کا کام، ان اطراف بلکہ اقصائے ہند شرقی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اگر اپنی نظیر تلاش کرنا ہے تو آگرہ و لاہور کے اکبری و جہانگیری ویرانوں اور عبرت آفریں کھنڈروں پر نظر ڈالئے۔

خسرو باغ کا شناگر بے شعور مقبول عذر خواہ ہے کہ اس ارم اساس تعمیر کی تعبیر کبھی کبھی لفظ "مقبرہ" سے کرنے پر مجبور ہوا ہے۔ پڑھے لکھوں سے اس کے معنی "گورِ مردہ" کے سنے تھے اور جہاں تک تحقیقاً ثابت ہوا ہے یہاں کوئی انسان دفن نہیں۔ مگر لکھنے والا کیا کرے کہ اس کی شہرت اسی نام سے ہے۔

برعکس نہند نام زنگی کافور

مقبرہ تمبولن بیگم

باغ کے عین وسط[1] میں مغرب جانب ایک چوتھا مقبرہ، دروازۂ کلاں کے مقابل، یا سڑک کے دوسری طرف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ بھی خسرو کی کسی بہن کا ہے۔ اور عرف عام میں "تمبولن" یا بی بی تمبولن کا مقبرہ کہلاتا ہے۔ یورپین مورخین میں سے اسٹیل، فشر، ہیویٹ اور کین صاحبان کے نزدیک غالب قرینہ یہ ہے کہ یہ وہی شاہزادی ہے جو فتحپور سیکری میں استامبولی بیگم کے نام سے شہرت رکھتی ہے۔ اس کے اندر نہ قبر کا نشان ہے نہ اس پر کوئی کتابہ۔

کرنیل نیوئل اس کے متعلق دو باتیں لکھتے ہیں۔ (۱) روایتاً ایسا مشہور ہے کہ تمبولن کا مقبرہ ہے۔ ممکن ہے کہ وہی فتحپور سیکری والی استانبولی بیگم ہو۔ (۲) دوسرا زبان زد قصہ یہ ہے کہ یہ مقبرہ خسرو کی ایک اور بہن نے اپنے لئے بنوایا تھا۔ مگر اتفاق وقت سے وہ کہیں اور مری اور وہیں دفن ہوئی[2]

ڈاکٹر فوہرر مقبرہ نہیں، بلکہ تمبولی بیگم کے مکان کے نام سے یاد فرماتے ہیں اور خسرو باغ کے خاص خاص حصوں میں اس کو شمار کرتے ہیں[3]

ڈاکٹر بینی پرشاد اپنی تاریخ جہانگیر میں رقم پرداز ہیں کہ ان تین روضوں کے علاوہ جن کا ذکر کیا گیا، اس باغ میں ایک چوتھی عمارت بھی ہے جو تمبولن کی قبر کہلاتی ہے۔ یہ انیسویں صدی میں مدت تک مسکن کا کام دیتی رہی۔ پھر لارڈ کرزن کے حکم سے اصلی صورت میں منتقل کر دی گئی[4]

سو برس پہلے بھی مسٹر ٹیل کو معلوم نہ ہو سکا تھا کہ یہ کس کا مدفن ہے۔ مشہور تھا کہ بی بی تمبولن کا روضہ ہے۔ بعض بودہ بائی کا بتاتے تھے[6]

خادموں کی روایت یہ ہے کہ تمبولی بیگم ایک ایرانی عورت تھی۔ اُس کو جہانگیر ایران سے لایا تھا،

۱؎ گزیٹیر سابق، مطبوعہ سنہ ۱۸۸۴ء صفحہ ۱۶۵۔ ۲؎ گزیٹیر جدید، سنہ ۱۹۱۱ء، صفحہ ۲۰۳۔ ۶؎ گزیٹیر جدید، سنہ ۱۹۱۱ء، صفحہ ۲۰۲۔

۳؎ ممالک مغربی و شمالی و اودھ کے عمارات قدیمہ اور ان کے کتابے، صفحہ ۱۳۱۔ ۴؎ صفحہ ۲۴۲۔ ۵؎ مفتاح التواریخ، صفحہ ۳۲۵۔

اور اُسی کے ہاتھ کے پان کھاتا تھا۔ عہدِ جہانگیری کا مورخ اس کے ماننے میں تامل کرے گا اور اس کے جزو و کل کو بداہتہً لغو بتائے گا۔

اس بارے میں کہ آیا اکبر کے حریم عشرت میں کوئی سلطانہ استامبولی بیگم تھی بھی، یا نہیں، شروع سے اختلاف اور گفتگو چلی آتی ہے۔ اہلِ فرنگ کی ایک جماعت اپنی دلبستگی اور جدت طرازی کے لئے ہمیشہ مُصر اور مدعی رہتی ہے، اور ہر محل پر استامبولی ملکہ اور اُس کے محل کا ذکر چھیڑ دیتی ہے۔ لفٹنٹ کرنیل ایچ اے نیویل "آگرہ میں تین دن" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "ٹرکش سلطانہ" کا مکان نہایت مختصر مگر فتحپور بھر میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے[۵۱] مسٹر ہیول[۵۲] نے بھی "آگرہ اور تاج کی ہینڈ بک" میں "ٹرکش سلطانہ" کے مکان کا احوال سپردِ قلم فرمایا ہے[۵۳] "قرونِ وسطیٰ کی تاریخ" میں مسٹر سی۔ ڈبلیو اسمتھ نے مغلیہ عہد کی تعمیرات کے ذیل میں "ٹرکش سلطانہ" کے گھر کا نام لیا ہے[۵۴]

مسٹر کین "آگرہ کی ہینڈ بک" میں فرماتے ہیں کہ فتحپور سیکری کے محلات میں عمارت کا ایک حصہ استامبولی بیگم یعنی اکبر کی ترکن بیوی کے نام سے منسوب و مشہور ہے[۵۵] پھر ایک صفحہ آگے چل کر ایک نوٹ میں رقم پرداز ہیں کہ الہ آباد کے خسرو باغ میں جو مقبرہ ہے، اور تمبولی بیگم کا کہلاتا ہے، ممکن ہے کہ یہی بگاڑ کر استامبولی کر دیا گیا ہو[۵۶]

---

[۵۱] صفحات ۹۶ و ۹۷۔ [۵۲] مسٹر ہیول EARNEST B. HAVELL ہندوستان کے صیغۂ تعلیم سے وابستہ ہو کر یہاں آئے تھے۔ پہلے مدراس کے مدرسۂ صنعت میں مامور ہوئے۔ پھر کلکتہ بھیج دیئے گئے۔ دس سال آرٹس اسکول کے پرنسپل اور گورنمنٹ آرٹ گیلری کے محافظ رہے۔ اسی زمانہ میں یونیورسٹی نے اپنا فیلو (رفیق) بنالیا۔ ہندوستان کی خدمات سے سبکدوش ہونے کے بعد سفارت خانۂ برطانیہ سے تعلق و توسل ہو گیا تھا۔ اس طرح کوپن ہیگن میں سات سال گزارے۔ سال ولادت ۱۸۶۱ تھا۔ ان کی زندگی کا آخری دن ۱۹۳۴ کا آخری دن تھا۔ اس لئے تاریخِ وفات بعض ۳۱ دسمبر ۱۹۳۴ء لکھتے ہیں اور بعض یکم جنوری ۱۹۳۵ء۔ اس ملک کی دستکاری اور صنعتوں کے بڑے قدرداں و مداح تھے۔ ان کی کتابیں اور تصنیفات بڑی عزت و استناد کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور نہایت تحقیق سے لکھی گئی ہیں [۵۳] صفحہ ۱۱۲۔ [۵۴] صفحہ ۲۷۲۔ [۵۵] صفحہ ۶۹ [۵۶] صفحہ ۷۹۔

ڈاکٹر فوہرر فتحپور سیکری کے محلات و تعمیرات کے سلسلہ میں کچھ زیادہ روشنی ڈالتے اور تحریر فرماتے ہیں[۵۱] کہ "خاص محل کے مغربی زاویئے پر ایک عمارت ہے جو جہانگیر کا مدرسہ کہلاتی ہے۔ جہاں سے ایک منقش پردہ دار دیوار کے باقیات و آثار شروع ہو جاتے ہیں، جو ٹھیک پورب کو زاویۂ مخالف کی سمت جاتے ہیں۔ یہاں پر اکبر کی ترکن بیوی کے کمرے تھے۔ جو 'رومی بیگم کا محل' مشہور ہے۔ واضح رہے کہ زبانی روایات کو چھوڑ کر کوئی سند اس بات کی نہیں ملتی ہے کہ اکبر کی کوئی عورت ترکن بھی تھی یا یہ کہ کوئی عیسائیہ رہی ہو۔ الہ آباد کے خسرو باغ میں ایک مقبرہ ہے جو تمبولن بیگم کا کہلاتا ہے، اور بنا بگاڑ کر 'استامبولی' کر لیا گیا ہے۔ اور اس طرح اس راز کا پتہ یہاں سے چل جاتا ہے۔"[۵۲]

مسٹر فرنیو Furneux ان سب سے بڑھ گئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ "یہاں (الہ آباد میں) قلعہ سے باہر ہر چیز جدید ہے بجز خسرو باغ کے، جہاں اکبر کی یوروپین بی بی جو استامبول سے آئی تھی، رہتی تھی، اور جہاں خسرو دفن ہوا تھا"[۵۳] چلتی پھرتی چھاؤں، یا گھومنے پھرنے والے انسان کی معلومات اور رسائی ذہن و قیاس اسی قدر ہو سکتی ہے۔

انجام سے بے پروا، آغاز سے بیگانہ پروانے کی دنیا ہے بیتابئ پروانہ

مسٹر کین اور ڈاکٹر فوہرر نے استامبولی کو غلط اور تمبولی (بیگم) کو صحیح سمجھا، اور مانا تھا۔ مگر ہمارے شہر (الہ آباد) کے ایک ہمہ داں پروفیسر نے اسی کو صحیح قرار دیا اور تائید کی ہے اور اپنے ایک آرٹیکل[۵۴] کے ساتھ کسی عشوہ باز، فتنہ گر، عربدہ جو، عصمت باختہ، حسن فروش تمبولن کی تصویر بھی دے دی ہے جسکو لکھنؤ کے عجائب خانہ میں میں نے بھی دیکھا ہے۔ یہ تسلیم ہے کہ ممدوح نے صاف طور پر اُس کو فتح پور سیکری کی محل والی یا اپنے یہاں (الہ آباد) کی مقبرہ والی نہیں لکھا مگر ایسے موقع پر اس لکھنوی تمبولن کا ذکر اور تصویر کیا کچھ اور معنی رکھتی ہے؟

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جہانگیر بھی آخر بشر ہی تھا، معصوم نہ تھا، آسمانی فرشتہ نہ تھا۔

---

[۵۱] صفحہ ۷۲۔ [۵۲] صفحہ ۷۳، کتاب مذکور۔ [۵۳] "ہندوستان کی جھلکیں" GLIMPSES OF INDIA مطبوعہ فلیڈلفیا، ۱۸۹۵ء، صفحہ ۲۲۶۔ [۵۴] مندرجہ لیڈر، یکشنبہ، ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۱ء۔

جس سے اس قسم کے افعال وحرکات کا سرزد ہونا محال عقلی ہو۔ یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ بعض ایسے افراد یا جماعتیں شیوۂ دلبری و دلربائی، دلکشی و رعنائی میں اُس وقت بھی ایسی ہی طاق و مشّاق ہوتی تھیں، جیسی آج کل ہوتی ہیں۔ ان کی شوخی و طراری، لگاوٹ اور عیاری دیکھ کر فارسی کا باختہ دل شاعر چلّا اُٹھا تھا۔

فتادند در کفرِ صبر و شکیب | حذر از کمر ہائے زنّار زیب
رہِ مایہ دارانِ ایمان زنند | بحذر وار نقدِ دل و جاں زنند

ہمارے فاضل دوست کا نظریہ یا حُسنِ ظن قابلِ التفات سہی، لیکن اس سے موافقت کرنا متعارف تاریخی حقیقتوں کو نظر انداز کر دینا ہے۔ اکبر نے خود اپنے پیشِ نظر، ذمہ دار عالی دماغ عمائد و امرا کے زیرِ نگرانی، تجربہ کار ماہرِ فن اتالیقوں سے، اپنے شاہزادوں کو تربیت و تعلیم، بازاروں میں نہیں، قلعوں اور محلات میں دلائی تھی۔ وہاں لونڈی باندیاں اور کنیزیں کیا کم تھیں، جو پیشہ ور عورتوں کی رسائی و گنجایش ہوتی۔ اخلاقی معیار بھی دونوں کا ایک یا مساوی نہ تھا، نہ ہو سکتا تھا۔ اُس وقت کی سوسائٹی بھی دونوں میں فرق کرتی تھی۔ ایک نگاہ سے نہیں دیکھتی تھی۔

آج کون بتا سکتا ہے کہ یہ عمارت کبھی واقعی آباد بھی ہوئی تھی اور کسی انسان کے جسم بے جان نے اس میں راحت پائی تھی یا نہیں۔ یہ تو تسلیم ہے کہ ہماری سرزمین پر مغرب (یورپ) والے بھی مُردوں اور مرے ہوؤں کی ہڈیوں کا آج کل ویسا ہی ادب و احترام فرماتے ہیں، جیسا مشرق (ایشیا) کے لوگ کرتے ہیں۔ مگر شاید ایک صدی پیشتر حالت اور تھی۔ اُس وقت کے فرنگ نژاد، بہادر، زندہ دلوں کو ہندوستان کے تیرہ و تاریک مُردہ خانوں سے خاصا لگاؤ تھا۔ خواہ استغنا سے ضرورت سے رہا ہو یا محض جذبِ نظر سے۔ یعنی اچھی اچھی کوٹھیوں اور فردوس نما بنگلوں کی کمی اس کا باعث رہی ہو، خواہ مقبروں کی عظیم الشان اور نفیس و خوشنما موزوں عمارتیں ان کو اپنی طرف کھینچتی ہوں۔ یا انھیں کے دلوں اور آنکھوں میں کوئی کشش خود بخود پیدا ہو جاتی ہو۔ بہر صورت، اوراقِ تاریخ اس کے گواہ ہیں کہ آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے بعض ملکی اور جنگی عہدہ دار

بادشاہی وقت کے مقبروں کا بیکار پڑا رہنا دیکھ نہ سکتے تھے۔ بعض کو اپنے رہنے کے لئے انتخاب فرما لیا تھا۔ یاد ہوگا کہ سر ولیم سلی مین اپنی خوش ذوق و خوش فکر رفیقۂ حیات کو ساتھ لے کر ممتاز محل (تاج) کے روضہ کی سیر کو گئے تھے۔ اپنے "سیاحت نامۂ و تذکرہ" میں لکھتے ہیں کہ "بیگم صاحبہ جب خوب گھوم پھر کر سب کچھ دیکھ چکیں، تو میں نے پوچھا" کہو اس عمارت کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے؟" بولیں، "کیا بتاؤں۔ کیا خیال ہے۔ میں تو یہ جانتی ہی نہیں کہ ایسی عمارت پر نکتہ چینی کیسے ہو سکتی ہے۔ البتہ آپ کو یہ بتا سکتی ہوں کہ میرا احساس کیا ہے۔ ایسی عمارت میرے لئے بنے تو کل ہی مر جانے کے لئے تیار ہوں[1]"

دیکھ کر سیر اس کی دنیا سے گزرنا سہل ہے   مقبرہ ایسا جو مل جائے تو مرنا سہل ہے

لیکن تو یہ محض ایک آرزو تھی۔ ایک نیک دل، نیک سیرت خاتون کا ارمان۔ دانشمندانِ فرنگ نقد کو نسیہ پر کیوں اٹھا رکھتے۔ جہاں جگہ پائی، گنجائش دیکھی، پڑ رہے۔ دخیل و قابض ہو گئے۔

سر ولیم سلی مین دہلی و آگرہ کی متعدد عمارتوں کا ذکر کرتے ہیں، جو گذشتہ دور حکومت یا کمپنی کی معمولی ناعاقبت اندیشانہ پالیسی کی نذر ہوئی تھیں۔ وہ اس قسم کی دراز دستیوں اور نیم وحشی حرکتوں کی دو فاحش مثالیں تو تنہا دہلی کی بتاتے ہیں۔ ایک۔ امام مشہدی کی نہایت خوبصورت سنگ مرمر کی قبر یادگار۔ یہ بزرگ اکبر بادشاہ کے پیر و مرشد تھے۔ دوسری اکبر کے چاروں برادرانِ رضاعی کا رفیع الشان و سنگین مقبرہ۔ فرماتے ہیں کہ "اس پر مدت تک مسٹر بلیک، متعلقہ بنگال سول سروس، .MR.BLAKE, B.C.S متصرف و قابض رہے۔ یہی صاحب حال میں[2] وحشیانہ طور پر جے پور میں مار ڈالے گئے ہیں۔ اپنے کھانے کی میزوں کے لئے جگہ اس طور پر بنائی یا نکالی تھی کہ سنگِ مرمر کا وہ تختہ دور کر دیا تھا جو مرنے والے ادہم خاں[3] کی لاش و استخواں کو چھپائے تھا

---

[1] ریمبلس اینڈ ری کلکشنس آف این انڈین آفیشل۔ از میجر جنرل سر ڈبلیو ایچ سلی مین، کے۔ سی۔ بی۔ صفحات ۳۷۶، ۳۷۸ و ۳۸۲۔ جلد اول۔ و نیز پرنس آف ویلس، مرتبہ ولیم ہاورڈ رسل، صفحہ ۴۴۲، باب ۱۱ مطبوعہ ۱۸۷۷ء۔

H.R.H. ALBERT EDWARD, PRINCE OF WALES' TOUR - by William Howard Russel, Pages 442-443 - 1877.

[2] ۱۸۳۴ء کا واقعہ ہے۔

[3] ادہم خاں، اکبر کا دودھ شریک بھائی، بڑا بہادر، نامور جنرل اور مقرب امیر تھا۔ مسٹر کین نے دہلی ہینڈ بک کے چھٹے ایڈیشن میں "ادہم کے مقبرے" کے زیر عنوان اس کا پورا حال لکھا ہے۔ نیز مسٹر بیل نے مفتاح التواریخ میں، صفحہ ۲۵۱۔

اور عمارت کے وسط میں تھا۔ باشندگانِ شہر نے ہر چند فریاد وواویلا کی، سماعت نہ ہوئی۔ طرفہ یہ کہ تختہ کو اکھاڑ لینے کے بعد دیوار کے مقابل ایک حرف کو بے احتیاطی سے ڈال دیا تھا۔ جہاں اب تک پڑا ہوا ہے۔ رعایا نے مسٹر فریزر سے[۵۱] جو گورنر جنرل کے قائم مقام تھے، عرض معروض کیا۔ عبث تھا۔ رؤسا نے بھی سمجھایا۔

ہے ڈر کی بات آگ سے کھیلا نہ کیجئے … تو دل کا داغ دے اُٹھے ایسا نہ کیجئے

بیکار ثابت ہوا (اور جو ہونے والا تھا، ہو کر رہا)۔ کچھ دن بعد یہ صاحب خود بھی قتل کر ڈالے گئے۔[۵۲]

مرزا غالب نے اپنے سرپرست و مربی کا بڑا دردانگیز مرثیہ اپنے مخصوص انداز میں زورِ قلم کے ساتھ لکھا ہے۔ سر ولیم فرماتے ہیں "عام لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ ان دونوں صاحبوں کی موت اُسی بے ادبی و گستاخی کی بدولت ہوئی جو انھوں نے اکبر کے کوکلتاش کے ساتھ کی تھی۔"[۵۳]

لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل کے مصاحبِ خاص اور رفیقِ سفر، مسٹر فرینچ لکھتے ہیں کہ ان کو جب ۱۸۳۸ء و ۳۹ میں دہلی جانے کا موقع ملا تو وہ اور ایک اور زیرک وہنرمند ذی مرتبت انگریز جو دنیا بھر کی سیاحت کر چکا یا کر رہا تھا، دہلی میں یکجا ہوئے اور دونوں نے تین دن قطب مینار میں گزارے۔ کسی عمارت کی ایک پرانی خلوت گاہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ صبح و شام باہر نکل جاتے اور قرب و جوار میں جو آثار و باقیات تھے، دن بھر چھانتے اور لطف اندوز ہوتے۔ تغلق آباد میں بھی قیام کی یہی صورت رہی۔[۵۴]

---

۵۱ مسٹر فرینچ کے سیاحت نامہ (صفحہ ۱۸) سے واضح ہے کہ فریزر صاحب قسمت دہلی کے کمشنر اور گورنر جنرل ہندستان کے ایجنٹ تھے۔ باشندگانِ شہر سے نہایت بے تکلف اور بڑے ملنسار اور خلیق انسان تھے۔ ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو قتل ہوئے۔ کریم خاں سپاہی قاتل اور نواب شمس الدین احمد خاں والی فیروزپور کو ان کے قتل کی پاداش میں پھانسی دی گئی۔ مقدمہ کی سماعت و فیصلہ کے لئے اسی الہ آباد سے مسٹر کالون صدر عدالت یا ہائی کورٹ کے جج خاص طور پر دہلی بھیجے گئے تھے۔ (صفحہ ۲۱) لیکن 'ادبی دنیا' کے رسالہ نمبر ۴ جلد ۸، ماہ جولائی ۱۹۳۳ء میں فریزر صاحب کی بوارفتہ مزاجی، ناہنجاری اور بدکرداری سے خوب پردہ اُٹھایا گیا ہے۔ ان کے قتل ہونے اور شمس الدین خاں سے ان کی، اور کارکنانِ کمپنی کی کاوش اور بدلہ لینے کے وجوہ اور پھانسی دینے کے حالات و واقعات مندرج ہیں۔ آثار الصنادید سے پایا جاتا ہے کہ مسٹر ولیم فریزر کرنیل جیمس اسکنر کے تعمیر کردہ گرجا میں جانبِ غرب دفن ہیں۔ (صفحہ ۲۸)۔ ۵۲ سیلیکس ہسٹری کلکشنس، حصہ دوم، صفحہ ۱۶۰۔ ۵۳ ایضاً۔

۵۴ سیاحت نامہ، صفحہ ۹۴۔

ڈنکن صاحب کو تسلیم ہے کہ لارڈ ہیسٹنگز اور لارڈ بینٹنک نے آگرہ کی بعض عمارتوں کے ساتھ بیدردی اور وحشیانہ پن کا برتاؤ کیا تھا[۵۱] سلی مین صاحب نے اس کا رونا خوب رویا ہے۔

دہلی کے آثار الصنادید میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔

(۱) "مسجد سرہندی" لاہوری دروازہ کے باہر بیگم کی بنوائی نہایت مرتفع سنگ سرخ کی تھی۔ ایک طرف سرا میر دہ اکرام کی تھی جو بحکم سرکار کمپنی بہادر منہدم کردی گئی اور مسجد کی دیوار بھی منہدم کردی گئی۔ سرا نہایت آباد و بارونق و آرام دہ تھی[۵۲]

ع

جو فنا کا نقش بن کر دیدۂ عبرت میں ہے

(۲) "بھول بھلیاں یعنی مقبرۂ ادہم خاں، جو اکبر بادشاہ کا کوکہ تھا، جس نے شمس محمد خاں غزنوی اکبر کے اتگہ[۵۳] کو مار ڈالا تھا اور اس کے قصاص میں اکبر نے ادہم کو قلعہ پر سے گرا کر مروا ڈالا تھا۔ یہ واقعہ ۱۲ رمضان ۹۶۹ھ ہجری کا ہے۔ یہ گنبد بھی اس زمانے کے بعد بنا ہے۔ گنبد چونہ اور پتھر سے بنا ہوا ہے اور اس کی دیواروں میں اوپر جانے کا رستہ ہے۔ دیوار دیوار گرد پھر سکتے ہیں اور اس میں...

...... بھول بھلیاں .... قطب صاحب کی عمارتوں میں یہ نامی عمارت ہے۔ اکثر صاحبان عالیشان اس میں آن کر اترتے ہیں اور اسی سبب سے اس کی قبر کا تعویذ برابر کردیا گیا ہے۔ باوجودیکہ مقبرہ اکبر کے وقت میں بنا ہے مگر قطع اس کی پٹھانی عمارت سے ملتی ہے[۵۴]"

(۳) قطب صاحب کی لاٹ کے قریب محمد قلی خاں کا مقبرہ تھا جو اکبر بادشاہ کا کوکہ تھا اور یہ عمارت بھی یا تو عہد اکبر شاہ کی رہی ہوگی، ورنہ جہانگیر کی۔ لیکن جب اس کے نصیب کھلے اور اس عمارت کے دن اچھے آئے، اسے صاحبِ والا مناقب عالی مناصب نے جن کے عدل و انصاف کے آگے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتا ہے اور ظلم و ستم دنیا سے نیست و نابود ہو گیا ہے آوازہ بلند ہمتی اور والا فطرتی کا، آویزہ گوش فلک ہے اور غلغلہ ان کی شوکت و حشمت کا زمین سے آسمان تک پہنچا ہے یعنی دریا نوال خدایگاں ابر کف، حاتم دوراں فرزند ارجمند بجاں پیوند سلطانی معظم الدولہ

۵۱؎ آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۱۱۵۔ ۵۲؎ آثار الصنادید، مطبوعہ ۱۸۷۶ء صفحہ ۹۴۔ ۵۳؎ دایہ کا شوہر۔ ترکی لفظ ہے۔ ۵۴؎ آثار الصنادید، مطبوعہ ۱۸۷۶ء صفحہ ۸۰۔

امین الملک اختصاص یار خاں سر طامس تیافلس مٹکف صاحب بارونٹ بہادر فیروز جنگ صاحب کلاں بہادر دار الخلافۃ شاہجہان آباد دام اقبالہٗ نے کوٹھی تیار کرائی"۔[۱]

یہ ارشادات اُنیسویں صدی کے سب سے بڑے رفارمر اور مصلح مسلمان سر سید احمد خاں بہادر کے ہیں۔ جن کی جرأتِ اخلاقی اور آزادروی ایک بڑی حد تک مسلّم ہے۔ مٹکاف صاحب کی بلند آہنگی کے ساتھ دادِ تحسین اس صلے میں دی جاتی ہے کہ اُنھوں نے محمد قلی کے مقبرے کو کُھدوا کر اُس جگہ اور اُس کے سامان سے اپنی شاندار کوٹھی تعمیر کرائی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۸۴۶ء تک یا آج سے اسّی نوے برس پہلے ان باتوں کے حاکم و محکوم دونوں خوگر ہو رہے تھے اور اس کو ظلم نہیں سمجھتے تھے یا اگر بُرا سمجھتے ہوں تو زبان پر لانے کی کس کو ہمت ہوتی تھی۔

(۴) سید صاحب یہ بھی فرماتے ہیں۔ کہ "مقبرۂ خانخاناں کا تمام سنگِ مرمر اور پتھر کی نفیس جالیاں اور گلکاری کی چیزیں اوکھاڑ کر آصف الدولہ کے وقت میں لکھنؤ بھیج اور بیچ دیا گیا۔ حتیٰ کہ مقبرہ کا تعویذ بھی اُکھاڑ لیا"۔[۲]

یہ وہی لکھ لُٹ آصف الدولہ ہے جس کی سیر چشمی عالی حوصلگی، داد و دہش اور فیاضیوں کی داستانوں کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا، اور حاتم طائی کے سوا کہیں اُس کی نظیر نہیں ملتی۔ رحمت ہو ایسے کفن کھسوٹ پر۔[۳]

۱۸۵۷ء کے محشر زا آشوب اور سرکار برطانیہ کے عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد بھی، شروع شروع میں، کچھ ایسی دست درازیاں ہوتی رہی ہیں۔ مسٹر فرینچ نے کبھی کسی اور وقت، پیشتر، دہلی میں سفید سنگ مرمر کا ایک بڑا وسیع طویل و عریض حمام دیکھا تھا۔ فرماتے ہیں کہ جب بادشاہ قید کر لیا گیا، بغاوت میں شرکت ثابت ہوئی، تو یہ حمام اُس کی محل سرا سے نکال کر ملکہ باغ میں رکھ دیا گیا۔ مقصود محض نمائش و آرایش تھی۔ عوام کے کام یا مصرف میں نہیں آتا تھا، یعنی فرشِ زمین پر ایک عجیب

۱؎ آثار الصنادید، صفحہ ۶۴۔ ۲؎ آثار الصنادید، صفحہ ۲۸۔ ۳؎ آصف الدولہ کی اخلاقی حالت نہایت خراب تھی۔ وہ لکھنؤ میں بیٹھا بیٹھا اپنی ماں (بہو بیگم زوجۂ شجاع الدولہ) کو ستایا کرتا تھا۔ اُن سے بار بار روپیہ وصول کرتا تھا.... اُس کی نالائقیوں کا کچھ ذکر مولوی عبد الحلیم شرر نے "گزشتہ لکھنؤ" میں کیا ہے۔ (صفحات ۱۱ و ۱۲)۔ نیز ملاحظہ ہو۔ سر جارج کاکس کی تاریخ حکومت انگریزی، صفحہ ۱۴۹۔ ۴؎ [illegible] تاریخ اودھ، جلد اول، صفحہ ۹۲۔

چیز کے طور پر ڈال دیا گیا تھا[۱]

گارسان دی تاسی صاحب GARCIN DE TASY کی تحریر [۱۰ دسمبر ۱۸۵۷ء]
سے پایا جاتا ہے کہ بغاوت فرو ہونے پر جس وقت دہلی میں "بشپ کا عہدہ قائم کرنے کا سوال زیر غور تھا، اُس وقت یہ تجویز بھی در پیش تھی کہ شاہجہانی جامع مسجد[۲] کو گرجا میں تبدیل کر دیا جائے۔[۳]

فتح گڑھ (مضافاتِ فرخ آباد) میں وہ مربع احاطہ موجود ہے، جس کے گوشوں پر کنگرے بنے ہیں۔ اور اندر ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ یہ عمارت اودھ کے جلا وطن شدہ وزیر نواب حکیم مہدی علی خاں نے ۱۸۲۳ء میں مسافروں کے قیام اور وارد و صادر کی راحت و آرام کے واسطے بنوائی تھی۔ جب سر کالن کیمبل اور اُن کے لشکر نے بعد بغاوت اس مقام کو پھر لے لیا تو یہ سرا! میس MESS کے طور پر عہدہ داران فوج کے استعمال میں رہی۔ سر ولیم رسل اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں کہ ۲۶ اپریل ۱۸۵۰ کو اُنھوں نے مسجد کے پاس وسط میں حاضری کھائی تھی۔ بھٹیارے یعنی سَرا کے محافظ بعد کو بے دخل کر دیئے گئے اور گورنمنٹ نے اس عمارت کو ذخیرہ خانہ بنا لیا۔ اب سَرا اور مسجد اپنے اصلی مصرف میں نہیں بلکہ ملٹری ورکس کے انجینیر کے تصرف میں ہیں۔[۴]

ملتان کو لیجئے جو ہندوستان میں دَورِ اسلامی کا سب سے پُرانا مقبوضہ اور آباد کردہ تھا اور اب صوبۂ پنجاب کا ایک مشہور و اہم تاریخی شہر ہے۔ نواب عبدالصمد خاں (سیف الدولہ دلیر جنگ) صوبہ دار نے یہاں شاندار جامع مسجد (عید گاہ) تعمیر کرائی تھی۔ جو ۱۷۳۵ء (۱۱۴۸ھ) میں تکمیل کو پہنچی تھی۔ ۱۸۱۶ء (۱۲۳۱ھ) میں سکھوں نے ملتان پر فتح پائی تو اس کو اصطبل بنایا، مسٹر ایگ نیو

---

[۱] حالاتِ سفر مسٹر سی جے فرینچ، مطبوعہ ۱۸۷۲ء، صفحہ ۹۶۔ [۲] ہیملٹن صاحب اپنے گزیٹیر میں لکھتے ہیں کہ یہ مسجد چھ سال میں بنی تھی۔ دس لاکھ خرچ ہوا تھا۔ مسٹر فرینچ فرماتے ہیں کہ عمارت کی عظمت اور شان و استحکام کو دیکھ کر یہ تخمینہ بہت کم معلوم ہوتا ہے۔ (سیاحت نامۂ بالائی ہند، مطبوعہ ۱۸۷۲ء، صفحہ ۸، نوٹ)۔ [۳] رسالہ "اردو" جنوری ۱۹۳۱ء، صفحہ ۲۶، جلد ۱۱، حصہ ۴۱۔ [۴] "فتح گڑھ کیمپ" از مسٹر سی ڈیل ووڈلیس، باب چہارم، صفحہ ۱۸، مطبوعہ "لکھنؤ" ۱۹۳۳ء۔

سی، ایس، اور لفٹنٹ اینڈرسن MR. AGNEW AND LT. ANDERSON جو سرکار انگریزی کی طرف سے خدمات خاص پر ملتان آئے تھے، اسی میں فروکش ہوئے تھے، اور اسی جگہ سکھ صوبہ دار کے حکم سے ۲۰ اپریل ۱۸۴۸ء کو نہایت بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیئے گئے۔ پھر جب انگریزوں نے قبضہ کیا تو یہ عمارت ڈپٹی کمشنر کی کچہری قرار دی گئی۔ مسلمانوں کی استدعا و کوشش پر ۱۸۶۳ء میں واپس ملی۔ مگر نہایت خستہ حال ہو گئی تھی۔[1]

اسی طرح، نواب علی محمد خاں درانی والی ملتان کی مسجد (معمرہ ۱۱۷۱ھ ۱۷۵۷ء) بھی سکھوں کے زمانے میں ناظم ملتان کی کچہری رہی تھی۔ ان کی مذہبی کتاب گرنتھ صاحب بھی اس میں رکھی گئی تھی۔ انگریزوں کی بدولت مسلمانوں کو واپس ملی۔[2]

دور کیوں جائیے اسی شہر الہ آباد میں شاہجہاں کے نامور گورنر نواب شایستہ خاں کی بنوائی ہوئی وسیع و رفیع مسجد قلعہ کے پاس تھی۔ ۱۰۵۶ھ [۱۶۴۶ء] میں اس کی تعمیر ختم ہوئی تھی۔ جب تک مسلمانوں کا اوج موج رہا۔ مسجد، مسجد رہی۔ عبادت کے کام آتی تھی۔ مسٹر بیل نے مفتاح التواریخ میں لکھا ہے کہ "الہ آباد میں کمپنی انگریز کی عملداری کے اوائل یعنی ۱۸۰۱ء میں کرنیل کیٹ صاحب نے اس کو تغیر و تبدیل کر کے اپنی بود و باش کا مکان بنا لیا تھا۔ دس سال بعد یعنی ۱۸۱۱ء میں کمپنی کے حکم سے [واگزار ہو کر] پھر اصلی صورت میں تبدیل کر دی گئی۔ آج (۱۸۴۹ء) تک موجود ہے، اور مسلمان جمع ہو کر دونوں عیدوں کی نماز یہیں پڑھتے ہیں"۔[3] عرصہ ہوا کہ یہ مسجد بھی گردشِ روزگار کے نذر ہو چکی۔ بشپ ہیبر صاحب نے بھی دیکھا تھا وہ اس کی بڑی تعریف کرتے اور اس کی خوبی موقع، بلندی، حسنِ مناظر، قربِ دریا کی تحسین فرماتے ہیں۔ مدت تک جمعہ و عیدین کی نماز و جماعت یہاں ہوتی رہی۔ آخر یہ حالت بھی انقلاباتِ حکومت و مصالحِ فوجی اور قربِ قلعہ سے قائم نہ رہی۔ موٹی موٹی دیواروں کے نشان اور کچھ آثار باقی ہیں، جن کا کچھ حصہ خشکی میں ہے اور کچھ دریا کے اندر تک چلا گیا ہے۔

---

[1] سفرنامۂ مولانا سید سلیمان ندوی، رسالۂ معارف، جلد ۳۳، صفحہ ۴۴۵۔ [2] سفرنامۂ مذکور، رسالہ معارف، جلد ۳۴، صفحہ ۴۴۶۔ [3] صفحہ ۳۶۹، مطبوعہ ۱۸۴۹ء۔

بس یہ کہئے کہ فوجی میدان میں اینٹ پتھر اور چونے کا ایک برائے نام ڈھیر باقی رہ گیا ہے۔[۱] پھر بھی

نظر کے ساتھ سر جھکتا ہے ہر ہر گام پر میرا ۔۔۔ مرے سجدوں کے قابل یہ نہیں معلوم ہوتی ہے

ان تغیرات کا ذکر کرنے سے کسی خاص جماعت، گروہ یا ذات پر الزام دینا یا اُن کے طریقِ عمل پر داغ لگانا مقصود نہیں۔ بلکہ صرف یہ بتانا ہے کہ زمانہ کی گردش اور حکومتوں کے لوٹ پوٹ کے ساتھ ساتھ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے زمانۂ اقتدار و سطوت میں جو کچھ کیا یا ہندوؤں میں سے جاٹوں[۲] اور سکھوں[۳] نے قدرت و قوت پاکر جو کچھ عمل فرمایا وہ تو پرانی باتیں اور بھولی بسری داستانیں ہو گئی ہیں۔ اگر آپ گزشتہ صدی کے نصف آخیر کے واقعات یاد کریں گے جو روشنی و تمدن اور علم و تہذیب کا دور گزرا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ جب بھی کم و بیش وہی ہوتا رہا ہے جس کو آج ہم قابلِ نفرت بتاتے ہیں۔

ہر کس نہ شناسندۂ راز است، وگرنہ ۔۔۔ ایں ہا ہمہ راز است کہ معلومِ عوام است

اس گنبد کا لحد سے خالی ہونا خواہ اتفاقات زمانہ سے ہو یا کسی ضرورت مند زبردست کی دستبرد سے۔ بہرحال یہ مسلم ہے کہ اس باغ کے یوروپین منتظم افسر کی بود و باش مدت سے چلی آتی تھی[۴]۔ بیسویں صدی کے شروع ہونے پر یعنی ہمارے وقت میں انقلاب و اصلاح کی ہوا چلی۔ زمانہ نے گردش کھائی۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن (آں جہانی) الہ آباد تشریف لائے۔ حسبِ معمول آثارِ قدیمہ کو، قلعہ کو، خسرو باغ کو ملاحظہ فرمایا۔ محتشم الیہ کو یہ انداز پسند نہ آیا کہ مُردوں کی جگہ زندے متصرف ہوں۔ فرمانِ قضا جریان نے چوبیس گھنٹہ کے اندر یہ عمارت سوپرنٹنڈنٹ صاحب سے خالی کرا دی۔ ہاں اسی قدر نہیں ہوا بلکہ اتنے ہی وقت کے اندر سوپرنٹنڈنٹ صاحب کا آرام گاہ اپنی اصلی حالت میں منتقل کر دیا گیا۔ اور پھر تمبولن کا مکان بن گیا۔ صاحب اور ان کے دفتر کے لئے بعد کو ایک قصرِ نفیس (کوٹھی) کمپنی باغ (الفریڈ پارک) میں تعمیر کرا دیا گیا۔

---

[۱] حیاتِ جلیل، حصہ دوم، صفحہ ۱۰۴، نوٹ نمبر ۱۰۲۔ [۲] مفتاح التواریخ، صفحہ ۵۱۹ (آگرہ کے قلعہ پر سورج مل جاٹ کا قبضہ)۔
[۳] حیاتِ زیب النساء، از منشی محمد دین فوق، صفحات ۲۰ تا ۲۲۔ [۴] تاریخ جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرشاد، صفحہ ۲۴۴۔ [۵] گزیٹیر سابق، صفحہ ۱۶۵۔

مسٹر ایچ جے ڈیوس H. J. DAVIS آخری سوپرنٹنڈنٹ تھے جو اس عمارت میں مقیم و فروکش رہے۔ انھوں نے اور ان کے پیش رووں نے اس ہر طرف سے کھلی ہوئی عمارت میں خوبصورت چوکھٹیں اور کواڑ لگائے تھے۔ ایک حصہ جو پہلے ہی سے گول بنا تھا، گول کمرہ بنا۔ اسی کے ایک پہلو یعنی سامنے کے برآمدے میں صاحب کا 'یا باغ کا سرکاری' دفتر قرار پایا۔

زیادہ دن کی بات نہیں ہے۔ اُس وقت کے دیکھنے والے اور ملتزمانِ خدمت موجود ہیں اور بتاتے ہیں کہ ایک نیک دل شریف النفس انگریز جو سُنی سنائی رِوایات پر عامل اور قدیمی معتقدات کا معترف و قائل تھا، اس کا بھی احترام و اکرام کرتا تھا۔ اُس کی طرف سے ہر جمعرات کو لوبان سلگایا جاتا تھا۔ ایک نشان (بظاہر قبر کا) ایک گول مرمت شدہ پیوند کی طرح گرد و پیش کے فرش سے اب بھی نمایاں اور ممتاز نظر آتا ہے۔ حسنِ سلیقہ اور بزم آرائی کی بدولت اس پر میز بھی گول بچھائی گئی تھی۔ قالینوں کا فرش تھا۔ با ایں ہم اس حصہ پر جانے اور پامال کرنے سے احتیاط و احتراز کیا جاتا تھا۔

یہ اطلاع کہ اس کو حتی الامکان اصلی صورت میں تبدیل کر دیا ہے غالباً صحیح ہوگی۔ بحالتِ موجودہ مقبرہ کی دونوں منزلیں یا دونوں طبقے (بالائی و زیریں) خوب صاف اور کھلے ہوئے ہیں۔ کواڑ اور کھڑکیاں سب دُور کر دی گئی ہیں۔ نہ کسی اور قسم کا کوٹھی کا سامان چھوڑا ہے۔ دونوں حصوں پر سفیدی سے یکساں قلعی کر دی گئی ہے۔ داغ دھبے یادر میانی تصرفات کی یاد دلانے والے نشانات سب چھیل دیے ہیں۔ کون جانتا ہے کہ زندوں کے تسلط سے پہلے اس پر کچھ نقش و نگار یا گلکاری و رنگ آمیزی تھی یا نہیں۔ بہر صورت

از یک حدیثِ لطف کہ آں ہم دروغ بود — امشب ندفترِ گلہ صد باب شستہ ایم

اب صرف ایک بات کہنا باقی ہے۔ مسٹر بیل کی اس تحریر کے سلسلہ میں کہ ایک چھوٹی قبر اور روض کے پچھم جانب ہے۔ کمپوزیج صاحب مسٹر ایسٹ وک کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ خسرو باغ میں نورجہاں کا ایک سینوٹاف CENOTAPH تھا۔[۱] سینوٹاف جرمن زبان میں بے قبر کے مقبرے کو کہتے ہیں، یعنی کوئی گنبد جو کسی ایسے کی یادگار کے لئے تعمیر ہوا ہو جو کسی اور جگہ دفن ہوا ہو۔ اس کا بہتر فیصلہ قاریانِ کرام کر سکتے ہیں کہ ان دونوں میں سے کون سا گنبد نورجہاں کا ہو سکتا ہے؟

---

[۱] جورنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۷ء، صفحہ ۶۰۰، نوٹ نمبر ۲۔

مرزا جہانگیر کا مدفن

یہ چبوترہ عوام الناس میں "خسرو کے گھوڑے کی قبر" کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔ اس شہرت ونام کے بارہ میں کوئی تحریری سند نہیں ملتی۔

یہ تسلیم ہے کہ کسی زمانہ میں مانوس و محبوب جانوروں کی یادگاریں بنا دینا اشبیلیہ کے اہلِ دولت و مقدرت کا شیوہ تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں کی متعدد مثالیں پیشِ نظر ہیں۔ چند پر قناعت کروں گا۔

اودے پور میواڑ کے رانا پرتاب[1] کا نام کس نے سنا نہ ہوگا جس نے اکبر کے دَل بادل لشکر کا مقابلہ بڑی شجاعت و دلاوری سے کیا تھا۔ چیتک نام گھوڑا اُس کے زیر ران تھا۔ شکست کھائی تو اسی پر بھاگا۔ مغلوں نے پیچھا کیا۔ چیتک گھایل تھا اور ایک ندی حائل۔ پھر بھی جنگلی ہرن کی طرح چاروں پتلیاں جھاڑ کر پانی پر سے اُڑ گیا۔ شام ہو گئی تھی۔ اس کے نعل پتھروں پر پڑتے، ٹکراتے اور چنگاریاں اُڑاتے چلے جاتے تھے۔ ایک موقع پر پہونچ کر چیتک بے دم ہو کر ہمیشہ کے لئے رہ گیا۔ وہاں اُس کی یادگار میں ایک عمارت بنوائی گئی۔ اودے پور کی آبادی میں آدھے گھسے ایسے ہوں گے جن کی دیواروں پر اس کی تصویریں کھنچی ہیں[2]۔

مولوی سعید احمد مارہروی تاریخ آگرہ[3] میں لکھتے ہیں "مغلوں اور اُن کے اُمرائے مقابر کی تعمیر کا شوق اس درجہ تھا کہ انسان تو انسان گھوڑوں، کتوں اور ہرنوں وغیرہ حیوانات کی یادگار میں بڑی بڑی عمارات یا موریں اس ملک میں تعمیر کی گئیں۔ چنانچہ آگرہ میں اکبر بادشاہ کے ایک وفادار کتے کا عالیشان مقبرہ باہتمام دربار خاں تعمیر کیا گیا تھا۔ دربار خاں بھی اپنی وصیت کے بموجب اسی مقبرہ میں دفن ہوا[4]۔"

---

[1] ٹوبل صاحب کی ڈکشنری، صفحات ۲۱۵ و ۳۲۲۔ [2] دربارِ اکبری، صفحہ ۵۲۰۔ [3] صفحہ ۰۔ [4] نیز ترجمہ مآثر الامراء از بیورج، صفحہ ۴۴۳۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی، مآثر الکرام میں تحریر فرماتے ہیں کہ سید محب اللہ بلگرامی شاہزادہ محمد اعظم کے متوسل و معتمد منصب دار تھے۔ شاہزادہ جب اوجین کا صوبہ دار مقرر ہوا تو میر بھی اوجین چلے گئے اور وہیں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ فوج سے الگ ہو گئے اور سرائے سسئی کے قریب پہونچے۔ سرا کے دروازہ کے سامنے سایہ دار درختوں کے نیچے گھوڑے سے اُترے۔ زین پوش بچھا کر بیٹھے۔ وردی اُتار دی۔ سفید لباس بدلا۔ شربت پیا۔ تلاوت میں مشغول ہوئے۔ پھر چادر اوڑھ کر لیٹے اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وہاں کے حاکم نے قبر مع چبوترہ اینٹ اور گچ سے پختہ بنوا دی۔ ان کے گھوڑے نے بھی دانہ گھاس چھوڑ دیا تھا۔ رات دن آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ لوگوں سے اس بے زبان ماتمگسار کی حالت دیکھی نہ گئی تو گھوڑے کو ذبح کر کے ان کے مزار کے پائین دفن کر دیا۔ گھوڑے کی قبر مربع پختہ و مضبوط تعمیر کی گئی تھی۔ دستور کے مطابق ساتھ ساتھ کنواں بھی بنایا گیا تھا۔[1]

عمارت مقبرہ خسرو کے ذیل میں گزارش ہو چکا ہے کہ شاہزادہ خسرو کے مرنے کے بعد اُس کے کسی گھوڑے کے الہ آباد پہونچنے اور دفن ہونے کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ جب حرمان نصیب شاہزادے کا دردرس و عزادار کوئی نہ تھا تو اُس کے کسی بے زبان رفیق کا پُرسانِ حال کون ہوتا اور کیوں اتنا احترام کرتا۔ پھر بادشاہزادہ (خسرو) کی قبر کے پاس ہی، اس نُزہت گاہِ سلطانی میں، جہاں شاہزادوں، اُمرا اور بیگمات کی آمد و رفت بلکہ سکونت بھی رہتی تھی، کسی حیوان کا دفن کیا جانا قیاس سے بعید اور شاہانہ آداب و شان سے دُور ہے۔ رنگینیٔ خیال کو رسوا نہ کیجئے۔ خسرو کا توسنِ راہوار اگر یہاں دفن ہوتا تو اُس پر تمام عمارت شاہانہ اہتمام و حوصلہ کے ساتھ سنگین و مرمریں، جہانگیری عمارات کے نمونہ پر بنائی جاتی۔ گنبد بھی اُسی رفعت و شان کا تیار کیا جاتا۔ جس پر قدامت و کہنہ سالی خود بخود نثار ہوتی۔ آج یہ اینٹ چونے کا معمولی چبوترہ بہ اول نظر کہہ دیتا ہے کہ وہ کوئی پُرانی چیز یا نشانی پیش نہیں کر سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ جگہ شاہزادہ مرزا جہانگیر کا عارضی مدفن رہی ہے۔ اِس لئے اس کا استحکام و احترام باقی ہے۔ راست و دروغ بذمۂ راویاں۔ اُن کی شہ سواری اور اُن کے سمندِ تیز گام کا حال جو کچھ

---

[1] پرگنہ سپیری ہیں، مابین نرود کالا باغ۔ صفحہ ۳۰۔ سنہ صفحہ ۱۲۹۔

سُنا جاتا ہے، ابھی حوالۂ قلم کیا جائے گا۔ یہ تیموری نسل کے آخری لعلِ شب چراغ تھے، جن سے نہ صرف خسرو باغ بلکہ سارا الٰہ آباد روشن و بارونق تھا، جیسا کہ ان کی وفات کے قطعاتِ تاریخ شاہد ہیں۔ مرزا اس باغ میں سالہا سال رہے تھے۔ پیوندِ خاک ہونے پر بھی اسی قطعۂ زمین نے اُن کو برسوں اپنی آغوش میں رکھا تھا۔ ان کے متعلق، مختلف حالات مختلف تاریخوں میں ملتے ہیں۔ ان کو گزرے ہوئے بہت زمانہ نہیں گزرا، اس لئے بہت سی رِوایتیں اور حکایتیں پچھلوں سے سنی سنائی یا اِدھر اُدھر لکھی ہوئی اب تک زبانوں پر ہیں۔

عالم زماتمی وز افغان ما پُر است　　شد عندلیب خاک و چمن از نوا پُر است

مرزا کا ذکر مختصراً آغازِ کتاب میں کر چکا ہوں[۱]۔ مزید احوال کسی قدر تفصیل بلکہ تطویل کے ساتھ بعض اصل ماخذوں سے نقل کیا جائے گا۔ تاکہ ہوشمند و ذی فہم پڑھنے والے اس سے مستفید ہو سکیں۔ اور تکرار و اعادۂ واقعات سے قطع نظر فرما کر، سلسلۂ حالات کو مربوط کر لیں۔ دو باتیں یاد رکھنا ضروری ہیں:۔

(۱) تیمور گورگان کی آخری ہندوستانی نسلوں میں ایک تاجدار last but one گزرا ہے ابو نصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی۔ جس سے ملک اور تاج دونوں رخصت ہو چکے تھے، لیکن رہنے سہنے کے لئے شاہ جہان صاحب قراں کا لعل قلعہ اور بیٹھنے کے لئے چغتائی باپ دادا کا تخت باقی تھا اور اقلیمِ سخن پر حکمرانی۔ باپ شاہ عالم ثانی "آفتاب" تھا تو بیٹا "شعاع" ہوا۔ شاعری کی دنیا میں اسی نام یا تخلص سے چمکا۔ یہ محض بے اختیار خطابی بادشاہ تھا، نہایت رحیم و کریم۔ اور جیسا کہ مفتی غلام سرور لکھتے ہیں انگریز اس کی عزت و حرمت کا پاس بے حد کرتے تھے[۲]۔ اس کا عہدِ سلطنت ۱۸۰۶ء (۱۲۲۱ھ) سے ۱۸۳۷ء (۱۲۵۳ھ) تک یعنی بتیس سال شمار ہوتا ہے۔ اسّی برس عمر پائی تھی۔ اس کی اولاد میں دو شاہزادوں[۳] کے نام اوراقِ تاریخ پر روشن نظر آتے ہیں۔ ایک، ابو ظفر بہادر شاہ ثانی جس کو ۵۷ء کے

---

[۱] صفحہ ۱۳۔ [۲] گنجینۂ سروری یا گنج تاریخ، صفحہ ۱۸۰، حاشیہ اول۔ [۳] ایک تیسرے شاہزادہ سلیم کا نام بھی ملتا ہے۔ قرینہ و قیاس چاہتا ہے کہ مرزا جہانگیر ہی کا اصلی نام سلیم رہا ہو۔ اس کی طرف باپ کا شغف اور مہر و شفقت کی نگاہ بھی اوروں سے زیادہ تھی۔ مرزا اسد اللہ خان غالب نے آخر ماہ ذی قعدہ ۱۲۵۰ھ (مارچ ۱۸۳۵ء) میں ایک قصیدہ بڑے زور کا لکھا تھا۔

ملکی انقلاب اور لشکری شورشوں کے طفیل برائے نام بادشاہی کے نام کو بھی خیرباد کہنا پڑا تھا۔ یہ لعل بائی کے بطن سے تھا۔ دوسرا مرزا جہانگیر، ممتاز محل سے۔

جس کاان کی کلیاتِ فارسی میں تیرھواں نمبر ہے (صفحہ ۲۱۲)۔ شروع کے دونوں شعروں میں وقت کی تصریح بھی کردی ہے جشنِ جلوس، نوروز اور عیدِ قرباں کے مبارک موقعہ پر دربار میں پیش کیا تھا۔ مرزا غالب بڑے زمانہ شناس، مصلحت بیں اور دور اندیش تھے۔ باپ کے ساتھ ساتھ بیٹے کی بھی مدح وثنا کرتے جاتے ہیں۔

ستایشِ شہ وشہزادہ می کنم آہنگ — بسازِ حسنِ ادب در مقامِ ذوقِ سلیم

بلکہ شاہزادہ کو پہلے یاد کرتے اور اس ترجیح وپیش آورد کی معقول توجیہ فرماتے ہیں۔

زشاہزادہ نخست آورم سخن کہ بہ باغ — شگوفہ را بہ ثمر در نمو بود تقدیم

اسی کے مطلعِ ثانی میں شاہزادہ کا نام لیا ہے۔

زہے مناسبتِ طبع شاہزادہ سلیم — بہ فیضِ تربیتِ بادشاہِ ہفت اقلیم

قصیدہ کو حسبِ معمولِ شعرا دعا پر ختم کیا ہے۔ خدا سے چار چیزیں مانگی ہیں۔

عطیۂ بخششِ مہر و عطائے پذیرشِ ماہ — بقائے پادشہ و عیشِ شاہزادہ سلیم

لیکن یہ قصیدہ سنہ ۱۲۵۰ھ کا ہے اور مرزا جہانگیر ۱۲۳۶ھ میں اس عالم سے رخصت ہوچکے تھے۔ ظاہر ہے کہ سلیم کوئی چوتھا شاہزادہ تھا۔

آبِ حیات شعرا کا تذکرہ ہے، مرشدزادوں کا نہیں۔ لیکن لکھنے والا دلّی کا لعل قلعہ کا نشینی بھیدی اور اُن وقتوں کا داستان گو ہے۔ فرماتا ہے کہ "ممتاز محل کی خاطر سے اکبر شاہ کبھی مرزا سلیم کبھی مرزا جہانگیر وغیرہ شاہزادوں کی ولیعہدی کے لئے کوششیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مرزا ابوظفر میرے بیٹے ہی نہیں۔ مقدمہ اس کا گورنمنٹ میں دائر تھا۔" (صفحہ ۴۲۹ طبع اول لاہور ۱۸۸۰ء)

مرزا عرش تیموری (رسالہ ساقی دہلی اپریل ۱۹۳۶ء صفحہ ۸۵ میں) تحریر کرتے ہیں کہ مرزا سلیم کا انتقال اکبر ثانی کی حیات ہی میں ہوچکا تھا۔ فیروز شاہ انھیں کے بیٹے تھے۔ اکبر ثانی ان دونوں (باپ بیٹے) کو بہت چاہتے تھے۔ سلیم ہی کی ولیعہدی کے لئے تمام کوششیں کرڈالی تھیں۔ چوتھے شاہزادے کا نام مرزا بابر تھا۔

مگر بیل صاحب فیروز شاہ کو سرغنۂ باغیان اور ابوظفر بہادر شاہ کا فرزند لکھتے ہیں نہ کہ اکبر شاہ کا۔ (ڈکشنری صفحہ ۹۳)

(۴) مشہور ہندوستان نژاد مورخ ولیم طامس بیل نے اورینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری میں مرزا جہانگیر کو بڑا بیٹا لکھ دیا ہے[۱] آئینِ تیموری نیز دنیا کے پرانے معمول و دستور کے مطابق اُس کو خود بخود ولی عہدِ سلطنت قرار پاجانا چاہئے تھا۔ اور اس طرح ساری بنائے نزاع ختم ہوجاتی اور قصہ پاک ہوجاتا ہے۔ مگر یقیناً یہ موصوف کا سہو ہے۔ ان کی غلطی مستند و معاصر لکھنے والوں کی تحریرات سے آشکارا ہوجاتی ہے۔

مسٹر سٹین SETON سنہ ۱۲۲۰ھ[۲] (سنہ ۱۸۰۵ء) میں شاہ جہان آباد کے عہدۂ رزیڈنٹی پر مامور ہوئے۔ ان سے اور مرزا جہانگیر سے شدید ناچاقی ہوگئی تھی۔ سنہ ۱۸۰۹ء یا بقول سلی مین سنہ ۱۸۰۷ء[۳] میں ان پر مرزا نے طمانچہ (تفنگچہ[۴]۔ پستول) سر کیا۔ وہ بچ گئے اور یہ نظر بند کرکے الہ آباد بھیج دئے گئے۔ گیارہ بارہ سال اسی باغ میں رہے[۵] الزام تو ان پر سخت تھا لیکن یا تو ان کی عظمتِ مرتبت و شاہزادگی کی بدولت، یا کسی اور مصلحتِ ہنگامی و ملکی کے لحاظ سے یا اُن وقتوں کے کسی رعایتی آئین و قانون کے رُو سے، یا حسب تحریر راجہ دُرگا پرشاد سندیلوی عفوِ تقصیرات کے بعد ان کی نگرانی اور دیکھ بھال میں چنداں جبر و سختی کو راہ نہیں رہی تھی۔ انھوں نے سنہ ۱۲۳۶ھ (سنہ ۱۸۲۱ء) میں اس زندانِ آب و گِل سے رہائی پائی تو اسی باغ میں ان کو اپنے دادا، سلطان خسرو، کی قبر کے پاس جگہ دی گئی[۶] کچھ دن بعد (یا حسب تحریر سر ولیم سلی مین سنہ ۱۸۳۲ء میں[۷]) انگریزوں سے اجازت ملنے پر ان کی لاش، یہاں سے نکال کر دہلی بھیجی گئی۔ نواب ممتاز محل، ان کی ماں کو ان کے مرنے کا بڑا رنج و قلق تھا۔ وہ اس حالت میں بھی اپنے لختِ جگر کا اپنے سے دُور رہنا برداشت نہ کرسکیں۔ ان کی اُلفت اس پیکرِ بے جان کی کشش کا باعث ہوئی۔ نواب مختار الدولہ خواجہ وحید الدین احمد خاں

---

[۱] صفحہ ۱۲۸۔ [۲] تاریخ جہسد دلیہ، صفحہ ۲۴۳۔ [۳] سیاحت نامہ، جلد دوم، صفحہ ۱۶۷۔ نوٹ ذیلی۔ [۴] اویماقِ مغل، صفحہ ۶۰۰۔ [۵] مفتاح التواریخ، صفحہ ۵۷۰۔ [۶] مفتاح التواریخ، صفحہ ۵۷۰۔ بیلس ڈکشنری، صفحہ ۱۲۸۔ [۷] جلد دوم، صفحہ ۱۶۷۔ نوٹ۔ مگر یہ غنیم تعمیر مقبرہ کا سال معلوم ہوتا ہے، مطابق ۱۲۴۸ھ۔

بہادر اس خدمت یعنی لاش کی ہمراہی اور لے آنے پر تعینات کئے گئے۔ یہ اکبر شاہِ ثانی کے وزیرِ اعظم نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ[۱] کے رشید خلف اور جواد الدولہ سید احمد خاں بہادر عارف جنگ کے ماموں[۲] تھے۔ لاش کے دہلی پہونچنے پر بڑا ماتم ہوا۔ وہ لاش جو خسرو باغ میں ایک سادے سے مٹی کے ڈھیر کے نیچے دبا دی گئی تھی، درگاہِ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے صحن میں محمد شاہ بادشاہ کے مجرے کے پاس شاہانہ مراسم واہتمامات کے ساتھ دفن کی گئی[۳]۔ اس پر ایک شایانِ شان مجر سرتاپا سنگ مرمر کا تیار ہوا[۴]۔ اہلِ نظر کہتے ہیں کہ مرزا کا مجر بعینہ محمد شاہ کے مجر کی نقل ہے، اس کی جالیاں بھی بہت باریک و نازک ہیں۔ سید صاحب اس سے بھی نفیس تر و پُر تکلف بتاتے ہیں۔ "البتہ سنگِ مرمر ویسا آبدار و شفاف اور بے جرم خوش رنگ و خوش قماش نہیں پایا۔ تاہم اپنی جگہ یہ بھی عجائب روزگار سے ہے۔ یہ مجر ۱۲۴۳ھ کی تعمیر ہے"[۵]۔ تحفۃ الابرار یعنی کلیاتِ جدولیہ[۶] میں بھی یہی سال ۱۲۴۰ھ لکھا ہے۔ بقول سرسلی مَن لاش لے آنے کی اجازت ۱۸۳۲ء میں ملی تھی۔ یہ سال ۲۴ رجب ۱۲۴۷ھ کو شروع ہوا تھا۔ لامحالہ الہ آباد آنے اور لاش لے جانے میں بھی کچھ زمانہ لگا ہوگا۔ مجر کی تکمیل کی نوبت ۱۲۴۰ھ میں پہنچی ہوگی۔ یہ بھی آشکار ہے کہ ایک تنگ حال شخص کے لئے جو خود دوسروں کا دست نگر ہو، اس چیز کے لئے بھی سرمایہ فراہم کر لینا آسان نہ تھا۔ میرا مقصود بے خطا خطابی شہنشاہ اکبر ثانی سے ہے۔ جس نے لال قلعہ دہلی کی موتی مسجد سے سنگ مرمر کے کواڑ اُتار کر اس مقبرہ میں چڑھائے تھے[۷]۔ یہ مجر اب تک بہت اچھی حالت میں ہے۔ اس پر کوئی کتبہ یا قطعۂ تاریخ کندہ نہیں ہے۔

فرخ آباد کے دلچسپ کارنامۂ وقائع "لوحِ تاریخ" سے پایا جاتا ہے کہ ملکہ ممتاز محل کو مرزا جہانگیر کا غم

---

[۱] جن کے حالات میں سرسید نے سیرتِ فریدیہ لکھی ہے۔ مطبوعہ مفید عام آگرہ۔ خواجہ صاحب بڑے محقق و مصنف گزرے ہیں۔ فن پر کار سازی پر فارسی میں ایک عالمانہ رسالہ فوائد الافکار فی اعمال الفرجار یادگار چھوڑا تھا۔ نیز سوانح عمری مولوی سمیع اللہ خاں، مطبوعہ ۱۹۰۹ء، صفحہ ۲۱۱۔ و۔ مشاہیرِ اسلام، صفحہ ۲۳۶۔ د۔ بلیس ڈکشنری، صفحہ ۷۰۔ [۲] سوانح مذکورہ صفحہ ۳۱۔ [۳] قاموس المشاہیر، صفحہ ۱۸۲۔ و۔ ڈکشنری، صفحہ ۲۴۰۔ [۴] مفتاح، صفحہ ۵۶۷۔ [۵] آثار الصنادید، صفحہ ۴۰۔ [۶] صفحہ ۵۵۔ [۷] رسالۂ شاہکار، لاہور، اکتوبر ۱۹۳۵ء، صفحہ ۱۸۔

والم مدتوں رہا تھا۔ حتےٰ کہ جب ۱۲۳۹ھ (۱۸۲۴ء) میں نواب خادم حسین خانِ شوکت جنگ رئیس فرخ آباد نے دہلی میں وفات پائی اور اُن کی نعش چند روزہ تدفین یا تفویض کے لئے "قلعۂ دہلی کے نیچے سے ہو کر گزری تو بیگمات میں ایک شور ماتم اور فریاد کا برپا ہوا۔ علی الخصوص مادر جہانگیر شاہزادے کو نہایت قلق اور کوفت گزرا۔ اور آواز نوحہ کی بلند کی۔ اور اُس حالت میں اُن کی زبان پر گزرا کہ آج غم اپنے جہانگیر شاہزادے کے مرنے کا پھر مجھ کو تازہ ہوا کہ جیسے وہ پردیس میں جا کر موئے تھے ویسے ہی یہ بھی غریب الوطن ہو کر بے یار و غمگسار فوت ہوئے"۔[1]

سر ولیم سلی مین نے اپنے سفرنامہ میں مرزا کی نسبت دوستانہ رنگ میں جو کچھ لکھا ہے اُس کو پڑھ کر بے اختیار غالب مرحوم کا ایک شعر یاد آجاتا ہے۔

بہ من چنداں گنہ از بدگمانی می کند نسبت　　　کہ من ہم در گماں افتادہ پندارم گنہگارم

وہ ذاتی شناسائی اور مشاہدۂ حال کے مدعی ہیں، اس لئے مجھے اُن کی تحریر کے نقل کر دینے سے چارہ نہیں۔ اس سے دہلی کے سنگین حظیرے کی تعمیر کا صحیح حال اور انگریزوں کی نگاہ میں اُس کی خوبی و شان کا پتہ بھی چل جائے گا۔

"مرزا جہانگیر دہلی میں سنگِ مرمر کے ایک روضہ میں دفن ہیں۔ جس پر نہایت عمدہ نقاشی کی گئی ہے (ملاحظہ ہو نوٹ) مرزا جہانگیر اکبر ثانی بادشاہِ حال کے بیٹے تھے۔ مرزا جہانگیر کو میں الہ آباد سے اچھی طرح سے جانتا تھا۔ نیپال کی لڑائی کے ختم ہونے کے بعد اپنی رجمنٹ کے ساتھ میرا قیام الہ آباد میں رہا تھا۔ یہ ۱۸۱۶ء کی بات ہے۔ ان کو ہاف مین کی چیری برانڈی HOFFMAN'S CHERRY BRANDY کا بے حد شوق تھا اور جلد سے جلد اپنے کو اس کے ہاتھوں ختم کر رہے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ "صرف یہی تو ایک شراب ہے جو واقعی تم انگریزوں کے یہاں پینے کے قابل ہے۔ اور اس میں صرف ایک ہی عیب ہے کہ انسان اس کو جلد سے جلد پی جاتا ہے"۔ وہ اپنا لطف قائم رکھنے کے لئے ہر گھنٹہ ایک بڑا گلاس پی لیتے تھے، یہاں تک کہ سرشار و مدہوش رہتے۔ اس اثنا میں باجا بجانے والوں اور

---

[1] تالیف ۱۲۴۳ھ۔ صفحہ ۲۶۷۔ قلمی، کتاب خانۂ صمدن۔ بزبانِ اُردو۔

ناچنے والیوں کے دو تین طائفے اُن کے لُطف و تفریح کے لئے باری باری مشغول خدمت رہتے تھے۔ مرزا کی موت جلد آگئی۔ اُن کی ماں بادشاہ بیگم جن کو معمر بادشاہ بہت محبوب رکھتا تھا، بادشاہ کو یہ یقین دلاتی رہیں کہ انگریزوں کا برتاؤ اُس کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ وہ رنج و آہ کرتے کرتے رخصت ہوگیا۔ انگریز اُس کو دہلی میں نہیں رہنے دیتے تھے کیونکہ وہ برابر اسی فکر و تدبیر میں لگا رہتا تھا کہ اپنے بڑے بھائی شاہزادہ ولی عہد کو مروا ڈالے۔ وہ رعایا میں شورشیں برپا کرنے کی کوششیں کیا کرتا تھا سو وہ الہ آباد میں اسیر و حبس کی حالت میں نہ تھا۔ صرف اُس کو دہلی واپس جانے کی ممانعت تھی۔ اُس کا مکان شاندار تھا۔ آمدنی معقول تھی اور اُس کے مرتبہ و شان کے مطابق تمام اعزاز برقرار تھے"۔

"(نوٹ تحتی)۔ لفٹننٹ ہارکوٹ اپنی تاریخ کے صفحہ ۱۰۹ میں صحیح لکھتے ہیں کہ یہ قبر دستکاری کا ایک بے مثل، حد درجہ کامکمل، نمونہ ہے۔ خود قبر زمین سے کئی فٹ بلندی پر ہے۔ اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں ہیں۔ اس کے گرد نہایت خوبصورت تراشا ہوا سنگ مرمر کا پردہ (حظیرہ) ہے۔ تابوت پر اعلیٰ درجہ کی دستکاری کی گئی ہے۔ پھول پتے سنگ مرمر کے بنے ہوئے اس کو اپنے اندر ڈھانپے ہوئے ہیں۔ قبر ۱۸۳۲ء میں تیار ہوئی تھی"۔[۵]

راجہ درگا پرشاد نے گلستانِ ہند میں مرزا جہانگیر کے ذاتی حالات اور بعض واقعات تحریراتِ بالا سے زیادہ لکھے ہیں اس لئے اُن کا اعادہ ضروری نظر آتا ہے۔

(شاہِ عالم کی وفات پر بتاریخ ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء اکبر شاہ ثانی تخت پر بیٹھے، تو حسبِ معمول فرامین جاری کئے۔ عہدے تقسیم فرمائے، خلعتیں دیں۔ صاحب رزیڈنٹ بہادر کو ناظم الدولہ ودستدار خاں شہامت جنگ صوبہ دارِ دہلی و مدار المہام مقدماتِ مالی و ملکی و خالصہ کا خطاب ملا۔ مرزا ابوظفر فرزند اکبر کو حسب تجویز رزیڈنٹ صاحب ولیعہدی میں لیا۔ سید وصی الدین خاں کو خطاب سیف الدولہ اور وکالت رزیڈنٹی پر ممتاز کیا۔ لیکن بادشاہ کا تعلقِ خاطر مرزا جہانگیر فرزندِ دوم کی طرف تھا اور اُس کی ماں سے پیشتر ہی اس امرِ خطیر کا وعدہ کر چکے تھے اس لئے سب کے سب اس انتظام کی تغییر کی فکر میں ہوئے۔ راجہ جے سکھ لال

---

[۵] جلدِ دوم، صفحہ ۱۶۷۔ [۶] مفتاح التواریخ، صفحہ ۵۶۴۔ و تاریخ بادشاہانِ دہلی، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۲۶۳ھ، صفحہ ۱۵۔

بقال تحفوں اور ہدیوں کے ساتھ مرزا ابوظفر کی ولیعہدی کی تنسیخ اور مرزا جہانگیر کو یہ منصب جلیل دلانے کے لئے کلکتہ بھیجے گئے۔ مگر ناکامی ہوئی۔ رزیڈنٹ صاحب سے کدورت پیدا کر لی۔ اسی زمانہ میں ایک روز بادشاہ نشاط و تفریح کے لئے شکار کھیلنے کوٹلہ فیروزشاہ کی طرف تشریف لے گئے تھے کہ رزیڈنٹ صاحب نے چند ضرب توپ در دولت پر حاضر کیں، تاکہ بادشاہ کی واپسی پر مراتب سلامی بجالائیں۔ ان بے عقلوں نے توہمات گوناگوں پیدا کر لئے اور کچھ اور معنی لگائے۔ بادشاہ کو خبر کی گئی۔ تلاطم عظیم پڑ گیا اور اُردوے بادشاہی میں قیامت برپا ہو گئی۔ رزیڈنٹ صاحب نے انواع استمالت و اظہار امور اطاعت سے بادشاہ کو مطمئن کر کے قلعہ میں پہنچا دیا۔ اُس روز سے قطعی ممانعت ہو گئی کہ بادشاہ کبھی قلعہ سے باہر نہ نکلنے پائیں۔ مقربان خدمت کی نافہمی اور بادشاہ وقت کی سادہ لوحی سے یہ صورت بھی باقی نہ رہی۔ یہ کدورت ابھی دلوں سے رفع نہیں ہونے پائی تھی کہ تازہ گُل کھلا۔ مرزا جہانگیر کثرت شراب سے ہر وقت مخمور رہتے تھے۔ میخواری کی زیادتی سے بڑی بدنامی ہو رہی تھی۔ رزیڈنٹ نے خیر اندیشی نیز انسداد ابواب فساد کے لئے ترک میخواری کا انتظام جس جس طور سے مناسب تھا، کیا۔ لیکن جہانگیر مرزا تو بادۂ گلرنگ کے دلدادہ اور ہوائے دختر رز کے جان باختہ تھے، اس سدِباب سے مغموم و مکدر ہو کر رزیڈنٹ صاحب سے انتقام لینے کے لئے کمین گاہ میں بیٹھے۔ ایک روز صبح کو رزیڈنٹ صاحب ہوا خوری نیز ملاحظۂ امور ضروری کے لئے تن تنہا سیر کرتے ہوئے قلعہ میں آ نکلے تو مرزا نے بے اختیار (تحاشا) اُن پر تپنچہ سر کیا۔ ان کا نشانہ غلط پڑا۔ رزیڈنٹ صاحب بھاگ کر رزیڈنسی میں چلے آئے۔ اپنی فوج جمع کر کے قلعہ کے اندر گئے اور زد و گشت اور گیر و دار شروع کی۔ نواب شاہ نواز خاں، جو امور خانگی کے مختار کُل تھے، امیر الدولہ خطاب تھا، جلدی سے رزیڈنٹ صاحب کے پاس پہونچے۔ اُن کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ کیا غلام قادر خاں پھر زندہ ہو گیا ہے! خدا کے لئے رحم فرمایئے۔ رزیڈنٹ صاحب نے فرمایا کہ جب تک جہانگیر مرزا ہاتھ نہ آجائے گا، ہاتھ سے کام اور کام سے ہاتھ نہ اُٹھاؤں گا۔ شاہ نواز خاں نے مرزا کو لے جا کر رزیڈنٹ صاحب کے سپرد کر دیا۔ تو وہ فتنہ و فساد بند ہوا۔ امن و امان کی صورت پیدا ہو گئی۔ جہانگیر مرزا محبوس کر کے الہ آباد بھیج دیے گئے۔ کچھ دن بعد بادشاہ نے رزیڈنٹ سے صفائی کر کے اپنے پر مہربان کر لیا۔ ایک لاکھ روپیہ ماہوار مواجب مقرر ہوا۔ جہانگیر مرزا نے بھی قید سے رہائی پائی اور حضور شاہی میں پہنچ گئے۔

مرزا کو سیر و شکار کی ہوس سر میں سمائی تو اودھ جانے کی رخصت مانگی۔ اجازت ملی اور رزیڈنٹ کی عنایت سے بڑے شکوہ اور جلوس کے ساتھ اودھ پہونچے۔ نواب سعادت علی خاں فرمانروائے اودھ مراسمِ مہمانداری اور مراتبِ اطاعت و فرماں گزاری بجالائے۔[۵۱] اظہار اخلاص کیا۔ لیکن مرزا کے اطوار اچھے نہ تھے۔ ناہنجار درست نہ تھا۔ عشرت پرست ندیموں اور کم فطرت مصاحبوں کی صحبت میں بُرے بُرے کام کر گزرتے تھے۔ اپنی قوت اور خاندانِ شاہی کی عزت برباد کر دی۔ اکثر اوقات عصمت سرشت پردہ نشینوں کو گھر سے زبردستی باہر کھینچ لاتے۔ بے حرمتی کرتے، اُن کی عصمت و عفت اور اپنی عالی منزلت میں داغ لگاتے تھے جبر و تعدی سے طلب کر کے رنڈیوں سے وہ سب کچھ کر ڈالتے تھے جو اُن کو نہ کرنا چاہئے تھا اس لئے نواب سعادت علی خاں کی استدعا پر اُن کا اخراج لکھنؤ سے ہوا۔ الٰہ آباد میں قیام قرار پایا۔[۵۲] اسی خسرو باغ میں۔

یہ تفرج گاہ، یہ ہمسایۂ خلدِ بریں ——— گل بداماں، گل فشاں، گل ریز، گلشن آفریں [۵۳]

میر ناصر علی خاں بہادر صلائے عام دہلی میں، زیرِ عنوان دہلی شاہ جہاں آباد، لکھتے ہیں۔

"شاہ عالم کے بعد اکبر شاہ ثانی کا زمانہ بھی خاصہ ہوا۔ لیکن ایک بات اکبر شاہ ثانی کی ضرور قصہ طلب ہے کہ تخت پر بیٹھتے ہی بادشاہ کو اپنے بڑے بیٹے ابوظفر سے اُلجھن پیدا ہو گئی۔ اگر سرکار انگریزی کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو ابوظفر بہادر شاہ کو تخت نصیب نہ ہوتا۔ اس معرکے کے طے کرنے میں سرکارِ انگریزی نے جو کوششیں کیں، بہادر شاہ کو بھولنی نہ چاہئے تھیں۔ اکبر شاہ ثانی نے اپنے بیٹے کو خلل دماغ بتایا اور چوتھے بیٹے جہاندار شاہ[۵۴] کی ولیعہدی کے لئے بہت زور دیا۔ جہاندار شاہ

---

۵۱ مرزا محمد حسین قتیل لکھتے ہیں کہ شاہزادہ جہانگیر پنجشنبہ ۲۴ محرم کو لکھنؤ میں داخل ہوئے تھے۔ جناب عالی (نواب وزیر) نے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ استقبال کیا تھا۔ شاید آصف الدولہ نے شاہزادہ مرزا جواں بخت کا بھی اس شان سے استقبال نہ کیا ہوگا۔ سعادت علی خاں کو اپنے ہی ہودے پر اپنے پہلو میں بٹھا لیا تھا۔ قتیل بھی سلام کو حاضر ہوئے تھے۔ کرسی منگا کر ان کو بٹھایا اور اپنے ساتھ کچھ کھلایا بھی تھا (صفحہ ۸۰، رقعات مطبوعہ ۱۲۷۳ھ)۔

۵۲ گلستانِ ہند، تتمہ دفتر دوم، صفحات ۲۰۳ تا ۲۰۵۔ ۵۳ رسالہ نمبر ۶، ماہ جولائی ۱۹۱۵ء صفحہ ۲۷۔

۵۴ شاید غلطی ہے۔ اکبر ثانی کا کوئی بیٹا اس نام کا نہ تھا۔ جہاندار شاہ عرف مرزا جواں بخت بہادر، شاہ عالم ثانی کا

الہ آباد جلاوطن کئے گئے۔ اس کی مفصل کیفیت بھی تاریخ کے لئے لطف سے خالی نہیں"۔

افسانہ از افسانہ می خیزد۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی فرماتے ہیں کہ مرزا جہانگیر نہایت حسین جوان تھے۔ مگر شراب بہت پیتے تھے۔ 'متوالا' ان کا لقب ہو گیا تھا۔ ان کی اور بیویوں اور حرموں کا حال کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ موصوف لکھتے ہیں کہ ایک محبوبہ بیگم 'حسینی بیگم' نام تھیں۔ ان سے اور بہادر شاہ سے دو مشہور باغوں کی نسبت تنازع تھا۔ بیگم نے دہلی کی دیوانی عدالت میں دعویٰ کر کے کامیابی حاصل کی۔ آگرہ کی صدر عدالت سے اپیل میں فیصلہ بحال رہا۔ حسینی بیگم نے دوسرا نکاح شاہزادہ مرزا چمپا سے کر لیا تھا اور سنہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے پہلے مر گئی تھیں۔ حسینی بیگم کے ایک لڑکی مرزا جہانگیر سے تھیں۔ حسن آرا بیگم نام تھا اور واقعی حسینہ و حسن آرا تھیں۔ زندگی بھر معقول پنشن سرکار سے پاتی رہیں۔ شوہر نے بالزامِ بغاوت پھانسی پائی تھی۔ بیگم نے مرنے والے کی یاد میں جل جل کر باقی عمر بیوگی میں کاٹ دی[۱]۔ ذرائع تحقیقات و واقفیت اور مقامی روایات و وسعتِ معلومات کے اعتبار سے میں خواجہ صاحب کی تحریر کو قابلِ استناد سمجھتا ہوں۔

ان طویل عبارتوں کے نقل و اعادہ کے لئے عفو خواہ ہوں۔ ان میں واقعات و حالات کا کچھ ایسا حصہ بھی داخل و شامل نظر آتا ہے' جو بظاہر خسرو باغ اور الہ آباد سے باہر کا ہے۔ لیکن شاہزادہ کی داستانِ حیات کا آخری ورق خسرو باغ میں قلمبند ہوا تھا' اس لئے اُس کے تتمہ

بڑا بیٹا اور ولی عہد' یعنی اکبر شاہ ثانی کا بڑا بھائی تھا۔ باپ کے ساتھ مناقشات رہتے تھے۔ ناخوش ہو کر لکھنؤ کا رخ کیا۔ وہاں سے مسٹر ہیسٹنگز W. HASTINGS کے ہمراہ بنارس آیا۔ شعبان سنہ ۱۲۰۲ھ (یکم اپریل سنہ ۱۷۸۸ء) میں وہاں انتقال کیا۔ شاعر بھی تھا۔ "جہاندار" تخلص کرتا تھا۔ حسب روایتِ گارسن دی تاسی GARCIN DE TASSY اس کے کلام کا مجموعہ "بیاضِ عنایتِ مرشد زادہ" کے نام سے انڈیا ہوس میں موجود ہے۔ (بیلس ڈکشنری' صفحہ ۱۲۰) 'گلشنِ بیخار' تصنیف سنہ ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء (صفحہ ۵۴) اور 'گلستانِ بیخزاں' تکمیل سنہ ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء (صفحہ ۶۴) میں مختصر حالات مع نمونۂ کلام کے مندرج ہیں۔ مفتاح التواریخ سے بھی واقعات و حالاتِ متذکرہ بالا کی تصدیق ہوتی ہے (صفحات ۱۸۱ و ۵۴۴' مطبوعہ سنہ ۱۸۴۹ء)۔ [۱] رسالہ 'شاہکار' لاہور' اکتوبر سنہ ۱۹۳۵ء' صفحہ ۱۸۔ خواجہ صاحب نے انھیں حالات کا اعادہ اپنے گرامی نامہ میں بھی فرمایا ہے۔

وضیمہ کا الحاق اور الہ آباد و شاہجہاں آباد دونوں کی پس مرگ کی کیفیتوں کا تقابل ناگزیر نظر آیا۔ یہ خیال بھی دامنگیر ہوا کہ شاید آگے چل کر بیکس خسرو کی طرح غریب و بدنصیب جہانگیر مرزا کو یاد کرنے والا اور اُن کی یاد پر دو آنسو بہانے والا پیدا نہ ہو۔

ہنگامہ غیر عشق کا بازار دیکھ کر
یاد آگئیں وہ محسن کی یوسف فروشیاں

اب وہ روایتیں مرقوم ہوں گی جو ثقہ اور قابل استناد بزرگوں سے سُنی ہیں۔

ان کے ہم وطن رفقا اور پرانے اہل خدمت کا بیان تھا کہ مرزا جہانگیر بچپن سے ذہین تھے۔ طباع و زود فہم تھے۔ خوش لیاقت ہمنون مجلسی اور آداب صحبت کے ماہر تھے۔ باوجودیکہ اس قدر ناز پروردہ اور ماں باپ کے لاڈلے تھے جس روز چار برس، چار مہینے، چار دن کے ہوئے، پڑھنے کے لئے بٹھا دیئے گئے۔ ان کی تعلیم و تربیت پر توجہ خاص ہوتی تھی۔ شروع کے سبق اسلامی اخلاق، ارکان و احکام اور دینیات کے متعلق تھے۔ یہ دستور دہلی کے قلعہ اور مغلوں کے خاندان میں ہمیشہ سے چلا آتا تھا۔

راقم احوال کے نزدیک بھی اس رواج کی قدامت غیر معین ہے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ مسلمانوں کے ممالک اور مقبوضات میں یہی دستور چلا آتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ بابر نے ہمایوں کی تعلیم اسی سن، چار سال چار ماہ چار روز، میں شروع کرادی تھی۔[1] اسی طرح حسب تحریر ابوالفضل، اپنے آباء و اجداد کی سُنت دیرینہ کی تقلید و پیروی میں ہمایوں نے بھی اکبر کو وُہی عمر ہو جانے پر مکتب نشین کرادیا تھا۔[2]

هیرودوطوس[3] HERODOTUS کی تحریر[4] سے پتہ چلتا ہے اور اسطرابو STRABO[5] سے اسکی تائید ہوتی ہے کہ پرانے زمانہ میں اہل ایران اپنے بچوں کی تعلیم پانچ سال کی عمر سے شروع کر دیتے تھے۔ اس کا کچھ حصہ مذہبی ہوتا تھا۔ لیکن حکیم افلاطون PLATO فرماتا ہے کہ آغاز تعلیم ساتویں برس ہوتا تھا۔[6] ان عمروں میں بھی کوئی بڑا فرق نہیں۔

---

[1] تذکرۃ السلاطین۔ ایجوکیشن آف محمڈن لرننگ، از نریندر ناتھ لا۔ صفحہ ۱۲۸۔

[2] اکبر نامہ، جلد اول، صفحہ ۲۹۶، مطبوعہ نولکشور۔ [3] ہیروڈوٹس۔ مشہور یونانی مورخ۔ [4] پہلی کتاب، صفحہ ۱۳۶۔ [5] پندرھویں کتاب، باب سوم، صفحہ ۱۸۔ [6] صفحہ ۳، First Alcibiades.

بازآمد۔ تیمور سے لے کر بہادر شاہ تک تمام مغل شہنشاہ اپنا روزنامچہ رکھتے تھے۔ جس میں اپنی حکومت کے واقعات قلمبند کرتے اور محفوظ رکھتے جاتے تھے۔ تیمور، بابر اور جہانگیر کے تزک مطبوع و عام ہیں۔ ترجمے بھی متعدد ہو چکے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کے رقعات و تحریرات سے فارسی کا ہر با استعداد واقف ہے۔ اکبر ثانی کا قلمی روزنامچہ دہلی کے لال قلعہ کے میوزیم میں موجود ہے اور اس میں بھی بہت سے حالات مرزا جہانگیر کے مندرج ہیں۔ بہادر شاہ کا روزنامچہ خواجہ حسن نظامی کی توجہ سے چھپ چکا ہے۔ مرزا جہانگیر کا روزنامچہ بھی الہ آباد تک رہا تھا، جس میں ان کے اس عالم اسیری اور ان کے متوسلین کے واقعات روزانہ لکھے جاتے تھے۔ کسی وقت اس کے بعض دلچسپ و پرلطف حصے میرے محترم بزرگ مولانا حاجی سید محمد سعید صاحب کے متروکات آبائی میں موجود تھے۔ راقم احوال اُن کے لئے نگاہِ التفات کا برسوں متوقع رہا تھا۔ لیکن آخر کار میری حرماں نصیبی اُن کی دستیابی میں مانع آئی۔

واہ ری ہمتِ کرم آتشِ شوق پھونک کر میں نے کہا خطا ہوئی۔ دل نے کہا معاف ہے

موصوف کو اس میں کی بعض باتیں یاد ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی سرکار میں نجومیوں اور جوتشیوں کی بھی بڑی پرسش و قدر تھی۔ اور اُن کی صوابدید و تلقین پر عمل ہوتا تھا۔ سنیچر کے دن تیل، کالی ماش اور لوہا خیرات کیا جاتا تھا۔ یوں بھی خسرو باغ میں داد و دہش اور خیر خیرات کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا تھا سلونوں کا تیوہار بڑے اہتمام و تکلف سے مناتے تھے۔ جس کی بنیاد ان کے دادا شاہ عالم ثانی[۱] نے ستر بہتر برس پہلے ڈالی تھی اور باپ نے بھی جاری رکھا تھا۔ اس کو یہ بھی ایک خاندانی رسم کے طور پر انجام

---

[۱] شاہِ عالم! آپ کے شاہانہ اخلاق اور آپ کی رعایا پروری پر ہندوستان قربان۔ آپ نے صرف یہاں کی زبان ہی کو نہیں سرفراز بلکہ اپنی رعیت کو بھی ہمیشہ نوازا۔ ایک برہمنی آپ کی بہن اور شہزادیوں کی چھپی بنی۔ اس کے ہاتھ سے آپ نے راکھی بندھن بندھوایا اور ہندو مسلم رشتہ کو مضبوط کر دکھایا۔

عالمگیر ثانی جب دغا سے کوٹلہ (فیروز شاہ دہلی) میں شہید کئے گئے تو ان کی لاش جمنا میں ڈال دی گئی۔ بہتے بہتے وہ ریت کو ایک کنارے جا لگی۔ اتفاقاً اُدھر سے ایک عورت گزری۔ لاش دیکھ کر جھجکی۔ پھر پہچان کر اُسکے پاس بیٹھ گئی کہ صبح ہو تو خبر کرے۔ یہاں قلعہ میں بادشاہ کی سواری کوٹلہ سے نہ لوٹی تو فکر بڑھی تلاش ہوئی مگر پتہ نہ چلا۔ صبح کو حال کھلا۔ شاہی لاش

دیتے تھے۔ خوشی خوشی خود اپنے اور اپنے رفقا و مصاحبین کے راکھیاں[1] بندھواتے تھے۔

باوجودیکہ یہاں کے قیام کا زمانہ دس گیارہ سال سے متجاوز نہیں ہوا اطراف الہ آباد میں بعض

اور وہ عورت قلعہ میں لائی گئی۔ شاہ عالم بادشاہ ہوئے۔ آپ نے اُس عورت کو انعام اکرام دیا اور اُسے اپنی بہن بنایا۔

اُس دن سے یہ بہن جن کا نام رام کنور تھا قلعہ میں اپنا حق جتا کر آتیں اور رہتیں۔ انھیں کی خاطر سے ہندوؤں کی ایک خاص رسم سلونو کی شاہی محل میں پہل ہوئی۔ یہ پرب سالانہ منایا جاتا اور اس میں کل ہندوانی ریت رسم برتا جاتا۔ برسات میں یہ تہوار ہوتا۔ جھولے پڑتے، پینگ بڑھتے، جوڑے سلگتے، کڑھائیاں چڑھتیں اور عورتیں پکوان تلتیں۔ اتنے میں بہن جی آتیں اور سونے کی تھلی میں کچھ ساتھ لاتیں۔ حضور (بادشاہ) تک پہونچتیں اور اپنی تھلی سے سچے موتیوں کا سمرن نکالتیں۔ اس میں سونے کی گھونڈیاں ہوتیں۔ جھک کر ایک ادا کے ساتھ شاہ عالم کی کلائی میں اسے باندھتیں۔ بادشاہ مسکراتے اور بہن جی کی پیٹھ پر ہاتھ دھرتے اور اُن کی اور اُس راکھی بندن کی سلامتی کی دعا کرتے۔ پھر اُن کے ہاتھ میں خود بدولت زمرد کی چوڑیاں پہناتے اور بھائی ہونے کا حق ادا کرتے۔ پھر شال دوشالے بٹتے۔ برہمن بڑھ کر اسیس (دعا) دیتے۔ مہابلی بادشاہ سلامت کی دھوم مچتی، باجے بجتے، ناچ رنگ ہوتے، ساز چھڑتے اور گلے پڑتے۔ محفل اُٹھتی، تو شاہ بھائی کے گھر سے رام کنور بہن ایک شان سے رخصت ہوتیں شہزادیوں کے جھرمٹ میں دربِ دولت تک آتیں اور پھر سواری میں گھر جاتیں۔

شاہ عالم کے بعد بھی یہ رسم قائم رہی۔ اکبر ثانی کے وقت میں ان رام کنور کی بیٹی راکھی بندن باندھنے اور اپنا نیگ لینے آتیں۔ بہادر شاہ نے بھی سلونو کو باقی رکھا تھا۔" (مغل اور اُردو، صفحات ۱۰۴ و ۱۰۵)۔

[1] چغتایوں کے یہاں اس کی رسائی اور قدر افزائی کا قصہ بہت پُرانا اور بہت مشہور ہے۔ کرنیل ٹاڈ اسکے راوی ہیں۔ یہ بھی سُن لیجئے۔

سمبت ۱۵۸۹ یعنی ۹۳۲ (؟) ۱۵۳۲ء میں ہمایوں چنار کے قلعہ کا محاصرہ کر رہا تھا۔ بیرم خاں اور شیر خاں اسکے لشکر کے سردار تھے۔ دو راجپوت سوار خستہ و پریشان حال چتوڑ سے آئے۔ سرپستی مہارانی کرناوتی کا خط مع ایک راکھی کے پیش کیا جو جہانگیری کی وضع کی ایک مرصع خوبصورت چیز تھی۔ جس میں سونے کی زنجیر لگی تھی اور قیمتی جواہرات جڑے تھے۔

مستقل باتیں اپنی یادگار چھوڑ گئے تھے۔

عید کے دوسرے دن موضع مڑواڑہ میں "ٹر" کا میلہ منایا جاتا تھا۔ اطراف و جوانب کے شرفاد رؤسا جوق جوق آتے اور لطف و محبت سے باہم ملتے تھے۔ خود شاہزادہ بھی ان کی بزم شور و سرور میں شریک ہوتا۔ میلے کی رونق اور چہل پہل روز افزوں ہوتی جاتی تھی۔ مرزا کے انتقال کے بعد بھی کچھ مدت تک یہ اجتماع باقی و جاری رہا۔ لیکن وہ کیفیت و جمعیت نہیں تھی۔

واقعہ یہ تھا کہ سلطان بہادر شاہ والی گجرات اپنے باپ مظفر شاہ ثانی کی شکست و تذلیل کا بدلہ لینے کے لئے چتور پر چڑھ آیا تھا۔ منڈو کا راجہ اس کا حلیف و رفیق تھا۔ رومی خاں کلساد لاور جنرل اس کا سپہ سالار تھا۔ چتور کو بچانے کے واسطے اِدھر سے بھی بوندی کا بہادر فرزند پانسو راجپوتوں کے ساتھ آیا تھا۔ جھالور کا راجہ سونگر راج، آبو کا راجہ دیورا اور بہت سے سورما راجا مہاراجا پہنچ گئے تھے۔

نوجوان ہمایوں نے اس معزز و نیک نام رانی اور راجپوتوں کے سب سے ممتاز و محترم خاندان کے سر دلر رانا اودے سنگھ کی خاموش فریاد اور صدائے استمداد کو سنا۔ چنار کا محاصرہ چھوڑ کر چتور کا رُخ کیا۔ چنار گڑھ سے چتور سوا پانچ سو میل ہے۔ سارنگ پور پہنچا تھا کہ چتور کی تباہی کی خبر ملی۔ جو ہونا تھا، ہو چکا تھا۔ تاہم ہمایوں نے یا یوں کہیئے کہ ایک مسلمان بادشاہ نے دوسرے مسلمان بادشاہ سے ایک ہندو رئیس پر لشکر کشی اور اُس کے برباد کر ڈالنے کا انتقام لے لیا۔ منڈو کے قریب، علاقہ مالوہ میں ہمایوں اور بہادر شاہ کا سامنا ہوا اور اسی سلسلہ میں بہادر شاہ کی قسمت کا فیصلہ۔ کتنی بے اعتبار ہے دنیا!
[نیز ملاحظہ ہو "اکبر اور سلطنت مغلیہ کا عروج" از کرنیل میلی سن، صفحہ ۱۰۱۔]

لیکن ہمارے ملک کی قرونِ وسطےٰ کی تاریخوں میں ایسی مثالیں اور بھی ملتی ہیں۔ جن سے روشن ہوتا ہے کہ صلح و آشتی یا معرکہ آرائیاں مذہبی اختلافات کی وجہ سے نہیں ہوا کرتی تھیں۔ بلکہ اغراض و مقاصد کا اتحاد یا اپنی اپنی ضرورتیں اور مصلحتیں ان کی محرک اور باعث ہوتی تھیں۔ عصرِ حاضرہ کے مورخ ہم کو غلط بتاتے اور جھوٹ سکھاتے ہیں۔
حسن خاں میواتی نے رانا سنگ رام عرف رانا سانگا کے شریک حال و متحد ہو کر شہنشاہ بابر کا مقابلہ کس جوانمردی سے کیا تھا۔ راجہ بکرماجیت کو ساتھ لے کر ابراہیم لودی بابر کے خلاف محاذ جنگ پر گیا تھا۔ اور پانی پت کے میدان میں دونوں نے ایک ساتھ جان دی تھی۔

موضع بسوتان (پرگنہ چاپل) کے اتر سمت ایک موضع ڈاہی ہے جہاں اندنوں تنبولیوں کی آبادی ہے۔ تعلقداران اسراوے کلاں کی مِلک ہے۔ اس کے شمال جانب ایک باغ ہے، جس کی چار دیواری اور دکھن طرف کا پھاٹک بالکل مغلیہ طرز تعمیر کا، شاندار تھا۔ کہا جاتا ہے کہ زمانۂ قیام الہ آباد یعنی اپنی شاہزادگی میں شہنشاہ جہاں گیر یہاں ٹھہر کر شکار کھیلا کرتا تھا۔ وسطِ باغ میں ایک گنبد دار عمارت بھی اُسی طرز کی تھی جس کا ذکر اس کتاب کے صفحات پر آچکا ہے۔ آس پاس میدان ہے اور آبادی کے ٹیلے سے ملحق، دکن کو ایک طویل و عریض جھیل، جو مقامی طور پر "تال" سے معروف ہے۔ پانچ چھ پشت بعد مرزا جہانگیر یہاں پہونچے اور اپنے ہمنام سَلَف کی یادگار کو از سرِ نو آباد کیا۔ تازہ رونق دی۔ اپنا شکارگاہ بنایا۔ اس وسیع میدان یا رسنہ میں ہرن اور جنگلی جانور رہتے تھے۔ باقیات میں وہ قمرغہ[۱] یا اُس کے آثار ابھی قائم ہیں، جن کا عام طور پر، ان اطراف کے باشندے اور دہقان حوالہ یا نشان دیتے ہیں۔ مرزا جہانگیر یہاں اپنے خیمہ و خرگاہ کے ساتھ تشریف لاتے اور قیام و تفریح فرماتے تھے۔ ان کی شہ سواری و چابک دستی کے متعلق اب تک بہت سی باتیں زبانوں پر ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ اُن کو افسانہ سمجھیں۔ میں کہوں گا کہ تذکروں میں اس قسم کی داستانوں اور قصّوں کے سوا ہوتا ہی کیا ہے۔ کوئی مدعیِ دانش و ادراک تو ان کو باور ہی نہیں کرتا؛ اور کوئی سادہ دل حُسنِ عقیدت کی ڈالی نذر لاتا ہے، نیاز پرستاری پیش کرتا ہے۔ بہرکیف۔ میں تو ان روایات یا تاریخی حکایات کو اس اندیشہ سے حوالۂ قلم کر رہا ہوں کہ جس طرح لکھے ہوئے واقعات کا بتانے والا (مرزا کا روزنامچہ) ضائع یا غائب اور ہمارے دسترس سے باہر ہو گیا ہے، کسی دن ان احوال و اقوالِ زبانی کا کا سنانے والا بھی صفحۂ دہر سے ناپید ہو جائے گا۔

خلش اے خارِ جنوں کوئی نہ باقی رکھنا — پھر نہ آئے گا کوئی آبلہ پا میسر سے بعد

کہتے ہیں کہ مرزا جہانگیر گھوڑے پر سوار ہو کر کوڑے کی ایک ہی ضرب سے گوزن و آہو کو

---

[۱] قمرغہ (ترکی) یا شکار جرگہ کا طریقہ بہت پرانا چلا آتا ہے جہاں شکار کثرت سے پایا جاتا تھا اس جنگل کو ہر طرف سے گھیر لیتے تھے۔

گرا دیتے تھے۔ ان کے شکار کو جانے اور وہاں پہونچنے کا غلغلہ جب بلند ہوتا تو دور و دراز مواضع سے لوگ سیر و تفریح کے لئے آتے اور دُور دُور کنارے کنارے بیٹھ کر تماشا دیکھتے تھے۔

ان کے گھوڑے کی سواری کی نسبت عجیب و غریب قصّے سننے میں آتے ہیں۔ خسرو باغ کی بلند دیواریں پھندا کر گھوڑا دوسری طرف کود الاتے تھے۔ سڑک اعظم پر جس وقت سواری نکلتی ہو اور بھوسہ، چارہ وغیرہ کی لدی ہوئی بیل گاڑیاں گزر رہی ہوں جو خوب بھری ہوئی اور اونچی ہوتی ہیں، تو حکم تھا کہ راہ سے گاڑیاں ہٹائی نہ جائیں بلکہ تھوڑا تھوڑا فاصلہ دے کر کھڑی ہو جائیں۔ مرزا اپنے مرکبِ باد رفتار پر سوار ان گاڑیوں کے اوپر سے گھوڑا کو داتے پھنداتے نکل جاتے تھے۔

شاہانہ فیاضی اور مہمان نوازی کی یہ کیفیت تھی کہ کبھی تنہا نہیں کھاتے تھے۔ صلائے کرم عام تھی۔ اور خوانِ یغما وسیع۔ ہمراہی و تماشائی خواہ کسی مرتبہ و حیثیت کے اور کسی تعداد میں ہوں سب کو وہی کھانا پہونچتا تھا جو شاہزادہ کے سامنے رکھا جاتا تھا۔ مرزا اُس وقت تک خاصہ تناول نہیں فرماتے تھے جب تک یہ اطلاع نہیں مل جاتی تھی کہ ہر رفیق و متنفس کو کھانا پہنچ گیا ہے۔ اگر اُسوقت شاہی دسترخوان پر کھچڑی ہو گی تو وُہی چیز اُسی اہتمام و تکلّف کی ہر ایک کو پیش کی جائے گی۔

شاہزادہ کی ہیبت و جبروت کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے دل گُردے والے ڈرتے اور گھبراتے تھے۔ ایک روز کوئی انگریز شاہزادہ کی اطلاع و اجازت بغیر اسی شکارگاہ میں شکار کھیلنے چلا آیا۔ دریائے جمن کے کنارے اپنا خیمہ نصب کرایا۔ کوئی شریف زمیندار اتفاقاً اُدھر سے گزرا تو صاحب کو اُس کا آنا ناگوار ہوا۔ اُس کو پکڑوا کر خیمہ کی طنابوں اور میخوں سے بندھوا دیا۔ اِدھر سزا دینے کے لئے ہنٹر لانے کو خیمہ کے اندر گئے، اُدھر شاہزادہ کے جلوس کے نقارہ پر چوب پڑی۔ [شاہی آداب و آئین کے مطابق انکے آگے آگے اونٹ پر نقارہ چلتا تھا اور زور زور سے بجایا جاتا تھا]۔ صاحب تو فی الفور بہ نفسِ نفیس جمنا کی طرف رَوان وَدواں ہو گئے اور ملازمانِ خدمت و ہمراہیان کو حکم دے گئے کہ خیمہ ابھی توڑ کر گھسیٹ لاؤ اور دریا کنارے پہونچاؤ۔ اتنا وقت نہیں ہے نہ فرصت کہ تہ کر کے اُٹھایا جائے۔

اور رفتہ رفتہ اس حلقے کو تنگ کرتے جاتے تھے، حتے کہ تمام جانور گھر کر اسمٹ کر سامنے نشانہ کی زد پر آ جاتے تھے تو ان پر چاروں طرف سے حملہ کر دیا جاتا تھا۔ بہت سے مارے جاتے اور بہت سے زندہ پکڑ لئے جاتے تھے۔ روباہ و آہو وغیرہ سے

پُر تکلف و خوش رنگ لباس کے دل دادہ تھے۔ ایک رنگریز مزاج شناس تھا، جو انعامات و بخشش سے مالامال رہتا تھا۔ فرمایش ہوتی کہ ایسا کپڑا رنگ کر لاؤ جو بظاہر سفید ہو لیکن اگر اتنی تہیں کر دی جائیں تو فلاں رنگ پیدا ہو، اور اتنی تہیں ہوں تو فلاں رنگ معلوم ہو۔ یہ ہنرمند اگر پسند کے قابل چیز تیار کر سکا تو اُس کی قدر دانی، زر بخشی و زرپاشی کا کیا ٹھکانا ہوتا، ورنہ خلاف مرضی ہونے پر اُتنی ہی قمچیاں بھی عنایت ہوتی تھیں۔

مرزا قتیل لکھتے ہیں کہ شاہزادۂ جہانگیر انگریزی لباس پہنتے تھے۔ سر پر کسی جانور کے پر لگاتے تھے جو ارغوانی رنگ کے ہوتے تھے۔ ان کے چار رفیق یا مصاحب بھی اسی وضع و ہیئت میں رہتے تھے[۵۱]۔

الہ آباد والوں نے شاہزادہ کے مرنے کا بڑا ماتم کیا اور رانبوہ و اندوہ کے ساتھ تاریخیں کہی تھیں۔ ادیماقِ مغل اور مفتاح التواریخ سے چند قطعے نقل کئے جاتے ہیں۔

(۱)

چوں جہاندار[۵۲] ابنِ اکبر بادشاہ — در جہاں با دانش و داد گشت
از قدومِ آں دُرِ بحرِ کرم شاہ — رونقِ شہرِ الہ آباد گشت
آں چناں بنہاد خوانِ فیض را — ہر یک از فکرِ معاش آزاد گشت
چوں زسی یکساں عمرش شد فزوں — طبعِ او از زندگی ناشاد گشت
خیمہ زد در منزلِ جنت سرا — ایں چہ از دورِ فلک بیداد گشت
عالمے شد در غمش چنداں اسیر — نامِ شادی از جہاں برباد گشت
ابر آمد در عزا گریہ کناں — بر فلک ہم ماتمے[۵۳] ایجاد گشت
از پئے تاریخ فوتِ او دلم — ہر طرف با نالہ و فریاد گشت

شد عیاں ایں مصرع از ترکیب آہ +

حیف بے رونق الہ آباد گشت

۱۲۳۶ھ = ۱۲ + ۱۲۲۴

(۵۰) گو تُشتی کر چیتے اور شیر تک کو بھی جو ہند و رنہ بچانہ تھا (صفحۂ ہذا) ۵۱ رقعات ... لکھنؤ، صفحہ ۸۷۔ ۵۲ جہاندار لکھتے ہیں، جہانگیر نہیں۔ ۵۳ ماتمی۔

(۲)

چوں از جہاں برفت جہانگیر میرزا | نورِ نگاہِ اکبرِ سالارِ دوسرا
شد خانۂ عزا بغمش دارِ سلطنت ؎ | محزوں شد از وفاتِ وے آں ظلِ کبریا

تاریخ فوتِ او بظہور آمدہ چنیں ؎
از کانِ شاہ رفت زہے لعلِ بے بہا

۱۲۳۷ھ

(۳)

جہانگیر شہزادہ چوں از جہاں ؎ | بشہزادگی دل بہ برداشتہ
بسطحِ فنا اشہبِ عزم راند ؎ | بگلگشتِ جنّت عناں تافتہ
چہ شورِ قیامت فغاں در غمش | بروئے زماں آہ برخاستہ
بہ ہاتف بگفتم کہ کلکِ سعید | چہ تاریخ فوتش رقم ساختہ

بدیں گونہ گفتہ کہ بے ہائے سعید
بملکِ بقا سلطنت یافتہ

۱۲۳۶ = ۴ - ۱۲۴۰

(۴)

از گردشِ چرخِ ستم ایجاد چرا شد + کاں فخرِ زمانی
افسوس کہ عازم سوئے فردوس سرا شد + در عینِ جوانی
تاریخِ وے از کلکِ قضا منشی تقدیر + بر لوحۂ محفوظ
بنوشت "جہانگیر جہاندارِ بقا شد + از منزلِ فانی"[1]

۱۲۳۶ = ۲۷۶ + ۹۶۰

بوڑھوں سے سُنا ہوا اُن کے بوڑھوں کا دیکھا ہوا لکھتا ہوں۔ مرزا جہانگیر کو جب دہلی لے چلے ہیں تو نمازِ جنازہ جامع شاہجہانی (معمرۂ نواب شایستہ خاں) میں پڑھی گئی تھی۔ شاہزادہ کے آخری

[1] اوراقِ مغل۔ مفتاح التواریخ، صفحہ ۵۷۱۔

نظارے کیلئے ہزاروں لاکھوں آنے والوں سے قلعہ کا لق و دق میدان بھرا ہوا تھا۔ جسقدر ازدحام ہر ایک طبقہ و جماعت کے لوگوں کا اُس روز ہوا تھا پھر کبھی دیکھا یا سُنا نہیں گیا۔ اور جو ماتمی باجا اُس وقت بجایا گیا تھا اُس کے درد انگیز ترانے اور دلدوز تانیں ان ثقہ و متین بزرگوں کے کانوں اور دل و دماغ میں ان کے آخر دم تک گونجتی رہی تھیں۔

بازہوائے چمنم آرزو ست۔ سید کمال الدین حیدر متوسلِ دربارِ لکھنؤ نے گورنمنٹ ہند کے سیکرٹری اعظم (نامور مورخ) سرہنری ایلیٹ کے ایماء سے ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں سوانحاتِ سلاطینِ اودھ کے نام سے ایک مبسوط تاریخ لکھی تھی۔ بقول اُن کے ڈاکٹر اسپرنگر محافظِ کتب خانۂ شاہی، کرنل ولکاکس مہتمم رصدخانۂ سلطانی، گلنٹ صاحب منتظمِ کالج جنرل مارٹن اور جنرل سلی مین رزیڈنٹ نے اُس کو دیکھا اور پسند فرمایا تھا۔[۱] مرزا جہانگیر کا لکھنؤ جانا اور پھر وہاں سے ہٹایا جانا ان کی یاد اور ان کے سامنے کی بات ہے۔ کتاب مذکور کی اردو ایڈیشن میں "ورودِ مرزا جہانگیر شاہزادہ دہلی" کے عنوان سے فرماتے ہیں[۲]۔

محمد اکبر شاہ بادشاہِ دلی مرزا جہانگیر شاہزادہ کو بہت چاہتے تھے کہ محبت پدری سے حالت تعشق تھی۔ اس جہت سے جو اُن سے حرکت خلافِ منزلتِ شاہی یا صحبتِ بد کی جہت سے سرزد ہوتی تھی اُسے ازراہِ محبت عفو فرما کر درود لی سے سمجھاتے رہتے تھے۔ جب تاثیرِ صحبتِ غیر جنس سے اُن کے حرکاتِ ناشائستہ بڑھے۔ سیٹن صاحب رزیڈنٹ دربارِ شاہی میں ہر صبح حاضر ہوتے تھے اُن کی نسبت بھی حرفہائے خلاف و نامعقول کہنے لگے۔ اُن کو دیکھ کے ملازم "لولو ہے" کہا کرتے تھے۔ آخر تنگ ہو کر صاحب نے بادشاہ سے عرض کیا کہ شاہزادے سے حرکات خلافِ منزلتِ شاہی سرزد ہوتے ہیں، مبادا ان سے کوئی ایسا امر خلاف ہو جس کی اصلاح بہت دشوار و موجبِ توہین ہو۔ لہذا اگر صاحبِ عالم بہادر چندے بطریقِ تفرج مثل حضرتِ اعلیٰ عملداری مملکت شرقیہ میں رہیں غالب ہے کہ اصلاحِ حال ہو جائے۔ بادشاہ نے پھر انھیں سمجھایا اُن کی مفارقت بہت شاق تھی چندے تامل فرمایا مگر لاڈلا بیٹا کب سنتا ہے۔ خلاصہ انھیں الفاظ رکیک بیہودہ "لولو" سنتے سنتے ایک دن شاہزادہ بہادر نقار خانے پر کھڑے تھے تپنچہ ہاتھ میں تھا مار بیٹھے۔ صاحب دربار سے باہر نکلتے تھے۔ گولی کنارہ ٹوپی سے ہو کر نکل گئی اُسوقت

---

[۱] صفحہ ۱۶، جلد اول، مطبوعہ نول کشور، کانپور۔ ۱۹۰۷ء۔ [۲] ایضاً، صفحات ۱۷۶ لغایتہ ۱۷۹۔

صاحب نہیں کھڑے ہو گئے توپ منگوا کر سرِ دروازۂ نقار خانہ سے دیوانِ عام تک توپ مارتے چلے گئے۔ بادشاہ نے سب ملازمین کو حکم قطعی فرمایا کہ ہر شخص اپنے مقام پر مثلِ تصویر کھڑا رہ جائے۔ جس طرح سے صاحب آتے ہیں آنے دو۔ صاحبِ عالم بہادر کشتی پر سوار ہو پار دریا کے بادشاہ کے پاس جا کر چھپے۔ صاحب رزیڈنٹ تنہا کشتی پر سوار ہو حاضر حضورِ شاہی ہوئے۔ عرض کی آپ حضرتِ صاحبِ عالم کو ہمارے سپرد فرمائیں۔ بادشاہ نے شاہزادے کا ہاتھ انکے ہاتھ میں دیکر فرمایا انھیں تعلیم و تربیت کے واسطے تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ صاحب انھیں اپنے ساتھ قلعہ کے باہر لیکر چلے آئے۔

اُس دن شاہزادہ باہر شہر کے رہا۔ دو چار دن میں سامانِ ضروری شاہانہ درست کر کے روانۂ عملداری سرکار ہوئے۔ ہزار آدمی کی جمعیت لشکر اور سامان ہاتھی گھوڑا وغیرہ سب درست ہو گیا۔ ناگاہ خیال میں آیا کہ پہلے لکھنؤ میں وزیر اعظم کے پاس چلیئے اور وہاں کا عیش و نشاط دیکھیے جو مشہور آفاق ہے۔ اہل صحبت جو اس طریق کے جمع ہو گئے تھے وہ بھی غنیمت سمجھے۔ کسواسطے کہ لکھنؤ پر سب زہر کھائے ہوئے تھے۔ بادشاہ نے وقتِ روانگی کہلا بھیجا تھا کہ اگر لکھنؤ جانے کا اتفاق ہو تو وزیر اعظم کا بہت پاس خاطر رکھنا کسواسطے کہ ہمیشہ سے قربِ منزلت اُن کی اس سلطنت میں رہی ہے۔

غرضؔ جناب عالی نے خبر آمد آمدِ شاہزادہ داخلۂ لکھنؤ کی سُنی بہت خوش ہوئے اور مزید عزت و تفاخر سمجھ کر مع صاحب رزیڈنٹ کرنل جان بیلی صاحب مرزا سلیمان شکوہ مرزا سکندر شکوہ شاہزادے بڑی دھوم دھام سے تا کۂ شہر تک استقبال کو گئے اور شہر میں چوک کی بڑی طیاری کی۔ کوچہ و بازار و بام تماشائیوں سے بھر گیا۔ جناب عالی نے ایک سو اشرفی نذر گذرانی عرض کی آج حضور کی بدولت منصب آبائی قدیم خواصی نشینی بعد ایک مدت العمر کے پھر حاصل ہو گیا۔ شاہزادے نے ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو جانبِ چپ بٹھا لیا برجِ سعادت میں قران السعدین ظاہر ہوا۔ نظرِ خاص و عام میں بھی جلوہ افروزی ہوئی۔ شہر میں ایثارِ زر کرتے ہوئے داخلِ فرح بخش ہوئے۔ شلکِ سلامی توپ ہوئی۔ لباسِ شاہزادہ انگریزی سر پر لمبی کالی ٹوپی ترکمانی ولایتی زیب کمر، بڑا پیچوان حقہ فیلبان ہاتھی کے ماتھے پر رکھے اُس کا پیچ شاہزادے کے ہاتھ میں ہر طرف ہجومِ عام کو دیکھتے ہوئے بعد چاے پانی کے کشتیاں نذر کی دیں۔ چار گھوڑے کی گاڑی اُسی پر سوار ہو کر پسند باغ میں داخل ہوئے دو سو روپے کا خاصۂ طعام معین ہوا۔ شیخ امام بخش وکیل، الماس علی خاں مردِ مسن صاحبِ لیاقت مہتمم بجا آوریِ خدمت مقرر ہوئے۔

دوسرے دن جناب عالی مع صاحب رزیڈنٹ اور مُرشد زادے و اُمرا کے حاضر ہوئے۔ بعد چاے پانی کے سب کی نذریں بمراتب گذریں۔ جب وقتِ خلعت آیا شیخ امام بخش نے ازراہِ طعن مرزا جعفر سے کہا وزیر اعظم کو خلعتِ معمولیِ وزارت ہوگا۔ صاحب رزیڈنٹ کے واسطے آپ نے کونسا خلعت تجویز کیا ہے۔ یہ سُن کر لاجواب ہوئے۔ جناب عالی کو پارچۂ خلعت ہونے لگا۔ ہر پارچہ پر جنابِ عالی آداب گاہ پر جاکر آداب بجالاتے تھے۔ نذر دیتے تھے۔ افسوس ہے اُس دن تک خاندان طیموریہ کا یہ مرتبہ تھا۔ ظاہر حال سب آدابِ شاہی باقی رہا تھا۔ صاحب رزیڈنٹ کا بھی خطاب اُسی سلطنت سے ملتا تھا عماد الدولہ افضل الملک میجر جان بیلی صاحب بہادر ارسلاں جنگ نواب گورنر جنرل بہادر کو بھی خطاب زمان لارڈ مایرا سے سب موقوف ہوگیا۔ غرض جب نوبتِ خلعتِ صاحب رزیڈنٹ پہونچی فقط دو شالہ و رومال کا حکم ہوا۔ جناب عالی نے عرض کیا پانچ پارچہ عنایت فرمائیے۔ صاحب نے نادانستگی سے چاہا کہ مثلِ وزیرِ اعظم میں بھی ہر پارچۂ خلعت پر نذر دے کر آداب گاہ پر آداب بجالاؤں۔ خواصِ شاہی نے کہا کہ یہ مختص رُتبہ وزیر اعظم کا ہے۔ تمہارا یہ مرتبہ نہیں ہے۔ یہ سُنتے ہی کیسا انفعال صاحب کو ہوا اور اپنے آج کے آنے پر بہت شرمندہ ہوئے۔

غرض جناب عالی ہر روز ہر قسم کے ہدایا و تحائف بطیب خاطر بھیجتے تھے اور ہمہ تن مصروف تھے اور بدل منظور تھا کہ انکی ایسی خدمت سب طرح سے کیجئے کہ باعث خوشی دلی بادشاہ ہو بلکہ رفع کدورتہاے ماضیہ ہو اور بادشاہ کے بھی متواتر شقے شاہزادے کو آتے تھے کہ خبردار کوئی امر خلاف وزیر نہ کرنا۔ شاہزادۂ عالم یہ کب ایسی بات سُنتے تھے۔ اشرف علی خاں[1] ایک شخص ستار خوب بجاتا تھا اُسے اپنا وزیر اعظم کیا تھا اُسے جنابعالی کی خبر کو بھیجتے تھے۔ جنابعالی انکی آمد آمد سُنکر تُلتے تھے۔ یہ سلام علیک ہمسری کہتے تھے۔ بہت ناگوار ہوتا تھا۔ شاہزادے ہر صبح گھوڑے پر سوار گلی کوچوں میں بے تحاشا دوڑاتے جاتے تھے۔ اکثر عورتیں مرد کُچل جاتے تھے۔ نخاس میں ہوکر ایکدن گھوڑا پھیرنے لگے۔ دسترخوان پر عجیب صحبت ہوتی تھی۔ ایک دن شیخ امام بخش نے انتظام کر کے عرض کیا۔ بہت خوش ہوئے۔ اربابِ نشاط حاضر رہتے تھے۔ غرض ہر شب شب عید و صبح نوروز تھی۔ جنابعالی کو پرچہ اخبار جب ایسے گزرتے تھے۔ افسوس کہہ کر رہجاتے تھے۔ قصہ مختصر شاہزادۂ عالم ایک کسبی مسماۃ دلفری جو ناچ میں بہت نامور تھی اُسپر عاشق ہوئے اور اُسے داخل محل کیا۔ اپنے عم نامدار مرزا جواں بخت کا

---

[1] شاہزادہ کے سلسلۂ ملازمت کے قطع ہو جانے پر (بہ عہد غازی الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ) دیوان ولی بیگ معتمد شاہی کا مقرب ہو گیا تھا۔ کلکتہ پہنچ کر دونوں نے ملکر خود کو فناے ناز و نیاز اور دفتر سفارت کو غرقِ مئے ناب کر دیا۔ [تواریخ سلاطین اودھ، صفحہ ۲۹۰، جلد اول]

ورثہ پایا[۵۱]۔ جب یہ صورت ہوئی جناب عالی نے بڑے صاحب سے کہلا بھیجا کہ اطوار شاہزادے کے شاہجہاں آباد سے بھی یہاں زیادہ ہوتے ہیں۔ ہم پاسِ آدابِ شاہی سے مجبور ہیں۔ ایسا نہ ہو انکی کسی حرکت سے عبث عبث ندامت و حجاب بادشاہ سے ہو۔ مناسب ہے کہ اب صاحبِ عالم بہادر مملکتِ سرکار میں سیر و سیاحت کریں تو بہتر ہے۔ صاحب رزیڈنٹ پیشتر سے خار کھائے تھے۔ حکم قطعی کہلا بھیجا۔ اسی دن پردۂ شب میں سوار ہو کر الہ آباد چلے گئے۔ سلطانِ خسرو کے باغ میں مقیم ہوئے۔ یہاں کوئی خبر بھی نہ ہوا۔ بلکہ سب کو غنیمت ہوا۔ عافیت سب کی تنگ ہو گئی تھی۔ پانچ ہزار روپے ماہواری گورنمنٹ سے خرچ کو ملتے تھے۔ از بسکہ بادشاہ اور نواب ممتاز محل اُنکی محبت پدری و مادری حد سے زیادہ تھی برضامندی صاحب رزیڈنٹ پھر دلی تشریف لیگئے۔ بعد قیام چند روز کے اُس سے زیادہ حرکات خلاف شروع ہوئے۔ آخر ماں باپ نے لاچار ہو کر پھر صاحب رزیڈنٹ سے کہا کہ ان کے حرکاتِ جنوں اُس سے زیادہ بڑھتے جاتے ہیں۔ ہمارے واسطے موجبِ توہین ہو چکا ہے۔ یہ کچھ متنبہ نہ ہوئے۔ مبادا پھر کوئی ایسی حرکت کریں گے۔ لہٰذا مناسبِ حال ان کا رہنا تمھاری عملداری میں بہتر ہے۔ بڑے صاحب نے عرض کی کہ سیٹن صاحب کے اختیار سے صاحب کی مراجعت دِلّی کو ہوئی مگر اب ہمارے حکم و تجویز سے جائیں گے مراجعت نہ ہو سکے گی۔ اس جہت سے پھر الہ آباد آئے۔ دائم الخمر رہتے تھے۔ آخر اسی بیخودی میں ایک دن ہنستے ہنستے دنیا سے سفر کر گئے۔ جنازہ روانۂ دلی ہوا۔ جب داخل شہر ہوا جلوس شاہی ساتھ ہوا۔ ملازمینِ شاہی اور تمام مردم شہر وضیع وشریف ساتھ تھے۔ شہنا نوازوں نے یہ شعر اپنے مضامیر[۵۲] میں شروع کیا ؎

سرو سیمینا تو تنہا میروی　　　سخت بے مہری کہ بے ما میروی

اس پر بیخودی سے سب روئے تھے کہ حسبِ حال تھا۔ تین دن تک ماں باپ نے کھانا نہ کھایا۔ حجرۂ خلوت سے باہر نہ نکلے۔ آخر بڑے صاحب نے آکر سمجھایا اور کلماتِ صبر عرض کیئے بدستور پھر دربار ہونے لگا۔

---

۵۱ مرزا جہاندار شاہ عرف مرزا جواں بخت (صفحہ ۲۲۶ نوٹ ۴۸) کو زمانۂ قیام لکھنؤ میں ایک آشوبِ شہر رقاصہ "بھگیا" نام سے تعشق و تعلق ہو گیا تھا۔ نواب آصف الدولہ نے روک ٹوک کرنا چاہی تو شاہزادہ نے لارڈ ہیسٹنگز سے التجا کی کہ "وہ مجھے نواب بھائی سے تم بھگیا کو دلوادو"۔ یہ کامیاب ہوے، وہ محل میں داخل۔ نواب جہاں آبادی خطاب ملا۔ شاہزادۂ عالی قدر اسی کے بطن سے تھا۔ سید کمال الدین حیدر نے اس داستانِ حسن و عشق کو تواریخ اودھ میں مزے لے لے کر لکھا ہے۔ (جلد اول، صفحات ۱۱۰ و ۱۱۱ و ۲۷۹)۔ ۵۲ 'مزامیر' ہونا چاہئے۔ کتابت کی غلطی ہے۔

اعتراف۔ حقیقتِ تاریخ

ان اوراق میں، میں نے بارہا تاریخ اور تاریخ لکھنے والوں کا نام لیا اور اکثر جگہ اُن کا حوالہ دیا ہے۔ یہاں فنِ تاریخ، اُسکی تعریف و تفصیل، سیرت و تذکرہ پر تفصیل یا اُس کے بیسوں علمی شعبوں سے اجمالاً بحث چھیڑنا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ ایک حقیقت کا جتا دینا، اسی کے ساتھ اپنے معتقدات سے آگاہ کر دینا مدِ نظر ہے۔

دنیا جانتی ہے کہ تاریخ کا شریف فن بزرگانِ عرب اور مسلمانوں کا ارث اور اُن کے افتخار و مباہات کا سرجوش چشمہ ہے[۱]۔ سب سے پہلے انھیں نے آفرینشِ عالم، کم از کم رسول مقبول صلعم کی بعثت سے چھ سات ہزار برس پیشتر تک کے واقعات فراہم و یکجا کرکے اُن کی تنقید و تنقیح فرمائی۔ معین اصول پر ترتیب دی۔ تدوین کی۔ جس جس قسم کی تاریخی شہادتیں موجود پائیں اُن کا استقرا و استقصاء فرمایا۔ فصیح عرب نے تاریخ کے معنی دو جامع و مانع کلموں میں بتائے تھے۔ تَعْرِیْفُ الْوَقْتِ یعنی وقت کی پہچان کرانا۔ اِن حضرات نے اپنے علم تاریخ کی بنیاد صدق و راستی پر قائم کی تھی اور اسی سچ کی پابندی کے لئے تاکید کرتے رہے۔ یہی اِنکے سلفِ صالح اور اکابرِ دین و ملت کا شیوۂ حسنہ تھا۔ خدائے برتر و

---

[۱] عروج اسلام کے زمانہ میں یورپ کے بادشاہ بھی جو تحائف و ہدایا مسلمان سلاطین کو بھیجا کرتے تھے، ان میں انکے علمی مذاق و قدرشناسی کی رعایت سے زیادہ تر علمی نوادر ہوتے تھے۔ ارمانیوس Ar-mani-us شہنشاہِ قسطنطنیہ نے ۳۳۷ھ (۹۴۸ء) میں جو بیش بہا چیزیں سلطان عبدالرحمٰن الناصر بن محمد اموی فرمانروائے قرطبہ (اندلس) کو بھیجی تھیں، ان میں حفظِ صحت اور طب کی یونانی کتابوں کے سوا ہروسیس Ha-ro-sius صاحب القصص کی قابلِ قدر تصنیف کا بھی ایک نسخہ تھا جو رومیوں کی ایک عمدہ و نفیس تاریخ تھی۔ جس میں گزشتہ زمانوں کے واقعات، شاہانِ سابق کی نبرد آزمائیاں اور مہمات اور اور بہت سے عجیب و غریب سبق آموز حالات مندرج تھے۔ (تاریخ خلافتِ اندلس از نواب ذوالقدر جنگ، صفحہ ۳۵۲، بحوالۂ اخبار الحکماء از قفطی، صفحہ ۱۳۰۔

بزرگ سے اُس کے پاک و برگزیدہ نبی، خلیلِ جلیل ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی وَاجْعَلْ لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِيْنَ۔ [اور پچھلوں میں میرا بول سچا رکھ۔ سورۂ شعراء۔ ع ۵]۔ جھوٹھ لکھنے والوں کی نسبت حق سبحانہٗ تعالیٰ شانہٗ نے توبیخ و سرزنش کی ہے، يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ [کلام کو اُس کے ٹھکانے سے بدلتے ہیں۔ سورۂ مائدہ۔ ع ۳]

یہ تسلیم کر لینا ناگزیر ہے کہ علوم اجتماعیہ میں تاریخ کی شان بہت بڑی ہے۔ اُس کو منزلتِ مستقل حاصل ہے۔ اس کے بارہ میں خطیبِ رومان شیشرون کا قول عربوں نے اپنی زبان میں یوں نقل کیا ہے۔ شَاهِدُ الْأَزْمِنَةِ وَالْحَقِيْقَةِ۔ مَدْرَسَةُ الْحَيَاةِ۔ رَسُوْلُ السَّلَفِ اِلَى الْخَلَفِ تاریخ زمانوں اور حقیقت کی گواہ ہے، زندگی و حیات کی درسگاہ۔ پچھلوں کے لئے اگلوں کی پیام رساں

ایک جگہ (صفحہ ۲۴۴ پر) عدم ضرورت سے میں نے اپنے عرض مدعا کو طول نہیں دیا، واضح نہیں کیا ہے۔ مبادا کہ کسی صائب الرائے کو اس سے کچھ غلط فہمی پیدا ہو اور وہ سمجھے کہ میں تذکردل کو تاریخ کے سامنے معیارِ تحقیق و صداقت سے گرا ہوا بتاتا ہوں۔ نہیں، حاشا کہ نہیں۔ لیکن نفس الامر یہ ہے کہ میں نے موجودہ تاریخی اخبار کو بھی کبھی اعتماد کی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ نہ ان کے منقولات کو اپنے یا اوروں کے واسطے مایۂ استناد سمجھا ہے۔ بے شبہ تاریخوں نے اقوامِ عالم کے جذبات کو اُبھارنے اور ملتوں اور جماعتوں کو بیدار کرنے میں بڑا کام کیا ہے۔ لیکن دانشورانِ فرنگ اور ان کے متبع و خوشہ چین شاگردوں کی لکھی ہوئی تاریخوں نے، خواہ اقوام و ملل و ادیانِ دیگر کے متعلق ہوں خواہ ممالکِ غیر یا ان کی فتوحات اور فیوض و برکات کے بارہ میں، ہم اہل ہند کی اُخوّت و حریّت پر بڑا برا اثر ڈالا ہے۔ ان صاحبوں کا مقصد و مطلب تاریخ نہیں ہوتی بلکہ پالسی اور پرچار ہے[1]۔ اپنے سوا تمام قوموں کے تاریک پہلوؤں کو چمکا کر اُن کے مقابلہ میں اپنے تمدن، اپنی معاشرت کو روشن و تابدار بنا کر دکھانا اور اپنا اثر و اقتدار جمانا ان کا مطمحِ نگاہ ہے۔

عام تاریخوں سے بدگمانی، ان میں حق و باطل کی آمیزش اور ان کو مشتبہ سمجھنے کا مجرم و خطا کار اکیلا میں ہی نہیں، بلکہ اس خیال میں بہت سے عالی مرتبت مفکرین اور مشاہیر حکماء و فضلا کو بھی مبتلا

---

[1] ملاحظہ ہوں صفحات ۱۰۰ و ۱۱۴ (مع نوٹ ۴) و ۱۲۲ و ۱۲۳ و ۲۲۳ و ۲۴۱ (نوٹ)۔

پاتا ہوں۔ یا یوں کہوں کہ برملا شریک ہیں۔

حاجی خلیفہ (مصطفےٰ ابن عبداللہ، کاتب شلبی[۱]) نے کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون[۲] میں تیرہ سو تاریخیں مختلف انواع و عنوانات کی گنائی ہیں۔ مگر صاحب نتائج نے ان میں سے صرف پندرہ سولہ کو حسنِ ترتیب، ربطِ معنوی اور صداقتِ واقعی کے اعتبار سے قابل اعتبار بتایا ہے۔

ماننا پڑتا ہے کہ تاریخوں کے لکھنے والے بھی انسان ہی ہوتے تھے۔ اور مؤرخ کو ان تاریخوں میں خود اپنے جذبات، حق شناسی و حق گوئی سے زیادہ ملک و قوم کی اُس وقت کی حالت اور سلطنت کے رجحانات اور مصلحتوں کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا۔

مشہور مصنف و ادیب، ابو اسحٰق صابی[۳]، عضد الدولہ تاج الملک کی فرمایش سے اُس کی دولت دیلمیہ[۴] کی ضخیم تاریخ "تاجی" لکھ رہا تھا۔ نام ہی سے ظاہر ہے کہ "تاج الملک" سے منسوب ہے۔ اُسکا کوئی دوست آگیا۔ پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ بولا کہ اَبَاطِیلُ اُنَمِّقُھَا وَ اَکَاذِیبُ اُلَفِّقُھَا[۵]۔ [لغو و دروغ جنکو قلمبند کر رہا اور جھوٹی باتیں جنکو ترتیب دے رہا ہوں۔] یہی اقرار خطا یا اعلانِ فرمان اس با کمال کے مصائب اور جان جانے کا سبب ہوا۔ ایک دوسرے بلند پایہ مورخ نے بعض لڑائیوں کی تاریخ لکھتے وقت

---

۱ متوفی ۱۰۶۷ھ (۱۶۵۷ء)۔ مدفن قسطنطنیہ۔ ۲ اس کتاب کی عظمت و وقعت کی شہادت یہی کافی ہے کہ اورنٹیل ٹرانسلیشن فنڈ نے ۱۸۳۵ میں اس کو مع اس کے لاطینی ترجمہ کے چھپوانا شروع کیا تھا۔ پندرہ برس میں یہ کام ختم ہوا۔ پروفیسر فلوگیل FLUEGEL مترجم و مہتمم تھے۔ ۳ ابن اسحٰق صابی کا پورا نام ابوالحسن ہلال بن محسن بن ابراہیم حرّانی تھا۔ عضد الدولہ کا کاتب تھا۔ اسی حیثیت سے شہرت زیادہ پائی۔ صابی کہلاتا ہے۔ جو ایک مذہب سے دوسرا مذہب بدلنے والے کو کہتے ہیں۔ آخر عمر میں مسلمان ہوا تھا۔ ۳۵۹ھ (۹۷۰ء) میں پیدا ہوا۔ ۴۴۸ھ (۱۰۵۶ء) میں اس عالم سے رخصت ہوا۔ تاجی کے سوا کتاب الاماثل والاعیان یادگار چھوڑی تھی۔ ۴ یہ خاندان دیالمہ بھی کہلاتا ہے۔ ۱۰۰ سال قمری فرمانروائی کی۔ دیلم ایک موضع کا نام ہے، جہاں کا علی ابن بویہ باشندہ تھا۔ بویہ مورث کا نام تھا۔ ان کو قدیم شاہان ایران کی نسل سے ہونے کا دعویٰ تھا۔ خوشامدی و متملقین اس پر ایمان رکھتے تھے۔ تاریخ یہ ثابت کرتی تھی کہ بویہ ایک معمولی ماہی گیر دیلم کا تھا۔ اس کے تینوں بیٹوں، علی (عماد الدولہ) و حسن (رکن الدولہ) و احمد (معز الدولہ) نے بڑا عروج پایا۔ بڑے بڑے کام کیئے۔ رکن الدولہ کا بیٹا عضد الدولہ تھا، والیِ فارس و عراق۔ خلیفہ بغداد الطائع باللہ نے اس کو اپنا وزیر اور امیر الامرا بھی بنا دیا تھا۔ [تاریخ ابو الفدا، عربی، جلد دوم، صفحہ ۳۰۸، مطبوعہ قسطنطنیہ، ۱۲۸۶ھ و ہیلس ڈکشنری صفحہ ۳۰۸۔]
۵ ایضاً ابو الفدا صفحہ ۱۳۶۔

اقبال کیا تھا انھا تفسد التاریخ فلا تبقی من جوھرہ اثر افتیلا ولا رسما محیلا [اسی سے تاریخ خراب ہوتی ہے۔ اس کے جوہروں کا ذرا سا نشان بھی باقی نہیں رہتا اور نہ حیلہ و حوالہ کے لئے کوئی نقش۔]

ٹامس کارلایل[۱] Thomas Carlyle انگلستان کا مشہور مورخ و اہل قلم کہتا ہے کہ تاریخیں اتنی ہی مکمل ہوتی ہیں جتنا کہ ان کے مورخ دانشمند ہوں اور اُن کو موہبتِ الٰہی سے نقد و نظر کی قوت اور روح کی لطافت بھی نصیب ہوئی ہو۔

متکلم و مورخ سر آرتھر ہیلپس[۲] Sir Arthur Helps فرماتا تھا کہ تاریخ میرے سامنے مت پڑھو، میں جانتا ہوں کہ سوائے غلط اور جھوٹ ہونے کے یہ اور کچھ نہیں ہوگی۔

امریکا کے بہت بڑے کاتب و مصنف ہنری تھورو[۳] Henry Thoreau کا قول ہے کہ میتھالوجی (داستان ہائے پاستان) میں زیادہ سچائی پائی جاتی ہے بہ نسبت تاریخ کے۔

جرمن فلسفی و مفکر شاپن ہوار Schopenhauer کی رائے ہے کہ تاریخِ عالم کے لئے اخبارات منٹ بلکہ اکثر دفعہ سکنڈ کی سوئی کا کام دیتے ہیں۔ جس گھڑی کے منٹ ہی درست نہ ہوں، گھنٹے کب ٹھیک ہوں گے۔

ہندوستان کے فلاسفر سنیاسی رام تیرتھ[۴] کا ارشاد ہے کہ تاریخ پر کبھی اعتبار ہی نہ کرنا چاہیے کیونکہ اس میں صداقت نہیں ہوتی ..... سوامی جی کے نزدیک تو اُس شخص سے بڑھ کر کوئی مورخ ہی نہیں ہوتا، جس نے محبت میں اپنے اور اپنے دل کو مٹا دیا ہو۔ اللہ رے اخلاص!

سر جارج کاکس نے "ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قائم ہونے کی تاریخ"[۵] اپنے

---

[۱] ولادت ۱۷۹۵ء۔ وفات ۱۸۸۱ء۔ [۲] ولادت ۱۸۱۷ء۔ وفات ۱۸۷۵ء۔ [۳] انیسویں صدی میں گزرا ہے۔ آخر عمر میں عزلت گزیں ہو گیا تھا۔ دنیا چھوڑ کر جنگل کی راہ لی تھی۔ ویلڈین Walden اس کی تصنیف یادگار ہے۔ [۴] ولادت ۱۸۷۳ء گجرات پنجاب۔ وفات ۱۹۰۶ء [۵] History of the Establishment of British Rule in India by the Revd. Sir George W. Cox, Bart. London, 1889, sixth Edition.

اپنے دو صاحبزادوں کی وُسعتِ معلومات و آگاہی کے لئے لکھی تھی جو اسی ملک میں معزز ذمہ دارانہ عہدوں پر مامور تھے۔ فرماتے ہیں کہ "تاریخ نویس کا سب سے پہلا نیز سب سے آخر فرض یہی ہے کہ سچ بولے.... [کسی ملک میں کسی حکومت کا تذکرہ کرتے وقت] لازماً حد سے زیادہ ستایش اور حد سے زیادہ شکایت و نکوہش کرنا ہوتی ہے۔ اگر ہم ایماندار ہیں تو ہم کو بُرائی بھی اُسی صفائی کے ساتھ کر دینا چاہیئے جیسی کہ تحسین کرتے ہیں"۔ (دیباچہ صفحہ ۱۰)۔ "تاریخ اگر واقعات کی سچی سچی تحریر نہ ہوگی تو لاشئے محض ہے۔ اگر وہ اپنا کام انجام دینا چاہے تو اُس کو ہر ایک طرف کی اچھائی اور بُرائی قلمبند کر دینا واجب ہے"۔ (صفحہ ۲۰)

بہر حال، میں نے جن کتابوں سے فائدہ اُٹھایا اور ذکر کیا ہے وہ ہمارے ملک اور حلقۂ علم و خبر میں بڑی عزت و عظمت کے ساتھ دیکھی جاتی ہیں۔ تاریخی حیثیت سے اُن کی روایات و اقوال پر پورا بھروسا کیا جاتا ہے۔ بعض کے منقولات تو صدیوں سے ہند کے آئین و قوانین کا مدار و مسند علیہ ہو رہے ہیں۔

ان خیالات اور اپنے اعتقادات کو واضح کر دینے کی ضرورت میں نے اس لئے اور بھی سمجھی کہ قلم کا سَیّاح اپنے نزدیک تاریخ کا ہفت خواں طے کر چکا ہے۔ بہ حالاتِ موجودہ و بہ اسبابِ ظاہر شاید اُس کو پُرانے قصوں اور داستانوں کے دُہرانے اور اُن کو یاد کرنے کی نوبت اب نہ آئے گی۔

اچھا یقبول! باز گو از باغ و از احوالِ باغ تا کہ از دیوار و در یابی فـراغ

پھولوں کی ٹوکری۔ باقی چیزیں

دوررس نکتہ بین سیلانی باغ میں خوب گھوم پھر کر ایک ایک چپّہ اور ایک ایک گوشے کو دیکھ بھال آیا۔ تھک کر بیٹھ جانا چاہتا ہے۔ کسی پُرانے اُستاد کا شعر زبان پر ہے۔

سَیر کی، خوب پھرے، پھول چُنے، شاد رہے — باغباں! جاتے ہیں، گلشن ترا آباد رہے

پھر بھی وہ بڑی حسرت و عبرت کے ساتھ دیکھتا ہے کہ وقفہ وسکون اُس کے نصیبوں میں نہیں۔ اُس نے سمجھا تھا کہ اُس کی آنکھ اور قلم، دونوں اپنا کام پورا کر چکے۔ اب فراغت و راحت میسر ہے۔ لیکن یہ یک نظرِ سرسری باغ کے اندر اور باہر کی کچھ اور یادگاریں اُس کے سامنے آجاتی ہیں۔ دَامن چھوڑنا نہیں چاہتیں پیشِ نگاہ باغ کے رُخ پھاٹک کی عمارت ہے۔ اُس کے اندر (جنوں) کی طرف بھی نشست گاہیں اور سیر گاہیں ہیں۔ ایک اچھی قطع اور نئے ڈھنگ سے گنجایش پیدا کرکے کچھ نہ کچھ اور جگہ بھی رہنے سہنے کے لئے نکال دی گئی ہے۔ بجائے خود بہت سی چیزیں جاذبِ نظر اور دلکش ہیں اور۔ اے جنون ہمّت کہ منزل اور دو اِک گام ہے۔ لیکن ہمّت عذر خواہ نے بڑھ کے جواب دے دیا۔ پھر بھی دو چار متفرق باتیں ایسی ضرور رہی جاتی ہیں جن کا ذکر اسی سلسلہ میں مختصراً و مجملاً ہو جانا مناسب ہے۔

(۱) واٹر ورکس کا کارخانہ، دفتر، تالاب اور ٹنکی وغیرہ باغ کے مشرق و شمال[۵] دیوار کے متصل ہیں۔ ان کے سلسلہ میں دروازے بھی نئے قائم کئے گئے ہیں۔ یہ چیزیں نئی ہیں اس لئے اس وقت میرے دائرۂ خدمت تحریر سے خارج ہیں۔ اسی طرح اینٹ کی دیوار، جو اُس طرف کی دیوار باغ کو ہٹا کر بازار کی طرف یعنی باغ کے پورب اور دکھن، واٹر ورکس نے اپنی ضرورتوں سے، بالو گودام وغیرہ کے احاطہ کے طور پر ۹۲-۱۸۹۱ء میں بنائی تھی، جدید ہے۔ مگر اُس کو شوریت کے خانہ بر انداز اثر نے بوڑھا بنا رکھا ہے۔ وہ باغ کی اصلی، سنگین و عریض دیوار کے مقابلہ میں بہت کمزور اور اپنی پستی و کم چوڑائی کی بدولت

---

[۵] ڈسٹرکٹ گزیٹیر غازی پور ۱۹۱۱ء، صفحات ۲۰۳ و ۲۱۵۔

انگشت نما ہے۔

(۲) ۱۸۵۷ء کے آشوب و انقلاب سے پہلے کے معمر اور سن رسیدہ حضرات کی چشم دید ہے کہ اس پھاٹک کے سوا بود و باش کے قابل شاہی زمانہ کے مکانات یہاں نہیں تھے۔ اتفاقیہ سیر و تفریح آمد و رفت کی اور بات ہے۔

(۳) موجودہ کوارٹرز (مَساکن) حالات اور ضرورتوں سے مجبور ہو کر مالیوں اور شاگرد پیشہ کے لئے بنوائے گئے ہیں۔ بعض شمال و غرب کے گوشہ میں دیوار سے ملحق ہیں اور بعض مُتّصل، مگر اس انداز سے تیار ہوئے ہیں کہ اس حصّہ باغ کی عدم آراستگی اور تصرفِ نار وا پر ان سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ان کے سامنے کے بلند درختوں کے گھنے جھنڈوں نے پردہ ڈال رکھا ہے۔

(۴) سوپرنٹنڈنٹ باغات یعنی محکمہ زرعی کا دفتر و سامان خانہ، تمبولی بیگم کے گنبد کے اوتر، سلیقہ و شعور سے نیا تعمیر ہوا ہے۔

(۵) محافظِ آثار قدیمہ کا دفتر پھاٹک کے ایک مغربی کمرہ میں (صفحہ ۱۶) بدستور عُزلت گزیں ہے۔ سیاہ تختہ پر سفید حرفوں میں یہ عبارت تحریر ہے Office. Conservation Assistant Archaeological Survey. Muhammadan and British Monuments, Northern Circle. Allahabad. مقابل کی کوٹھری میں نگراں سپاہی رہتے ہیں۔ ان کے سوا بھی نیچے اوپر کئی کمرے اور کوٹھریاں ہیں۔ خالی پڑے ہین۔ سنّاٹا چھایا رہتا ہے۔

خامشی میں زندگی کی بو کہیں باقی نہیں — ہیں مکاں باقی مگر ان کے مکیں باقی نہیں

(۶) باغ کے اندر اندر دیوارِ احاطہ کے ساتھ ساتھ پختہ سڑک گھومتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ کہیں کہیں یانسی اور تاڑ وغیرہ کے آسمان شگاف درخت بھی نظر افروز و سایہ انداز ہو جاتے ہیں۔

(۷) باغ کے پُرانے پختہ چاہ لائق ذکر تین ہیں۔ یہ کنوئیں خوب بڑے بڑے اور چوڑے چکلے ہیں۔ اس عالم کی تمام فناپذیریوں اور اس دارِ ناپایدار کی بیوفائیوں اور زود میریوں کے باوجود مضبوط، مستحکم اور دیرپا سمجھے

جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان میں سے کسی پر کوئی کتبہ نہیں لگا ہے۔ نہ باہر سطحِ زمین پر کوئی سابقہ تعمیر کھلی ہوئی ہے، جس سے ان کی قدامت و حالتِ گزشتہ کا اندازہ ہو سکے۔ قیاسِ غالب یہ ہے کہ آبیاری کے واسطے یہ کنوئیں پہلے تیار کر دیئے گئے ہوں گے تب باغ و درخت لگائے گئے ہوں گے۔ (پہلا) یہاں والوں کے طعن آمیز قول کے مطابق واٹر ورک پر تصدق ہو گیا۔ کچھ دن اُس کے کارپردازوں اور خدمت پیشہ جماعت کے مصرف میں رہا تھا۔ بہرکیف اب اس سے شہر اور باغ کی آب رسانی اور باشندگان کی راحت و فیضان کا کام نہیں لیا جاتا ہے۔ اصلی غرض مفقود اور اُس کی نفع رسانی عام معدوم ہے۔ بے شبہ موجودہ عظیم الشان سلسلۂ آب رسانی کے قائم ہو جانے کے بعد اس کی ضرورت بھی چنداں نہ رہی تھی۔ اس میں آہنی زنجیریں اور تُوآڑا ہے۔ صفائی کے وقت کبھی اس کے اندر سے پیتل کے نل (پائپ) مخصوص وضع اور مضبوط ساخت کے نکلتے تھے۔ (دوسرا)۔ تنبولی بیگم کے گنبد کے قریب، اُتر پچھم کو، باغ کی غربی دیوار سے متصل ہے۔ زیادہ تر مالیون، محافظانِ باغ اور اُن کے اہالی کے تصرف میں رہتا اور "پُوروہ والا" کہلاتا ہے۔ (تیسرا)۔ تقریباً وسط میں، شاہ بیگم کے مقبرہ کے پیچھے، یعنی شمال کو ہشت پہل ہے۔ "خزانہ والا" اس کے دو منھ یا دہانے تھے۔ ایک اوپر کا دہانہ، اصلی، جہاں سے پانی کھینچا جاتا ہوگا اور اب بھی لیا جاتا ہے۔ دوسرا کنوئیں کے دَور یا گھیرے میں۔ اس کی سنگین جگت، پختہ مَن اور مُجرے وغیرہ بہ تغیرِ خفیف، سب کچھ موجود ہے۔ پورب پچھم دونوں طرف یکساں۔ دونوں جانب کی دیواروں کو بقدرِ ضرورت بلندی دے کر پھر نشیب میں لا کر سیڑھیاں بنا دی ہیں اور مناسب طور پر ڈھالو بنا کر اور اونچائی دے کر خشک مٹی سے بھر دیا ہے۔ ان پر بیل چلتے ہوں گے۔ اور شاید اب بھی کبھی کبھی چلتے ہیں۔ بظاہر یہ اضافے، یا ان کی ساخت نئی نہیں معلوم ہوتی۔ کنوئیں کا وہ دوسرا (خاص) دروازہ، جنوب کو مقبروں کے رُخ، لمبی دیوار کے عین وسط میں تھا، سلطان نثار بانو کے گنبد کے بالکل پیچھے۔ کُھلا ہوا، بے کواڑوں کا تھا۔ جو کمسٹ باز و پتھر کی تھی۔ اسی (صدر) دروازہ میں ہو کر اندر جانے کے لئے زینہ تھا اور صرف یہی ایک راستہ نیچے جانے کا تھا۔ داخل ہونے پر ایک اوسط درجہ کا چوکور، تقریباً تین تین گز لمبائی چوڑائی کا کمرہ ملتا تھا۔ جس کی چاروں طرفوں میں چار کھڑکیاں یا چھوٹے چھوٹے دروازے تھے۔ گز ڈیڑھ گز سے زیادہ اونچے نہ رہے ہوں گے۔ اندر اندر قالبوتی یا محراب دار بنے تھے اور کنوئیں کی گولائی میں کُھلتے تھے۔

دروازوں کے اُدھر روک یا آڑ کے لئے پتھر کے واسے کھڑے اور جڑے تھے۔ کواڑ نہیں تھے۔ کنوئیں کی ساخت اور اس کی گہرائی کے وسط سے کچھ اوپر محرابوں کے نشان اور کچھ اور آثار باقی ماندہ اب بھی نظر آتے ہیں۔ جاننے والے بتاتے ہیں کہ یہیں کھڑکیاں یا بغلی دروازے تھے۔ اس جگہ غسل ہوتا تھا۔ یہاں سے پانی تک پہنچ جانا اتنا ہی آسان تھا جتنا یہاں سے بیٹھے بیٹھے پانی کھینچ لینا۔ پانی سے اُٹھنے والی ہوائیں اور ابخرے اُس کو سرد رکھتے تھے۔ وقتِ ضرورت یہی خلوت خانہ ہو جاتا تھا اور یہ سب کارخانے اور کھیل تماشے رعایا کی سیر و تفریح کے لئے تیار و مہیا کئے گئے تھے۔ ورنہ قلعہ و محلات و قصور کو چھوڑ کر بیگمات و شہزادیاں یہاں نہ آتی تھیں اور نہ امراؤ عمائد کی خواتین کی نشست و برخاست اور چُہلیں کبھی یہاں ہونے پاتی تھیں۔ باشندگانِ شہر کے لئے یہ دروازے کھلے ہوئے تھے۔ انھیں کے سوز و ساز کے رنگین دفتر یہاں کھلتے اور راز و نیاز کی داستانیں چھڑتی تھیں۔ محبت و نشاط اور مہر و وفا کی روح بالیدہ ہوتی تھی۔ گرمی کا موسم یہاں کی لطف اندوزیوں، سرمستیوں اور عیش پرستیوں کے لئے فصلِ بہار تھا۔ جگت سے کچھ نیچے بڑے بڑے پتھروں کے گڑھے ہوئے سوراخ دار دو دو ڈول، کنوئیں کے اندر، چاروں طرف برابر برابر لگے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان سے شامیانے نصب کرنے، پردوں کے لگانے اور اور ضرورتوں کا کام لیا جاتا تھا۔ بیس برس ہوئے کنوئیں کا یہ دروازہ یا مدخل باہر سے بند کر دیا گیا۔ دیوار میں ایک چوکھٹ یا دروازہ صاف نمودار ہے جو اینٹوں سے چُن دیا گیا ہے اور جس کو دیوار پر لگی ہوئی بیلیں نگاہ سے پنہاں رکھتی ہیں۔ پل چلانے یا پانی لینے کے لئے صرف اوپر کا مُنہ کھلا رکھا ہے۔

یہ کنواں فوارہ والے حوضوں کے واسطے سب سے قریب ہے۔ یہیں سے دونوں حوضوں اور فواروں کے لئے پانی کی بہم رسانی ہوتی تھی۔ اس کی جگت کی اونچائی دیوار کی بلندی کی مناسبت سے رکھی گئی تھی۔ کنوئیں سے دیوار یا پشتہ پر بہتا ہوا پانی حوضوں میں بھی پہنچتا تھا۔ فوارے چھوٹتے تھے۔ حوض اب خشک رہتے ہیں۔ کوئی قدرداں نہیں۔ فوارے اپنی خستہ حالی پر نالاں ہیں۔ کوئی پرساں نہیں۔ یہ سنگین و منقوش تھے۔ ایک بالکل ٹوٹ گیا۔ اس کی جگہ سادہ سا نیا لگا دیا گیا ہے۔ اَن مِل بے جوڑ۔ یہ کنواں نہ صرف معمولی چاہات بلکہ اپنے چپ و راست کے کنوؤں سے بھی بڑا ہے۔ مسٹر ڈانیل کے کھینچے ہوئے

نقشہ میں یہی کنواں اور یہی دیوار دکھائی دیتی ہے۔ حاجت مندوں اور پیاسوں کا ہجوم ہے۔ بیلوں اور اور جانوروں پر پکھالیں، زنبیلوں اور مختلف وضع وطرز کے برتنوں میں، نیز سروں پر لوگ پانی لئے جا رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس پر کوئی کتبہ نہیں اور کہا جاتا ہے کہ جو حصہ بند کر دیا گیا ہے وہاں بھی کوئی پتھر نہیں تھا۔

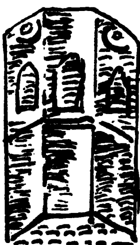
(۸) مقبروں کے درمیان کے دونوں حوض، جن کا ذکر صفحات ۹۶،۹۷ پر آچکا ہے، اندر اندر مربع ہیں۔ لیکن ان کی سطح بالائی پر، چاروں کونوں پر، پتھروں کے چھوٹے بڑے تختے، بقدرِ مناسب، سلیقہ سے رکھ کر مثلث بنا دئے گئے ہیں، جس سے ان کی شکل اوپر اوپر ہشت پہل نظر آتی ہے۔ ان میں مصنوعی آبشار بھی تھے، پانی کے اخراج کے لئے بدررو بھی۔ زرد و سرخ پتھر لگا تھا۔ چڑھنے کے لئے پچھم پورب، دونوں طرف، سیڑھیاں ہیں۔

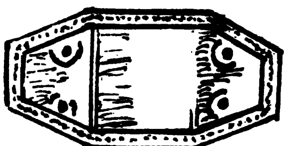
(۹) مقبروں کے شمال، چبوتروں سے ہٹ کر، اینٹ چونے کی پختہ دیوار[۹۵]، شاہ بیگم کے روضہ سے سلطان بہار کے گنبد تک شرقاً غرباً چلی گئی ہے۔ مقبرۂ خسرو کے شمالی وغربی گوشے کو مَس کر لینے پر اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس میں جا بجا آبشار اور جھرنے بنے تھے۔ جھرنے خشک پڑے ہیں۔ بدنمائی دُور کرنے کے لئے دیوار پر سدا ہری بیلیں چڑھا دی گئی ہیں۔ خوب پھیلی اور بڑھ گئی ہیں۔ دیرپا اور لطفِ نظر ثابت ہو رہی ہیں۔ کنوئیں کے اندرونی کمرے کا تعلق اسی دیوار سے تھا۔ اور اسی ضرورت سے نیچے کو ایک دروازہ بھی اس میں رکھا گیا تھا۔ دیوار کا طول پچھتر قدم، عرض ساڑھے تین فٹ اور بلندی گیارہ فٹ ہے۔ دیوار کی بلندی سے ڈیڑھ فٹ نیچے کنوئیں کی سنگین جگت ہے۔ سوا دس فٹ کی بلندی پر پہنچ کر دیوار پر نو انچ چوڑی نہر یا نالی رواں کی گئی ہے۔ دیوار کی ساخت میں بھی خوشنمائی اور استحکام کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ دیوار تین حصّوں میں منقسم نظر آتی ہے۔ بیچ والا حصّہ، جو زیادہ بلند اور بظاہر کچھ زیادہ مضبوط بھی ہے گیارہ فٹ اونچا ہے۔ اسکے دونوں سروں پر گولائی دے کر پشتہ سا بنا دیا ہے، اور اُس کے ذریعہ سے نہر کو دوسرے یعنی پست حصۂ دیوار پر اُتار دیا ہے۔ اس کے بعد، دونوں طرف یعنی دائیں بائیں ہاتھ کی دیوار بس کم بلند،

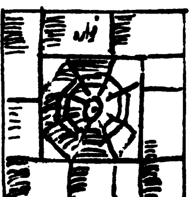
---

[۹۵] تذکرہ صفحہ ۹۷۔


مقبرہ کی جانب کوئیں کا دروازہ
۵۰ قدم


پانی


دیوار کے شمال جانب سے کوئیں
کا اندرونی حصہ


ہوا
۱۳ قدم
حوض کا سطحی نقشہ

اور اسی مناسبت سے موٹی بھی کم ہیں۔ پچھم کو جہاں دیوار ختم ہوتی ہے، یہ نہر مدوّر شیشہ میں ہو کر پانچ فٹ کی بلندی سے، پتھر کے گول خوبصورت دہانہ (پرنالے) کے ذریعہ سے نیچے کو گر جاتی ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا آب گیر (حوض) یا آیدان ہے جس میں اس نالی یا نہر کا لایا ہوا پانی گرتا اور جمع ہوتا تھا اور یہیں سے تقسیم ہو کر ہر طرف پہنچتا تھا۔ دیوار کے آس پاس، ایک دو حوض اور، چھوٹے چھوٹے، جابجا، آب دُزد (زمین دوز) و آب خورد و آب ریز کی ضرورتوں سے بنائے گئے تھے۔ اب تک ہیں سنگی آبشا کا زیریں حصہ جو پتھر کا خوشنما تراشا ہوا ایک بڑا تختہ ہے، سلامی دار نصب کیا گیا ہے۔ اس کے کھلے ہوئے دامن پر اُبھرے ہوئے پھول اور مُہرہ ماہی کی شکل کے نقش و نگار ہیں، جو دلکشی اور جذبِ نگاہ کے سوا پانی کے منتشر کرنے اور نیچے پہنچانے میں بھی خوب کام دیتے ہوں گے۔ پرانے راجبہاؤں اور نالیوں کا سلسلہ ہنوز قائم و کارآمد ہے۔ جہاں تک تحقیق کر سکا، دیوار کے اندر یا کسی اور جگہ کوئی اور آب رو یا آب خور یا سرداب ایسا نہیں ہے، جو میری آنکھ سے اوجھل رہا اور تلاش سے چھوٹ گیا ہو۔ یہ مختصر، سادہ سا بندوبست، بجائے خود، آبیاری و آبپاشی کا نہایت کارآمد، عمدہ اور مکمل، طریقہ اور کارخانہ تھا جو اس وسیع رقبہ کے لئے کفایت کرتا، اور سارے باغ کو خوب سیراب رکھتا تھا۔

(۱۰) اسی دیوار کے پچھم والے سرے پر ایک چھوٹی سی کوٹھری شاہ بیگم کے مقبرہ کے نزدیک ہے۔ "بُرجیا" کہلاتی ہے۔ دکھن کو چھوڑ کر اندر سے بالکل گول ہے۔ اس میں ایک چھوٹا سا دروازہ یا سنگی چوکھٹ بازو جنوب رُخ نصب ہے۔ کواڑ اب نہیں رہے۔ کہا جاتا ہے کہ کبھی حمام تھا۔ لیکن اس کے ماننے میں مجھے تامّل ہے۔ کسی معمولی مسجد کے غسل خانہ سے زیادہ گنجایش اس میں پائی نہیں جاتی، نہ اُٹھنے بیٹھنے کے لئے کافی جگہ ہے۔ پھر یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس کے اندر، نیچے بھی کوئی عمارت تھی یا نہیں۔ اگر تھی تو اُس کا راستہ کہاں اور کدھر سے تھا۔ میرے نزدیک اس حجرہ کا مصرف اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ غریب خدمت پیشہ دھوپ اور بارش میں یہاں پناہ لیتے ہوں گے۔

(۱۱) سلطان بہار بیگم کے گنبد کے اُتر ایک ہشت پہل مرتفع سنگی چبوترہ ہے اور اچھی حالت

میں ہے۔ اس کے چاروں طرف اور تمام دالانوں پر عمدہ و دل پسند کام پتھر پر نقش و نگار کا ہے۔ اندر کا جوف بھی بیکار نہیں چھوڑا گیا بلکہ ایک متوسط گنجایش کے کمرے کے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے۔ اس کا دروازہ شمال رُویہ، مربع بلا چوکھٹ اور کواڑ کا تنگ، نیچا اور مختصر ہے۔ اندر اُترنے کے لئے سیڑھیاں ہیں۔ کمرہ روشن اور ہوادار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ افسران و منتظمانِ باغ یہاں بیٹھ کر شاگرد پیشہ، مزدوروں اور ملازموں کو تنخواہ، زرِ اُجرت و انعام تقسیم کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ قرین قیاس نہیں۔ اُمراء و عمائد کے داخلہ کے لئے یہ نیچا دروازہ یا چوڑا سوراخ اور کھڑے ہونے کے لئے یہ پست چھت قطعاً موزوں نہیں۔ تفریحاً نشست کے واسطے چبوترہ اوپر اوپر بہت کافی اور اچھا ہے۔

قلم کا مسافر خدا خدا کر کے اپنی منزلِ مقصود پر پہنچا۔ اُس کی محنت ٹھکانے لگی۔ اُس نے خسرو باغ کے در و دیوار، گل و گلزار، خزاں و بہار کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ عہدِ جہانگیری کی رنگ رلیاں اُس کے سامنے ہیں اور سلیم کی وفاپرستیوں کی تصویر پیشِ نظر۔ وہ خسرو باغ کے ایک ذرّہ ذرّہ میں محو ہو رہا اور اُس کی ایک ایک چیز کا خیال کر کے والہانہ انداز سے گنگنا رہا ہے۔

سر ایں جا، سجدہ ایں جا، بندگی ایں جا، قرار ایں جا   بہار ایں جا، قسنار ایں جا، مزار ایں جا، نگار ایں جا



نگارِ اوّلیں، بہارِ آخریں

باغ کا مجوزہ خاکہ یا بعدِ تعمیر و نصب کا کوئی پُرانا نقشہ مجھے دستیاب نہیں ہوا۔ نہ کسی کا پتہ چلا۔ جس سے اس کی ابتدائی ترتیب و تشکیل اور بعد تنظیم کے اضافوں اور اصلاحوں کا اندازہ ہو سکتا۔ ضلع کے محافظ خانۂ مال میں قلعۂ الہ آباد کا ایک نقشہ شاہی عہد کا محفوظ ہے جس کے ساتھ کچھ تفصیلات وحسابات تعمیر بھی منسلک ہیں مگر ان سے خسرو باغ کے معاملات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

سب سے پُرانی چیز جو میری نظر سے گزری وہ رانی (شاہ بیگم) کے روضے اور اُس کے حوالی کا نقشہ ہے جو ۱۷۹۰ء میں یا اس کے قریب مشہور صناع و دست کار ٹامس ڈانیال نے کھینچا تھا اور جس کی پُرانے طرز سے چھاپی اور رنگ دی ہوئی نقلیں اب بھی کہیں کہیں پائی جاتی ہیں۔ میں نے اس کو قیصر باغ لکھنؤ کی امیر الدولہ پبلک لائبریری میں دیکھا تھا (صفحات ۱، نوٹ ۹ و ۸، ۱۲۰)۔ موجودہ خسرو باغ کا اس نقشہ سے مقابلہ کرنا میرے لئے مشکل ہے۔ اس لئے کہ نہ وہ کمیاب چیز قیصر باغ سے خسرو باغ پہنچ سکتی ہے، نہ خسرو باغ کا کوئی حصہ قیصر باغ تک منتقل کر سکتا ہوں۔ میرے امکان و قوت سے دونوں باہر ہیں۔

اس لئے باغ کی گزشتہ و موجودہ حالت کے موازنہ کے لئے آپ کو زیادہ تر قرائن و قیاسات سے کام لینا ہوگا۔ ساتھ ہی ایک انصاف کوش ناظر و ناقد کی حیثیت سے یہ دو باتیں پہلے ہی دیکھ لینا ہوں گی:۔

(۱) باغ کی نگہداشت و پرداخت کیسی کی جاتی ہے۔ حکومت کے چشمۂ فیض و چشمِ کرم کی کیا کیفیت ہے؟

(۲) کسی ایسے پُرانے باغ کا بحالہ و اصلہ آج تک قائم رہنا کہاں تک ممکن تھا؟ جدید ترتیبات، گلشن آرائی و چمن پیرائی سے اس کے بچنے کی کیا صورت ہو سکتی تھی؟ گزشتہ چار سو برس میں، رائج الوقت اصلاحات و تنظیمات کا کیا اثر پڑا ہوگا؟

ایک غیر ذمہ دار سہل انگار شخص کے لئے کمال جرأت سے بے تکلف کہہ ڈالنا آسان ہے کہ باغ کی وہ صورت و ہیئت نہیں رہی جو مجوزین اور کاریگروں کے ذہن و خیال میں تھی۔ تاڑوں کی افراط اور جا بجا موجودگی کے سوا قدامت و کہن سالی کی باتیں اور پرانی چیزیں یہاں کیا رکھی ہیں؟ منتظمانِ حال نے بالفاظِ شائستہ خود ہی تسلیم فرمایا ہے کہ نو دس برس پہلے بعض بعض ٹکڑے مغربی طرز میں ڈھلے اور رنگے ہوئے تھے، جن کی ایک بڑی حد تک درستی کر دی گئی ہے۔ بیگانہ وضع کی دراندازیاں دور کر دی گئی ہیں (صفحہ ۷۰)۔ بااین ہمہ پہلی ہی غلط انداز نگاہ سے روشن ہو جاتا ہے کہ اس مرغزار کی متدعویہ اصلاح یافتہ ترتیب و حالت بھی اس کے بانیوں کی اصلی تجویز و مقصود کی آئینہ دار نہیں مانی جا سکتی۔ شاید اس کی مکمل بازگشت و رجعت کے لئے کئی قرن درکار ہوں گے۔

مانا کہ وہ گنجان و تناور درخت اور گھنی گھنی جھاڑیاں اور کنج اب اس وسیع رقبہ پر ہر جگہ پھیلے ہوئے نظر نہیں آتے، جو مغلوں اور وسط ایشیا کے امرا کے قدیم باغوں کی رونق و دلکشی کا سرمایہ سمجھے جاتے تھے، اور جن کے یہاں بھی بکثرت موجود ہونے کی توقع کی جاتی ہوگی۔ لیکن کیا پھاٹک سے مقبروں تک کے فراخ راستہ پر دو رویہ پرانے پرانے درختوں کی قطاریں ہم کو بھلی نہیں معلوم ہوتیں؟ کیا مقبرۂ خسرو کے تین جانب (یعنی پچھم چھوڑ کر) اس کے بسیط و عریض سنگین چبوترہ کے گرداگرد املیوں کے جھنڈ ہم کو مبہوت نہیں بنا دیتے۔ کیا اور مقبروں، روضوں اور مرفہ الحال خاندانوں کے گورستانوں کی طرح مولسری کے درخت اس جگہ پائے نہیں جاتے، جن کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو اور گھنی گھنی چھاؤں کوئی کشش و دلربائی نہیں رکھتی؟ کیا مقبروں کے پاس سے دیکھنے پر، ہر جانب، خصوصاً دیوار باغ کے برابر شاندار چھتنار پیڑوں کا سلسلہ ہماری آنکھوں اور دلوں کو نہیں کھینچتا؟ کیا لہلہاتے ہوئے سبزے اور تر و تازہ گھانس کے ہموار لمبے چوڑے پارک نما قطعے خوش نما و نظر فریب نہیں کہے جا سکتے؟ قدیم چمنوں اور خیابانوں کا نشان اگر کوئی صحیح نہیں پا سکتا، تو کس کا قصور ہے؟ گردشِ لیل و نہار کا اقتضا یہی ہے۔ ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ دنیا کے حافظہ کا خزانہ اس کی بہت سی مثالوں سے مالا مال ہے۔ ابھی پینتالیس چھیالیس برس ہوئے، تاج محل کے ایسے نادرۂ روزگار

واجوبۂ عالم روضہ کے پُرانے پُرانے درخت جو بجائے خود ایک ایک تاریخ کے حامل اور اہم واقعات کے مستقل یاد دلانے والے تھے، ایک سبک مغز کوتاہ اندیش حاکم نے کٹوا ڈالے[1]۔ ان کی خالی جگہ تو پُر کر دی گئی ہے، مگر ان صنادید کہن کے وَداعِ دائمی اور تاریخی یادگاروں کے نابود ہو جانے کا قلق وتاسف کس کو سوہانِ روح نہ رہے گا؟

دل کا ٹوٹا ہوا شیشہ ہے زبانِ نیرنگ ساری دُنیا کے ہیں قصّے مرے افسانے میں

خوش نصیب ہیں آپ اور خوش قسمت ہے آپ کا باغ، کہ ایسی گردشوں اور تباہ کاریوں سے مامون ومحفوظ رہا ہے۔

یہ بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ شاہِ عالم ثانی کے قیامِ الہ آباد اور برائے نام عہدِ سلطنت، اور انگریزوں کے تسلط سے پیشتر باغ کی کوئی تقسیم اور آرکیالوجی کل اور ایگریکلچرل ٹکڑوں کی تفریق نہ رہی ہوگی۔

تو فتنۂ زمانہ شدی، ورنہ روزگار بود است پیش ازیں قدرے آرمیدہ تر

لیکن مقبروں اور اُن کے حوالی و متعلقات کی بدیہی حالت دیکھ کر کون حق شناس وحق گو اس سے انکار کرے گا کہ ان کی حالت میں حسبِ اقتضائے زمانہ کوئی شاندار، رونق افزا تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

اُن کا احسان ہے اور ہم پر شکر لازم، کہ عاملانِ حکومت کی توجہ والتفات سے عمارات وغیرہ کی قرار واقعی حفاظت ونگرانی اور صفائی، بوقتِ ضرورت مرمت بھی، ہوتی رہتی ہے۔ ان کے آس پاس حال ہیں بعض معروف و ثمر آور اقسام کے درخت بھی لگا دیئے گئے ہیں۔ وہ قدرتی دلکشی اور مرکزی خوشنمائی جو بابر کے اخلاف کی یادگاروں اور تیموری تاجداروں کے باغات کا طرۂ امتیاز اور وجہ نمود بتائی جاتی ہے، اگر اب بھی مفقود اور کسی حد تک نیست و نابود ہو، عظیم الجثہ پھل دار درختوں کے ساتھ ساتھ شمشاد و صنوبر، انار و سنگترہ کے پیڑوں، گل و ریاحین، لالہ و نرگس کا امتزاج واختلاط، جو دوسری جگہوں پر اتنا اثر انداز، کارگر اور کیف افزا معلوم ہوتا ہے، یہاں پورے طور پر قائم یا کہیں پیدا ہی نہیں ہوا ہو تو اس کے لئے کچھ روز اور صبر و انتظار کی ضرورت ہے۔ آپ کے توقعات یقیناً کامیاب اور بار آور ہوں گے۔ انگریزی مثل ہے۔ Everything comes to him who waits.

---

[1] معین الآثار، صفحہ ۳۷۔

رہا دوسرا جزو زرعی۔ مانا کہ اس روح پرور قطعۂ خاک میں اس کے اصلی خاکے کے کچھ نقش و نگار مٹ گئے ہیں، یا یوں کہیے کہ ان کو خاطر خواہ بدل کر اپنی مصلحت دید یا مغربی ذوق کے موافق، یا نفع خیز کاروباری شکلوں میں تغییر دے دیا ہے۔ کچھ نظر فریب پھلواریاں اور فرحت بخش چیزیں فراہم، یا تجارتی اصولوں پر پودگاہیں قائم کردی گئی ہیں، تو اس کے لئے علامۂ زمانہ سید سلیمان ندوی کا ایک فقرہ مجھے بے اختیار یاد آجاتا ہے جو رسالۂ نقاد کے تبصرہ میں فرمایا تھا "یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کہ اس قسم کی ادبیات سے ہم کو علمی و دماغی فائدہ نہیں پہنچتا کہ اس باغِ ہستی کی ہر چیز کھانے کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ کچھ دیکھنے اور سونگھنے کے لئے بھی ہے"۔ [1]

ان جزئیات و خفیف تغیرات سے قطع نظر فرمائیے گا تو باغ کے یہ چاروں حسین روضے جو ایک لائن، ایک محاذ میں، ایک دوسرے سے مناسب فصل و دوری پر واقع ہیں، بجائے خود قابلِ دید، جاذبِ نگہ اور شاندار نظر آئیں گے۔ آپ ان چار گلدستوں میں اہلِ ہند کے فردوسِ فراغ و سکون کے چار شگفتہ پھول بُستاں افروز پائیں گے، یا گورگاہیوں کے سحر کارانہ سلسلۂ تعمیرات اور اُن کے کمالاتِ رنگ و جمال کے چار طلسم جلوہ افزا دیکھیں گے یہی نہیں، جب اس مقام سے آپ اپنے گردو پیش نگاہ ڈالیں گے تو سارا باغ اپنے سرسبز و عالی شان حاشیوں اور ہرے بھرے دامنوں، دلکش لانوں کے ساتھ پوری رعنائیاں لئے ہوئے آپ کی آنکھوں میں کھنچ کر آجائے گا اور آپ اُس وقت محسوس فرمائیں گے کہ اس پیکرِ لطیف میں وہ سب خوبیاں اور زیبائیاں مجتمع ہیں جن کا آپ کا ذوقِ سلیم مشتاق و متمنی تھا۔ نہیں خسرو باغ میں اسکے علاوہ بھی آپ کو وہ بہت سی باتیں موجود ملیں گی جو ہمارے ملک کے بہت سے باغات اور نزہت گاہوں میں عموماً ملحوظ نہیں رکھی جاتیں۔ میرے نزدیک اگر کچھ کمی ہے اور فرق و امتیاز، تو اسی قدر کہ اکبری و جہانگیری عہد کی بعض تفرج گاہوں کی طرح اس میں سنگ مرمر کی نہریں اور حوض نہیں بنائے گئے تھے، نہ کوئی شاہانہ کوشک یا بارہ دری تعمیر ہوئی تھی۔ میں کہوں گا کہ سنگِ مرمر کی کھپت اور زیادہ استعمال تو نفاست پسند شاہجہاں کے دل و دماغ کی ایجاد اور اُس کی نازک خیالی کا کارنامہ تھا۔ حقیقتہً اس کا پورا رواج اس باغ کے

---

[1] رسالۂ معارف، مئی ۱۹۱۸ء، صفحہ ۵۶۔

پچاس ساٹھ برس بعد ہوا ہے۔

صاحبِ مفتاح التواریخ نے اس کو "باغِ بادشاہی" کے نام سے یاد کیا ہے۔[1] ممکن ہے کہ سو برس سے پہلے یہ باغ اسی نام سے یا زیادہ تر اسی نام سے مشہور و معروف رہا ہو۔ لیکن وہی ممتاز مورخ کچھ دن بعد اپنے انگریزی تذکرۂ مشاہیرِ شرق میں اس کو ہر جگہ "باغِ سلطان خسرو" لکھنے لگا تھا۔[2] آجکل تو عوام النّاس میں "بڑی باغ" کے نام سے شہرت رکھتا اور خلد آباد کی منڈی اور تر و تازہ میووں اور موسمی پھلوں کی جائے فروخت کے قرب کی وجہ سے زیادہ تر اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔

ایک عطائی یا ناماہرِ فن کہہ سکتا ہے کہ بادی الرائے میں باغ کے لئے اس سے زیادہ موزوں اور اچھی جگہ قلعہ کے قریب، دریا کے کنارے ہو سکتی تھی۔ جہاں محلات و قصور کے غرفوں اور دریچوں اور بادشاہی ایوانات کے برجوں اور کنگروں سے صانعِ قدرت کی جاندار نیز بے جان مخلوق صبح کے طلوع اور شام کی شفق کی رنگا رنگ تجلیوں اور نظاروں سے متمتع ہوتی۔ باغ کے سرسبز و سدا بہار اشجار دھوپ گرمی اور روشنی سے فائدہ اٹھاتے، اپنے پتوں پر سونے کے ورق چڑھاتے، تابشِ مہر و ماہ سے حیاتِ تازہ حاصل کیا کرتے۔

غالباً یہ باغ کسی ویران غیر سطح رقبہ پر آباد کیا گیا تھا۔ اسی لئے یہاں کوئی قدرتی مناظر یا چشم فریب تماشا گاہیں پائی نہیں جاتیں۔ بنیاد پہلے ہی پڑ چکی تھی کہ شاہ بیگم کی اچانک موت اور بہ عجلت تدفین اس غیر آباد، وسیع قطعۂ زمین کی عزت افزائی و سربلندی کا باعث ہوئی، جو نو آباد شہر کے سواد میں ہونے کے سوا اس وقت بھی کوئی سامان و اسبابِ دلکشی اپنے اندر نہ رکھتا ہوگا۔ اور پھر مقبرہ کے اطراف اور متصلہ رقبہ کو شاداب بنانا، پُر لطف و بارونق رکھنا لابد ہوا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ رعایا کی سہولت، باشندگانِ شہر کی آسائش و تفریح کے خیال سے قریبِ شہر کی اس اراضی کو ترجیح دی گئی ہو۔ کوئی اور معقول وجہ میری ناقص فہم اور رسائیٔ ذہن سے باہر ہے۔

سلام! اے خسرو باغ سلام!! ـــ ـــ اے گلگشت آخریں سلام!!! اور رخصت

بہارِ لالہ و گل پھر کبھی کاہے کو دیکھیں گے   چلے ہیں اس چمن سے ہم نگاہِ واپسیں ہوکر

---

[1] صفحہ ۲۲۵ طبع فروری ۱۸۴۹ء آگرہ۔ [2] اورینٹل بیاگرافیکل ڈکشنری، صفحات ۱۵۲ و ۲۴۴۔

حَوالیِؔ باغ

خدا کا شکر ہے کہ "خسرو باغ" اور اُس کے منادید و تفصیلات سے فراغت ہوگئی۔ لیکن باغ کے قریب باہر بھی بعض چیزیں پُرانی اور اُسی کے ساتھ کی پائی یا بتائی جاتی ہیں، جو قابلِ التفات ہیں اور جن کا تذکرہ ان اوراق پر ضروری ہے۔

نُقُوشِ عبرت۔ مسجدیں

شاہِ عالم ثانی کا قیام الہ آباد میں سالہا سال رہا تھا[۱]۔ اس کے منصب داروں اور مقربانِ دولت نے اطرافِ بلدہ کے مختلف حصّوں، نیز شہر کے چند محلّوں میں یادگاریں چھوڑی تھیں۔ بعض کا ذکر مسٹر بیل نے مفتاح التواریخ میں کیا ہے۔ "مسجدِ الہ آباد" کے زیر عنوان ایک مسجد کی نسبت تحریر فرماتے ہیں کہ "باغ بادشاہی" (خسرو باغ سے مراد ہے) کے قریب حسام الدین علی خاں[۲] نے ۱۱۸۱ھ (۱۷۶۷ء) میں تعمیر کرائی تھی۔

---

[۱] منتخب تنقیح الاخبار، مطبوعہ ۱۲۶۶ھ، صفحہ ۴۸۔ گلستانِ ہند، دفتر دوم، صفحہ ۲۳۰۔ مفتاح التواریخ، مطبوعہ ۱۸۴۹ء، صفحات ۲۲ ۵ و ۲۹ ۵۔ بیلس ڈکشنری، صفحہ ۳۴۴۔ سفرنامۂ جنرل گاڈفرے منڈی، صفحہ ۲۵۲۔ شاہ عالم کی سکونت ۱۷۷۱ء تک الہ آباد میں رہی ہے۔ (ڈسٹرکٹ گزیٹیر، مطبوعہ ۱۸۸۴ء، صفحہ ۱۲۶۔) [۲] نسلاً ایرانی تھا۔ یہ اور اس کا چھوٹا بھائی وجیہ الدین خاں دونوں سخن فہم اور شعراء کے قدر شناس و سرپرست تھے۔ اس کے پانچ بیٹوں میں سے دو نامور و باکمال شاعر گزرے ہیں۔ (۱) محمد علی خاں متین، مؤلف تذکرۃ الاحیاء الاشعر۔ یہ بھی بادشاہی منصب داروں کے زمرہ میں داخل تھا۔ (۲) مرزا قلندر۔ جو کبھی کبھی قنبر بھی تخلص کرتا تھا۔ ایک لاکھ شعر یادگار چھوڑے تھے۔ میر غلام حسین خاں طباطبائی، صاحبِ سیر المتاخرین، حسام الدین کا ایک معاصر مورخ تھا۔ وہ اس کو بُرے الفاظ میں یاد فرماتا اور سفلہ منش ملازمینِ شاہی میں شمار کرتا ہے۔ لکھتا ہے کہ پری پیکرانِ نو دمیدہ کو راگ و رقص کی تعلیم دلا کر حضور میں پہنچاتا اور منفعتِ کثیر حاصل کرتا تھا۔ اسی سلسلہ سے معتمدِ سلطنت بن گیا تھا۔ شاہِ عالم اس کا بے حد مطیع تھا۔ (ترجمۂ اُردو، جلد سوم، صفحات ۶۰، و ۸۳ و ۸۹)۔

اس کے دروازے پر قطعۂ تاریخ منقوش ہے۔

در زمانِ شاہِ عالم خسروِ روئے زمین ؎ خلق پرور داد گستر حامیِ دینِ کرام ؎

صاحبِ عدل و سخاؤ بادشاہِ ذوالکرام مستفیض از جودِ او ہستند جملہ خاص و عام

تا کہ مہر و ماہ باشد رونق افزائے سپہر زیرِ حکمش ہفت کشور باد نصرت مستدام

چوں حسام الدین علی خاں خانہ زادِ بارگاہ ساختہ تعمیر ایں مسجد بآئینِ عظام

سالِ تاریخش سروش آورد از عرشِ بریں کعبۂ دیں سجدہ گاہِ مسلمیں بیت الحرام ؎ [۱]

۱۱۸۱ھ

میری رسائیِ خیال نے رہبری کی کہ اس کی تعمیر باغ کی آبادی سے پونے دو سو برس بعد ہوئی تھی، وہ بھی ایک مفلوک [۲] بادشاہ کے ایک متوسل یا نام لیوا کے ہاتھ سے۔ شاید اس لئے باغ کے

۱؎ مفتاح التواریخ، صفحہ ۳۴۹۔ ۲؎ ایضاً صفحہ ۵۲۵۔ نیز مقبولِ ہیچ مدان کا مقالہ ملاحظہ ہو، رسالۂ معارف، نمبر ۲، جلد ۱۴، صفحات ۱۵ الغایۃ ۱۵، ۱۹۲۵ء۔

مانشیر راے مان (حاجی مصطفےٰ) اپنے ترجمۂ انگریزی سیر المتاخرین (جلد دوم) کے ایک نوٹ میں لکھتے ہیں: "لارڈ کلایو جب صوبجاتِ بنگال و بہار و اُڑیسہ کی سند بادشاہ سے لینے آئے تھے تو خود الہ آباد میں اپنی جانب سے کرنیل (جنرل) اسمتھ کو دربارِ بادشاہی میں ایجنٹ مقرر کر گئے تھے۔ اُن کا کام صرف بادشاہ کے قریب رہنے کا تھا۔ مگر کرنیل مذکور عملی طور پر بادشاہ کے آقا بن گئے۔ اپنی قوت و زور کے بھروسے پر قلعہ بلکہ محلات شاہی میں سکونت اختیار کی۔ بادشاہ کو باہر رہنا پڑا۔ جہاں، جہاں پناہ نے اپنی خفت و سبکی کے چھپانے کو مگر بظاہر تفریحِ خاطر کی خاطر سنگ و خشت سے سر مارنا اختیار کیا تھا۔ یا بالفاظِ دیگر سلسلۂ تعمیرات شروع کر دیا تھا۔ غریب کو پھر بھی نجات نہ ملی۔ ایک نئی ذلت اُٹھانا پڑی۔ ایک روز کرنیل صاحب نے نوبت خانۂ شاہی کے شور و غل سے ناخوش ہو کر نیز قلعہ کے دروازہ پر جو آلاتِ جنگ و نبرد آزمائی رہتے تھے اُن کی جھنکار سے برافروختہ ہو کر سب کے بند کر دینے کا حکم دے دیا اور بجانے کی ممانعت کر دی۔ جس سے بہت سے غربا وسیلۂ رزق اور ادائے خدمات سے محروم ہو گئے۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی، چاہے انگریز اس کو کچھ ہی سمجھیں۔ باجوں کا بجانا جن میں متعدد چیزیں ہوتی ہیں اور تین یا چار بار دن میں اور ایک مرتبہ رات میں بجائی جاتی ہیں، شاہانہ شان و شوکت، جبروت و جلالت کی علامت و نمایش اور فرمانروائی و حکمرانی کی دلیل ہوتی ہے۔"

اندر اس مسجد کے بنانے کی اجازت نہ ملی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ کرنیل اسمتھ مانع آئے ہوں جو اُس وقت انگریزوں کی طرف سے دربار میں ایجنٹ کے طور پر مامور تھے اور شاہ عالم کی ذات اور حرکات و سکنات کے نگراں اور مکانات و عمارات شہنشاہی (قلعہ وغیرہ) پر متصرف و دخیل اور ہر حیثیت سے مختار مطلق ہو رہے تھے۔ جن کی دراز دستی کے بہت سے واقعات تاریخ الہ آباد کے صفحات پر مذکور ہیں۔ [1] بہرکیف محافظان باغ اور یہاں کے فوجی و لشکری طبقے کے نمازیوں کی عبادت گاہ تو یہی رہی ہوگی۔ اہل بازار بھی یہیں آکر بارگاہ خداوندی میں سر جھکاتے ہوں گے۔

مجھ سودازدہ شوریدہ سر کو اس مسجد کی تلاش میں بے اندازہ زحمت و تردد سے سابقہ پڑا پھر بھی ناکام رہا۔ خسرو باغ کے پچھم کی کوئی پرانی یا نئی مسجد دور دور تک ایسی نہ تھی جس پر نظر نہ ڈالی ہو۔ نہ کوئی ٹوٹا پھوٹا یا ثابت مقبرہ ایسا چھوڑا جس کے اطراف و گرد و نواح میں اس کی جستجو نہ کی ہو۔ اگر کہیں کوئی دل خوش کن تبدیلی دیکھی بھی تو اُس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں تھی کہ جواہر پاروں کی جگہ خزف ریزوں نے حاصل کر لی ہے۔ جس کو میں تو تضییع مال و تنقیص حال سے تعبیر کروں گا۔

جاننے والوں نے اس کا موقع خسرو باغ کے پھاٹک کے باہر مگر اس کے نہایت قریب یعنی صحن پیش دروازہ کے مغربی بازو کا جنوبی گوشہ تجویز کیا تھا۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب

---

[1] منشی گوکل پرشاد لکھنوی اسی کتاب کے ترجمۂ اردو (جلد دوم) صفحہ ۲۶۰ میں تحریر کرتے ہیں کہ "جب لارڈ کلایو ثابت جنگ بہادر نے اپنے دارالحکومت کلکتہ کو معاودت کی اور کرنیل اسمتھ کو جو بعد جانے لارڈ موصوف کے ولایت میں جنرل ہو گئے تھے، انگلشی فوج کا سردار بنا کر بادشاہ کے حضور میں الہ آباد میں چھوڑا۔ لیکن فی الحقیقت وہ حاکم تھے اور بادشاہ محکوم۔ وہ قلعہ میں رہتے تھے اور حضرت بیرون چھاؤنی میں جو خود تعمیر کرائی تھی۔ جنرل نقارہ نوبت بادشاہی کی دھوں دھوں سے جو قلعہ میں تھا ناخوش ہوئے۔ نوبت نوازوں کو ممانعت ہوئی۔ سچ ہے ہر کرا پنج روز نوبت اوست"

جنرل موصوف کی سخت گیری کی نسبت مسٹر بیل فرماتے ہیں۔ "جنرل صاحب خود قلعہ میں رہتے تھے اور بادشاہ سلامت بستی میں۔ شاہی نوبت خانہ کی آواز صاحب کو ناپسند و ناگوار تھی۔ اس لئے بجانے سے روک دیا تھا۔ ملازمان شاہی کو سرتابی کی کیا مجال ہو سکتی تھی۔" (اورینٹل بیاگرفیکل ڈکشنری، صفحہ ۲۴۴)۔

میں نے اُس جگہ ایک نئی وضع قطع کی خوشنما مسجد، ایک حوصلہ مند مخیر تاجر کی (۱۳۴۴ھ ۱۹۲۵ء کی) بنائی ہوئی دیکھی۔ پہلے اس کو فریبِ نظر سمجھا۔ پھر فلسفۂ تناسخ کا ردِ عمل قرار دیا۔ اہل وقوف و خبرت نے یہ رازِ روشن بتلایا کہ کسی وقت اس جگہ پر یکے بعد دیگرے تین مسجدیں رہی ہیں۔ ایک قناتی، شکستہ و زمیں بوس۔ دوسری قدرے کہن سال مگر کارآمد۔ جس کے کھبے پتھر کے تھے۔ گنجایش کافی تھی۔ جس میں نمازِ جمعہ و جماعت ہوتی تھی۔ پُرانی شاہی زمانہ کی مشہور تھی۔ ایک اتفاقی حادثہ یا درخت کے گرنے سے شہید ہوگئی۔ بہ گمانِ غالب، یہی حسام الدین علی خاں کی رہی ہوگی۔ تیسری کے آثار کئی گز گہرائی پر مع سنگی ستون اور پتھر کے تختوں اور ایک زیرِ زمین قبر کے اُس وقت برآمد ہوئے جب اس نئی مسجد کی بنیاد کھد رہی تھی۔ ان مساجد میں سے اب ایک کا بھی نشان باقی نہیں۔ سب پیوندِ خاک ہوچکیں۔ فَكَمْ مِنْ غَائِبٍ تَحْتَ التُّرَابِ انھیں کی جگہ موجودہ مسجد ایک بڑے پیمانہ اور وسیع تر رقبہ پر تعمیر ہوئی ہے۔

میں نے اس پُرتکلف و آراستہ و رنگین جدید مسجد کو کمال غور و توجہ سے دیکھا اور اس کے تمام قطعات، تاریخوں، ہدایتوں اور تحریروں پر نگاہ ڈالی جو ہر ہر قدم پر عنانگیر نظر ہوتے ہیں اور اوپر سے نیچے تک دیواروں کی زیب و زینت ہو رہے ہیں۔ مجھے تاسف ہوا کہ ان کا ایک حرف بھی یہاں کبھی مسجد ہونے کے متعلق، یا بانیانِ سابق کی یاد دلانے والا اور اُن کا نام و نشان بتانے والا نہ نکلا، جنکو اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ[1] ہونے کا شرف و فضل حاصل تھا۔

یَا لَلْعَجَبِ۔ نئی مسجد کے تہ خانہ میں ایک سادہ سُرخ رنگ کا پتھر رکھا ہوا ہے۔ اس تختہ پر اُبھرے ہوئے حرفوں میں، تین سطروں میں مع جدول یہ منقوش ہے۔

(سطر اول) اَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (دوم) مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰهِ ہجری ۱۱۴۷

(سوم) این مسجد و لقرسہ سردار خان لودھ نے تحد سار ــــ

آخری سطر سماری نما (بے اصول ہیجی) رسم الخط میں (سیدھے سیدھے، کھڑے کھڑے، اور کہیں کہیں بڑے بڑے حرفوں میں لکھی ہے، جس کے صرف چند لفظ بلا کسی دشواری کے پڑھے جاتے ہیں۔ اس جگہ یہ

[1] قرآن مجید، سورۂ توبہ، ع ۱۳۔

اعتراف حقیقت سے قطعاً دُور نہ ہوگا کہ میری اور مجھ بے کمال کے بہت سے باکمال اور اہل بصیرت بزرگوں اور اساتذہ کی چند در چند کوششیں اور دقیق مساعی اس معمے کے حل کرنے میں یک لخت ناکام رہی ہیں۔

اس پرانی مسجد اور برآمد شدہ قبر کے گزشتہ حالات مرقوم نہیں، معلوم نہیں۔ زبانی روایتیں تمام تر مختلف و متبائن ہیں، اس لئے اُن پر اعتماد نہیں کر سکتا نہ سیاقِ عبارت کو فہم و قیاس کی مدد سے درست کرنا چاہتا ہوں۔ مجبوراً نہ "نقل را چہ عقل" سے کام لیا گیا ہے۔ خدا کرے کہ آیندہ ع مردے از غیب بروں آید و کارے بکند۔

خط نسخ اچھا خاصا اور کسی حد تک باقاعدہ اور صاف ہے۔ تاہم خوش قلم محرر کی سرنوشتِ تقدیر نے حروف اور اعراب کی پیہم غلطیوں کو نہ صرف اپنے دامن میں پناہ دی بلکہ نمودار کر رکھا ہے۔

کچھ بہت دن کی بات نہ تھی جو کوئی شخص یہ نہ بتا سکتا کہ یہ لوحِ تاریخ کب اور کہاں نکلی تھی۔ ثقہ و عادل، معتبر و مقدس ہستیاں شاہد ہیں کہ یہ بچا کھچا پتھر اسی زیرِ زمین مسجد کا تھا جو مدفون تبرکات اور منتشر متروکات کے ساتھ دستیاب ہوا تھا۔ اسی لئے قابلِ قدر یادگار کے طور پر محفوظ و مخزون رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تھوڑے ہی زمانہ بعد، "قبل از وقت" اس سردار خانی معبد کو کسی آفت ارضی یا سماوی نے رخصت کر دیا ہوگا، یا کسی ناخدا ترس سنگدل نے اپنے بقائے نام و شہرت اور تعمیرِ جدید کے شوق میں خیرباد کہا ہوگا۔

اللہ رے انقلاب نہ محراب ہے، نہ دَر — پتھر فقط عمارتِ مسجد کا رہ گیا

میرا مبلغِ علم و وسائلِ تحقیق یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ یہ سردار خاں لوحانی کون تھا؟ اُس زمانہ کی تاریخ کے اوراق پر جس سردار خاں کا نام زیادہ روشن نظر آتا ہے، وہ ایک مقتدر عالمگیری امیر ششش ہزاری منصب دار تھا[1] جو وفورِ اعتمادِ ملوکانہ سے زیادہ تر ذاتِ شاہنشاہی کے قریب خدمات نظارت[2] و داروغگی فیل خانہ[3] وغیرہ پر مامور رہا تھا۔ اُس کا کبھی الٰہ آباد آنا پایا نہیں جاتا اور ۱۱۴۶ھ (۱۷۳۴ء) یعنی محمد شاہ کے عہد تک زندہ و برسرِ کار رہنا تو قطعاً غیر متیقن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نام کے جتنے ممتاز ارکانِ دولت کا ذکر کتابوں اور تاریخوں میں ملتا ہے ان میں سے کسی کا تعلق الٰہ آباد سے ثابت نہیں ہوتا۔

میرا دل اسی تحقیقات و خلفشار میں مبتلا اور دماغ انھیں گتھیوں کے سُلجھانے میں مصروف تھا کہ

---

[1] عالمگیر نامہ، صفحہ ۲۲۶۔ [2] عالمگیر نامہ، صفحہ ۱۰۳۔ [3] ایضاً صفحہ ۱۰۸۔

ایک خضرِ طریقت نے رہبری فرمائی اور اُس مسجد کا ذکر کیا جو خلد آباد کے مشرقی پھاٹک کے متصل بر لبِ شارعِ اعظم واقع ہے۔ میں نے وہاں بھی حاضر ہو کر آستان بوسی کی تو اُس جگہ بھی ایک نئی مسجد پائی۔ پھر کجا کہ رسیدیم آسماں پیداست۔ دریافت ہوا کہ یہاں کبھی ایک مختصر سی مسجد سنگی تین دری ضرور تھی۔ بعض اُس کو اکبری عہد کی یادگار، کم سے کم خسرو باغ اور خلد آباد کی ہم عمر بتاتے تھے۔ لیکن کچھ باخبر ہوشمند چند در چند قرائن و قیاسات اور تواترِ روایات کی بنا پر شاہجہانی قرار دیتے تھے۔ ایک بڑی جماعت اسی طرف تھی۔ اس بارہ میں کہ آیا یہ مسجدِ شاہی انقضائے زمانہ اور گردشِ ایام سے گر گئی تھی یا کسی شورش کے استیصال اور مفسدین کی تنبیہ و عبرت کے لئے ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر نثار کی گئی تھی، اختلافِ اقوال ہے۔ بہر دو صورت کچھ دن یوں ہی گری پڑی رہی۔ حتّٰی کہ ۱۲۸۷ھ[1] (۱۸۷۰ء) میں چند ذی ہمت، با اثر مسلمانوں نے توجہ فرمائی اور اس کو از سرِ نو تعمیر کرا دیا۔ اس کے بعد یعنی تیسری بار کی درستی و تکمیل میں اس کا دالان اور بھی عریض و طویل اور صحن وسیع و فراخ ہو گیا۔ اور اب تو بہر طور یہ ایک کامل و مکمل نئی چیز ہے۔

شاہی مسجد میں داخل ہونے کے لئے سرا کے مشرقی و شمالی کونے سے بھی ایک راستہ تھا۔ اس جانب (پورب کو، جو اب محدود اور بلدیہ کی کسی عمارت سے مسدود سا ہو رہا ہے) مسجد کی پرانی دیوار ہنوز موجود ہے۔ اس میں دو دروازے سنگی چوکھٹ بازو کے نصب، اور اب تک باقی ہیں۔ جو اس کی عظمت و شانِ گزشتہ کی یاد تازہ رکھتے ہیں۔ ایک دروازے میں ہو کر اوپر جانے کے لئے زینہ تھا۔ یہ بدستور قائم ہے۔ مگر آگے چل کر بندروں کی دستبرد و غارتگری یا اور مجبوریوں سے منتظمین نے خود ہی بند کرا دیا ہے۔ نمازیوں کو نئی مسجد تک پہنچانے سے قاصر ہے۔

با ایں ہمہ حرمان و ناکامی، تلاش در پیش رہی، کوشش جاری۔ شوق تدقیق باقی تھا اور عزیمت راسخ و استوار کہ ایک نیک منش آگاہ دل نے زحمت و رفاقت گوارا فرمائی اور مجھے خسرو باغ کے مغربی گوشہ تک پہنچایا جہاں حسبِ اصولِ فن دیوار گول کر دی گئی ہے اور جس کے سامنے سے جنوب کو بڑی شیر شاہی سڑک گزرتی ہے۔ بیرونِ باغ کی چند قدم کی سڑک طے کرنے کے بعد ایک بڑا "تکیہ" مع بہت سی خالی زمین اور متعدد

---

[1] میرا سالِ ولادت یہی عام الفلاح ہے۔

قبروں کے پیشِ نظر تھا۔ باغ کے رُخ ایک بند محراب دار چھوٹی سی دیوار کھڑی ہے۔ بظاہر یہ عدم کا مسافر بھی سامان باندھ چکا اور آخری اجازت کا منتظر ہے۔ اس کی ساخت کسی پرانی قناتی مسجد کے جزو ہونے پر خود گواہ ہے۔ اس کے آگے لمبا چوڑا فرش ہے۔ غریب مسلمانوں کی ایک محترم جماعت بڑے حوصلہ و ہمت سے اس کو آج کل درست کرا رہی ہے۔ میرے رہنما کی چشمِ تصور میں وہاں پوری مسجد موجود تھی محرابیں تھیں۔ طاقِ مسجد تھا نیز مسجد کا پیش دروازہ۔ دروازہ کی پیشانی پر پیل صاحب کا نقل کردہ قطعہ تاریخ بھی ثبت تھا۔ لیکن میری ظاہر بیں آنکھیں اس خیالی نقشہ پر نگاہیں ڈالتیں اور لوٹ آتیں اور اس مسجد کو مسجد حسامی ماننے میں تامل کر رہی تھیں۔ انھوں نے پرانے گورستانوں اور مدفنوں میں ایسی بہت سی شکستہ و ریختہ مسجدیں اور جا بجا دیواریں دیکھی تھیں۔ مزید برآں وہ اس کی چھوٹی چھوٹی اینٹوں اور اور چیزوں کو دیگر بادشاہی عمارات و حمامات وغیرہ کی اینٹوں اور اشیائے تعمیر سے جدا اور مختلف پاتی تھیں۔ میرا ذہن و تجربہ بھی خاموشی و ادب کے ساتھ ان کا ساتھ دے رہا اور اس تصویر و تصور کو واقعی یادگار کرنے سے معذور و معاف رہنا چاہتا تھا۔ ہاں یہ ایک سبق ضرور لے رہا تھا۔

ہے تری تصویر تکمیلِ تصور کی نشاط　　جو فنا کا نقش ہر گردیدۂ عبرت میں ہے

وائے محرومی! کہ ان اطراف کی تباہ ہوئی پرانی مسجدوں میں سے ایک کو بھی قدیم اور بحالہ نہ پایا۔ ہم خیال و مخلص و واقفِ حال احباب کی اعانت و رہنمائی کے باوجود مسجدِ حسامی کا پتہ نہ چلنا تھا، نہ چلا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ البتہ یہ تجربہ و مشاہدہ اکثر جگہ ہوا کہ دو ڈیڑھ سو برس کی مضبوط سی مضبوط سنگین عمارتوں اور عبادت گاہوں کو بھی زمانہ کے جفا کوش اور تباہ کار ہاتھ نے الہ آباد میں برقرار نہیں رہنے دیا ہے۔ کس آسانی سے مٹا دیا ہے ؎ جی بھر آیا عالمِ گورِ غریباں دیکھ کر!

چاہِ خلد آباد

خسرو باغ کی دیوار سے متصل، پچھم طرف، خلد آباد کے بیرونی پھاٹک کے باہر، لب سڑک کلاں، اُسی وقت کا نہایت وسیع و عمیق دس پہل کا مضبوط پختہ کنواں واقع ہے۔ جو اب تک خوب کام دیتا اور باشندگانِ قرب و جوار کو سیراب کر رہا ہے۔ اور امید ہے کہ ابھی ایک مدت دراز تک اور کار آمد رہے گا۔ اس کے وسیع دَور میں اندر کی جانب مَن (دہانہ) سے ڈیڑھ گز نیچے ایک مربع سا پتھر، ہاتھ بھر لمبا اور اس سے کچھ کم چوڑا لگا ہے۔ کنواں اوپر سے نیچے تک موٹی اینٹوں کا بنا ہے اور اُسی جُڑائی میں پتھر پیوست ہے۔ اس پر خوب موٹے موٹے اُبھرے ہوئے نستعلیق حرفوں میں، فن و ہنر کی تمام نزاکتوں اور خوشنمائیوں کے انداز کے ساتھ " باہتمام محمد رضا مصور مرید نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی" تحریر ہے۔ حرف خوب جلی (یا آج کل کی عربی اصطلاح میں "بارز") ہیں، صاف پڑھے جاتے ہیں۔ یہ کتبہ اوپر سے کھڑے ہو کر دیکھنے والے کی آنکھوں کے سامنے نہیں پڑتا ہے بلکہ کنوئیں کے دہانے سے کچھ نیچے اندر کو ہے۔ اس پر کنوئیں کا قطر اور پہنائی مستزاد ہے۔ اس لئے اس کے پڑھنے میں کسی قدر توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

معمول کے خلاف (سہی، مگر کسی قدر وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ) سال تعمیر شروع ہی سے نہیں لکھا گیا تھا۔ مٹنے، مٹائے جانے کے نشان یا خراش پائے نہیں جاتے۔ باریک بین و خردہ نگہ کی مدد سے بھی اطمینان کر چکا ہوں۔ بہت سے اہلِ علم و صاحبِ نظر حضرات نے بھی غور و توجہ سے دیکھا ہے۔ تاہم، اس کتبہ کا نظری نقشہ یا نقل بناتے وقت میرے عزیز سید اختر حسین نے رضا اور مصور کے درمیان، نیچے کو، پندرہ کا ہندسہ پڑھا اور لکھ دیا ہے۔ اگر اُن کا مطالعہ دُرست ہے تو اس کا مقصود صرف "۱۰۱۵ھ" ہو سکتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ باغ کے پھاٹک کی تعمیر (۱۰۱۰ھ) سے پانچ سال بعد اس کنوئیں کی تکمیل ہوئی تھی؟ حالانکہ جہانگیر اس سے سال بھر پہلے الہ آباد سے رخصت ہو چکا تھا۔ اور آگرہ میں سریر شہنشاہی پر رونق افروز تھا[1] اور اس طرح خلد آباد کے پھاٹکوں سے لے کر اس کنوئیں کے بننے تک بیس سال لگے تھے۔

---

[1] جہانگیر کی تخت نشینی کی تاریخ ۲۰ر جمادی الآخر سنہ ۱۰۱۴ھ ہے۔ تحفۃ الکرام، جلد دوم، صفحہ ۱۳۷۔

یہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ آقا رضا اپنی آقائیت ترک کر کے اُس وقت صرف "محمد رضا مصور" رہ گیا تھا۔
عبارت کے گرد خوش سواد اُبھری ہوئی جدول اور پھلواری موجود ہے محراب بھی نفیس و خوبصورت پیالہ دار بنی ہے۔ بادشاہ کا نام اور تکلفاتِ کتابت سب برقرار ہیں۔



اس کتبہ کی اصلی شان مجموعی طور پر اب تک قائم و محفوظ ہے۔ البتہ ساڑھے تین سو برس گزر جانے یا پانی کی بھاپ اور شوریت کے اثر سے نیچے والے حصہ میں بعض لکیریں یا حرف کسی قدر گھس گئے ہیں جہاں پتھر جھڑنے لگا ہے۔ کچھ کچھ مٹنے بھی لگے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ کتبہ کی روز افزوں فرسودگی دیکھ کر آقا رضا کی روح چیخ اُٹھے۔

محو ہونا ہی تجھے ہے اگر اے یادِ وفا ۔۔۔ میری تربت پہ نشانِ سرِ تربت ہونا

جب تک باغ کو واٹر ورکس سے پانی نہیں دیا جاتا تھا، باغ کے کنوؤں کے ساتھ ساتھ وقتِ ضرورت اس کنوئیں پر بھی پور رہٹ چلتا تھا اور اس سے پانی دیا جاتا تھا۔ اس وقت اس پر پلاسٹر باقی نہیں ہے۔ بڑی بڑی اینٹیں، جو چونے کی خوب موٹی موٹی تہوں میں پیوست ہیں، کھل رہی ہیں۔

سرائے خُلد آباد

خلد آباد کی سرا کی نسبت حال کے گزیٹیر والے تحریر فرماتے ہیں کہ "یہ ایک بڑا اور وسیع احاطہ ہے۔ اس کے دونوں طرف بھاری بھاری پھاٹک لگے ہیں۔ پچھم والے پھاٹک پر سنگِ کتابہ نصب ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعمیر جہانگیر کے حکم سے ہوئی تھی۔"[۱]

مسٹر اسٹیل اور اُن کے ہم قلم معاونین نے گزیٹیر سابق میں لکھا ہے "سرائے خلد آباد خسرو باغ کے متصل، جانبِ جنوب، ایک بڑا احاطہ دار بازار ہے۔ سرا کے پھاٹک پر یہ قطعۂ فارسی لگا تھا جو خسرو باغ کے اصلی پھاٹک کے مقابل تھا۔

بفرمانِ شہنشاہِ جہانگیر ؒ ؒ — کہ زیبد ملکش از مہ تا بہ ماہی
بنا شد ایں سرائے آسماں قدر — کہ باد آباد خلد آبادِ شاہی[۲]

ڈاکٹر فوہرر اپنی کتاب یادگارہائے قدیمہ میں لکھتے ہیں کہ "سرائے خلد آباد ۹۹۷ھ میں تعمیر ہوئی تھی۔"[۳] معلوم نہیں کہ ان کی سندِ تحریر کیا ہے؟

سرا اور خلد آباد کے پھاٹکوں کا احوال، گزشتہ و حال، پوری تفصیل کے ساتھ آغازِ کتاب میں (صفحات ۵۴ و ۵۵ پر) لکھ چکا ہوں۔ اس موقع پر اتنا اور بتا دینا ضروری ہے کہ سرا کی کوٹھریوں کی وضعِ تعمیر، خلد آباد یعنی باغ کے پھاٹک کے دونوں جانب والی کوٹھریوں سے مختلف اور الگ ہے۔ ان کے دروازوں کی محرابیں بھی جُدا جُدا طرز کی ہیں۔ سرا کا اصلی دروازہ تو باقی نہیں جس کا مرثیہ شروع میں (صفحات ۵۲ و ۵۳ و ۵۴ پر) پڑھ چکا ہوں۔ اُس کے موقع پر عمارات و شاندار دُکانات بن گئی ہیں۔

جنوبی دروازہ موجود ہے۔ وہ اُسی طول و عرض، بلندی و استواری کا ہے جیسا معمولاً قلعوں اور شہر پناہوں میں "کھڑکی" کا ہوتا ہے۔ یہاں کھڑے ہو کر دیکھنے سے باغ کا پھاٹک بالکل سامنے نظر آتا ہے۔ سرا کا صحن

۱۔ جدید، مطبوعہ ۱۹۱۱ء، صفحہ ۲۰۲۔ ۲۔ مطبوعہ ۱۸۸۴ء، صفحہ ۱۶۶۔ ۳۔ مطبوعہ ۱۸۹۱ء، صفحہ ۱۳۰۔

اب بھی لق و دق بسیط و عریض ہے۔ بادشاہی سڑک اپنے دونوں طرف کی زمین سے برابر بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ تاہم باغ کے پھاٹک یا سڑک پر سے دیکھنے سے سرا کی کوٹھریوں کے اندر تک کا سامنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اس کھڑکی یا چھوٹے دروازہ سے باغ کا سارا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

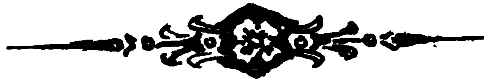
اس دروازے کے دونوں کواڑ، پرانے، اب بھی باقی ہیں؛ مگر اس حال میں کہ ایک بجائے خود کھڑا ہے، دوسرا ایک جانب یعنی بغل کو پڑا ہے۔ چوکھٹ بازو ادھر اُدھر کی دیواروں سے الگ ہو رہی ہے، باہمی تفرقہ یا فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔

سرا کا کنواں بھی خوب وسیع اور مناسبِ حال و ضرورت ہے۔ مگر اتنا نہیں جتنا خلد آباد کا پھاٹک والا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے اندر بھی پتھر لگا تھا جو کہیں نیچے کو پانی کے قریب تھا۔ تصدیق کون کرسکتا ہے! نہ سطحِ آب تک رسائی ہو سکتی ہے، نہ نگاہ پہنچ سکتی ہے۔ قلم، دوات میں غوطے کھاتا یا لگاتا ہے مگر بوڑھا قلم کش قعرِ چاہ میں غوطہ بازی کی ہمت و جرأت نہیں رکھتا۔ کیا یہ حقیقت ہے، یا مہربان بتانے والوں نے ستم ظریفی سے کام لیا ہے؟

صحنِ سرا میں گرمیِ بازار کے لئے ٹین کے سایبان جا بجا رونق افروز نظر آتے ہیں۔ سفالہ پوش اور مُسقّف و مُکلّف دُوکانات بھی ہیں۔

اس وسیع مربع کے گرداگرد کی باہر والی قدیم سڑک بدستور رواں ہے۔

سرا کی مسجد نہ تو شاہی ہے، نہ شاہی وقتوں کی ہے۔ سوا سو برس پرانی بتائی جاتی ہے۔ کسی عالی ہمت بھٹیارے نے خوش سلیقگی و حُسنِ اہتمام سے تعمیر کرائی تھی۔ یہ صحن کے غربی نصف کے وسط میں مختصر و سبک تین در کی خشتی بنی ہے۔ آباد و درست حالت میں ہے۔ ایک مدت کی استر کاری اور سال بہ سال کی قلعی اور تہ بر تہ سفیدی کے باوجود اس عجوز پیر زال کے حسن و جمال کے نقش و نگار برقرار اور خط و خال ہنوز نمودار ہیں۔



باؤلی

خَیْرُ النَّاسِ اَفْضَلُ الْاَشْغَالِ۔ خدا کی رحمت ہو اُن حق شناس، حق گزار، حق پرست عالی ہمت بنوانے والوں پر جنھوں نے اپنی آسایش و تفریح کے لئے نہیں، بلکہ مخلوقِ خدا کی راحت و آرام اور سیرابی کے واسطے، فصیلِ باغ کے باہر یہ باؤلی بنوائی تھی، تاکہ لوگوں کی آمد و رفت میں روک ٹوک نہ ہو اور شاہی موکبُ و کوکبۂ جاہ و جلال عوام الناس کی رسائی اور بے تکلف و تردد فائدہ اٹھانے اور آرام پانے میں مخل و مانع نہ آئے۔

یہ باؤلی باغ کے شہری پھاٹک کے جنوب و شرق، دیوار سے باہر یعنی احاطۂ باغ سے خارج مگر اُسکی جنوبی دیوار کے ملحق، خلد آباد کے شرقی پھاٹک کے قریب واقع تھی۔ باغ سے اس کو ہمسایگی کا حق اور قرب کا گہرا علاقہ حاصل تھا۔ اس کی عمارت بہت لمبی چوڑی دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ حفاظت کے لئے اس کے گرد دیوار تھی۔ اندر جانے کا راستہ باؤلی کے پورب سڑک کے رُخ تھا۔ دروازہ خوش قطع، خوشنما اور خاصا چوڑا اور اونچا تھا۔

میں نے اس کو نہیں دیکھا۔ ۱۸۸۶ء کی یاد نہیں۔ ۱۹۱۸ء میں جب الہ آباد آیا اور خسرو باغ کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ باؤلی پچیس چھبیس برس ہوئے پاٹ دی گئی۔ الزام یہ تھا کہ یہاں کبھی کبھی کسی انسان یا کُتّے کی جان جاتی رہتی تھی یا کوئی شامت زدہ ڈوب مرتا تھا۔ متمدن ممالک اور نیم وحشی اقوام سب کے یہاں اتلافِ جان کی پاداش خود مجرم کا معدوم کر دیا جانا ہے۔ چنانچہ اس بلائے جان، ناقضِ امن و امان کے لئے تعزیری قوانین کی سب سے بڑی سزا صادر کر دی گئی۔ کم سمجھ نا حقیقت شناس کہتا ہے کہ اہلِ حل و عقد کو وحشت و بربریتِ قدیمانہ کا یہ مظاہرہ پسند نہیں آیا تھا۔ ورنہ کیا ممکن نہ تھا کہ ڈلو و رسن کی جگہ جولان و زنجیر سے کام لے لیا جاتا اور روک کے لئے کنوئیں کے مُنہ اور منافذ و مخارج پر چوکھٹے اور جنگلے لگا دیئے جاتے۔ وہ کثیر صرف جو اس کے پاٹنے میں کیا گیا یقیناً اس سے بہت کم میں آیندہ کا تحفظ اور سدِ باب ہو سکتا تھا۔

دامنِ یار! خدا ڈھانپ لے پردہ تیرا   تیری رُسوائی کے خونِ شہدا در پے ہے

عرصۂ عالم کا سب سے پُرانا مشہور کنواں جس کی ظاہری عمر بھی ساڑھے چھ ہزار برس سے کم تجویز نہیں کی جاتی ہے[1]، اور جس کی پاکی و بزرگی اُنہتر کرور انسان (مسلمان) اپنے لیے حین حیات نیز بعدِ ممات، وجہِ برکت و شرف و تقدیس سمجھتے ہیں، یعنی "زمزم" بھی مسلمانوں کے دستِ اقتدار میں آنے سے پیشتر اس قسم کے واقعات یا حادثات کا باعث ہو جاتا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ صدرِ اسلام میں بعہدِ حضرتِ عبداللہ بن زبیر ایک حبشی اس میں گرا اور مر گیا تھا[2]۔ یہ تیرہ سو برس کی پُرانی بات ہے۔ مگر اُسی وقت سے ایسا انتظام حفاظتِ جان و انسداد کا کر دیا گیا کہ ہر سال کے آنے جانے والے پانچ چھ لاکھ زائر و حاجی، جن میں بھانت بھانت کے انسان اور مختلف اقلیموں، تمدن و تربیت اور کم و بیش سن و سال اور ہوش و حواس کے آدمی ہوتے ہیں اس سے بفراغت و اطمینانِ تمام ہر وقت فیضیاب و سیراب ہوتے رہتے ہیں۔ وہ دو ڈیڑھ لاکھ مستقل باشندگانِ شہرِ مکہ، ان کے علاوہ ہیں جن کی زندگی و معیشت کا مدار اسی متبرک پانی پر ہے۔ انہ طعام طعم و شفاء سقم۔

اس باؤلی کا صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جانا کچھ زیادہ دن کی بات نہیں۔ اس کے دیکھنے اور درد کے ساتھ یاد رکھنے والے اب بھی ہزاروں زندہ و باقی ہیں۔

سنو افسانۂ جم، جام رکھ کر سامنے آنکھے   ابھی دو چار ہیں جم کا زمانہ دیکھنے والے

یہ باؤلی ۴۰۔۴۵ برس ہوئے بند کرا دی گئی۔ اس کی تمام وسیع و نفیس عمارت پر جو اُس وقت تک قائم تھی خاک ڈال دی گئی۔ اس کی پاتال توڑ گہرائی (قعر) لوہاروں کے کھنجر اور پزاووں کی ٹوٹی پھوٹی اینٹوں اور روڑوں سے بھر دی گئی۔ ہزاروں من مٹی اور بالو جو واٹر ورک کے تالابوں کی کھدائی سے نکلی تھی باؤلی کے اندر سما گئی۔ پانی کے سوت سے لے کر اوپر کے ستونوں تک بھر دی گئی۔ یوں کہئے کہ اس کی آرام گاہیں، اس کی بھول بھلیاں، اس کے پوشاک بدلنے کے کمرے، اس کے سرد خانے

---

[1] بیل کی بیاگرفی کل ڈکشنری، ذکر عبدالمطلب، صفحہ ۷۔ [2] تاریخ عمارۃ المسجد الحرام، مطبوعہ جدہ شریفہ ۱۳۵۴ھ، صفحہ ۱۶۲۔

سب کے سب مسلم و زندہ دفن کر دئے گئے۔ اسی پر قناعت نہیں ہوئی بلکہ اس کے قریب والے، باغ کے حصّہ زمین کو اچھا خاصا ٹیلا یا ٹیکرا بنا دیا گیا۔ کافی ہوتا کہ باؤلی کے دہانے پر دروازہ یا کٹہرا لگا کر زینے اوپر سے محفوظ کر دیئے جاتے۔ یا شہتیر و تختے رکھ کر بالائی حصّہ مٹّی سے پاٹ دیا جاتا یا کسی اور معقول و کارگر طریقہ پر آمد و رفت و داخل خارج انسانی کا راستہ مسدود کر دیا جاتا۔ لیکن اس سے یہ اندیشہ قائم رہتا تھا کہ کہیں پھر کسی وقت اس فرمانِ قضا جریان پر نظرِ ثانی ہو تو یہ باؤلی کھلوا دی جائے۔ اس لئے اس کو انتہائی حد تک معدوم کر دیا جانا لازم ہوا۔ آئندہ نہ اتنے عظیم صرفہ کی فراہمی ہو سکے گی نہ اس کی مٹّی نکالنے اور صفائی کی نوبت آئے گی۔ مزید برآں اس مقام یا اس کے قرب و جوار کی زمین پر قبضہ پانے والوں اور مکان بنوانے والوں کے دعووں پر ہرجہ و معاوضہ کی ناقابلِ برداشت رقم ادا کرنے پر سرکار یا بلدیہ کب تیار ہوگی۔

باؤلی تین درجہ یا منزل کی تھی۔ ہر طبقہ میں محراب دار دروازے بلا کواڑ کے تھے۔ دروازوں کے نچلے حصّے میں دو دو فٹ اونچی مُنڈیریں (مینڈیں) اُٹھا دی گئی تھیں، تاکہ پھسلنے اور گر جانے کی روک رہے۔ دروازہ سے داخل ہونے اور کچھ ہی نیچے اُترنے کے بعد عمارات کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ شمال و جنوب دونوں جانب سیڑھیاں، پندرہ پندرہ سولہ سولہ ہاتھ کے قریب لمبی اور ہاتھ سوا ہاتھ چوڑی تھیں۔ مزید آسائش اور نشستِ بافراغت کے لئے ہر دس بارہ سیڑھیوں کے بعد ایک ایک سیڑھی کئی کئی ہاتھ چوڑی چھوڑی گئی تھی۔ یہ سیڑھیاں نہایت پست تھیں، اور ایک بچّہ بھی آسانی سے اُتر سکتا تھا۔ کوئی سیڑھی پانچ چھ انگل سے زیادہ اونچی نہ ہوگی۔ اطمینان و احتیاطِ مفرط یا سہولت کے لئے موٹی موٹی مضبوط زنجیریں دیواروں کے ساتھ ساتھ، پکڑ کر چڑھنے اُترنے کے لئے آویزاں تھیں۔ سطحِ آب پر ڈوبنے سے بچاؤ کے واسطے، متقاطع (ٹیڑھی بیڑھی) زنجیریں الگ ڈالی گئی تھیں۔ بجز کہن سالی ہو جانے کے اس باؤلی میں کوئی خرابی یا کمزوری پیدا نہیں ہوئی تھی۔ پیٹر منڈی صاحب کی ۱۶۳۲ء کی بیان کردہ خوبیاں اور تفصیلات (مندرجہ صفحہ ۸۰، کتاب ہٰذا) برقرار و قائم تھیں۔ باؤلی کے آس پاس اُس وقت تک املی، سرس اور نیب کے سایہ دار و تناور پُرانے پُرانے درخت اور آم نارنگی اور چکوترے کے پھل دار پیڑ بھی موجود تھے۔ پٹریوں پر دورویہ بازار لگتا تھا۔ تیوہاروں کے زمانے اور میلے ٹھیلے کے دنوں میں یہاں رونق اور چہل پہل بہت رہتی تھی۔ لوگ اندر

جمع ہوتے، کھاتے پیتے اور ہر طرح کا لُطف اُٹھاتے تھے۔ بُھول بُھلیوں میں کھیلتے، پھنستے اور ہنستے ہنساتے تھے۔ مشہور روایت یہ ہے کہ اس باؤلی سے پورے شہر الٰہ آباد کو پانی ملتا تھا۔ سرکارِ دولت مدار نے ۱۸۸۰ء میں اس کی صفائی کرائی۔ کنوئیں کے سوتوں سے بہت زیادہ پانی اوپر آگیا۔ ایک بانس کے قریب جب نکال دیا گیا تو بہت موٹے موٹے کڑے مع زبردست زنجیروں کے ہر پہل میں الگ الگ نظر آئے۔ معلوم ہوا سیکڑوں مَن کا آہنی توا جو تعمیر کے وقت اس میں ڈالا گیا تھا، بحالہٖ موجود و محفوظ بلکہ سب کا محافظ باقی ہے۔ تاہم پانی کی طغیانی اور زور کا روکنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ نیچے کا حال کون جان سکتا ہے۔ توے سے اوپر اوپر ہی بیس بائیس ہاتھ پانی چڑھ آیا تھا۔ صفائی کا کام توے تک نہیں پہنچ سکتا تھا، روک دینا پڑا۔ بھاری پتھر تھا، چوم کر چھوڑ دیا۔

اندر جانے کے زینے کے نشانات مٹی میں دبے ہوئے اب بھی اپنی ہستی کا ثبوت دے رہے ہیں اس کی جگت بھی بالکل درست کُھلی ہوئی ہے۔ دہانہ مٹی سے بھرا ہوا ہشت پہل صاف نظر آتا ہے۔ اسی مناسبت سے اندر کو ایک کمرہ بھی ہشت پہل رکھا گیا تھا۔ گولائی بیس اکیس فٹ کے قریب ہوگی۔ ۱۸۹۱ء میں واٹر ورکس کا آغاز ہوا[۱] میونسپل بورڈ نے "بالو گودام" یعنی تالابوں کی مٹی اور ریت وغیرہ کے لئے پختہ اینٹوں کا احاطہ بنوایا، جو خسرو باغ کی پرانی سنگین دیوار کے ادھر بازار کی طرف دُور تک چلا جاتا ہے۔ باؤلی کے دروازے پر ایک کچی دیوار عارضی اُٹھائی گئی۔ بارش کے پانی ریلے اور سَیل سے وہ ٹھہر نہ سکی۔ اپنی کچی اینٹوں، بالو اور ہر چیز کو ساتھ لے کر اندر چلی گئی۔ حُکّام کھڑے کھڑے دیکھتے تھے اور اپنی ہنگامی معذوری کو خاموشی اور ایک ادائے بے نیازی سے چھپاتے تھے۔ اس کے بعد وُہی قصّہ، وُہی حیلہ و حوالہ اور عذر و شکوہ تھا۔ کُتّے آتے ہیں، جانور گرتے ہیں۔ لوگ پاخانہ پھرتے ہیں۔ انسان مرتے ہیں۔ اس لئے اِس کا بند ہو جانا ہی مناسب ہے۔ باؤلی زبانِ حال سے فریاد ہی کرتی ہی کہ

مجھے یوں نہ خاک میں تو ملا، میں اگرچہ ہوں ترا نقشِ پا　　ترے جلوے جلوے کی ہے بقا مرے حق نام بنام سے

مگر میونسپلٹی نے ۱۸۹۴ء میں بھروادی۔

---

[۱] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، ۱۹۱۱ء صفحہ ۲۱۴۔

کہا جاتا ہے کہ باؤلی کا کھلوا دیا جانا کچھ مشکل نہیں۔ بورڈ نے چھ سات سال ہوئے لوگوں کی خواہش اور زاہر نالی پر فیصلہ کیا تھا کہ کھلوا دی جائے۔ اور واٹر ورکس کے لئے نئے چاہات بنانے کی بجائے پانی اسی سے لیا جائے۔ چنانچہ صفائی کا ٹھیکہ بھی چھ ہزار روپیہ میں طے ہو گیا تھا۔ مگر مزید کارروائی یا نتیجۂ عمل سے پبلک کو ہنوز آگاہی نصیب نہیں ہوئی۔ شاید وہی دشواریاں مانع آئی ہوں جن کا اندیشہ پیشتر ظاہر کیا جا چکا ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ صرف پندرہ روپیہ سالانہ پر یہ زمین سٹی بورڈ نے سال بہ سال کے پٹہ پر دے رکھی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کے فلسفہ تاریخ کے مطابق باؤلی نے اپنے سے متصل واٹر ورکس کا چولا بدلا ہے اور عمل ارتقا کے بموجب باؤلی کا پانی جو تحت الثریٰ یا زیر زمیں رواں تھا، آسمان سے باتیں کرنے والے تالابوں کی بلندی پر پہنچ گیا ہے۔ لیکن دیدۂ ظاہر بین سے یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں کہ اس اجڑی ہوئی، اداس بزم کا رنگ واٹر ورکس کا کارخانہ ذرا بھی نہ جما سکا۔ محفلِ عبرت و حسرت کی حشر سامانیاں ہر سو نمایاں ہیں۔ بحالتِ موجودہ خسرو باغ اور اس کے مضافات میں سب سے بے کار، ناہموار و وحشت خیز مقام یہی باؤلی کے پڑوس والا ڈھیر ہے۔ اس کو بے ترتیب جھاڑیوں اور خودرو جنگلی پیڑوں نے گھیر رکھا ہے۔ اچھا ہوا کہ واٹر ورکس کے حوضوں کے قریب ہونے سے ادھر کی آمد و رفت روک دی گئی اور حفاظت کے لئے پہرہ رہنے لگا تھا۔ اور اب لوہے کے ستونوں اور کانٹے دار تاروں سے مستقل طور پر محصور کر دیتے سے اس طرف کا آنا جانا ہی قطعاً ممنوع و مسدود بغیر دشوار ہو گیا ہے۔ یاد رہے

اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے ؎ ناز اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے

اس ٹریجڈی یا وارداتِ ہوش رُبا، روح فرسا کا نہایت گہرا اثر اہلِ شہر پر اب تک باقی ہے۔ کوئی انسان خواہ کسی فرقۂ، ملت یا طبقۂ و جماعت کا ہو، جس نے اس باؤلی کو دیکھا ہو، اس میں نہانے اور تیرنے کا مزہ پایا ہو، یہاں کی گلبازیوں میں مصروف رہا ہو، یا وہ جو اس کے لطفِ نظر اور سیر و فرحت

سے محروم رہا ہو، ہر پوچھنے والے کو اپنا چوٹ کھایا ہوا دل دکھا دیتا ہے۔ اور بھری ہوئی آواز سے اس کا مرثیہ سُنانے اور ماتم کرنے لگتا ہے۔ بشری فطرت کا اقتضا تھا جس نے مجھے بھی نہایت متاثر کیا۔ تاہم ایک واقعہ نویس کی حیثیت سے میں نے اپنے حدود سے تجاوز نہیں کیا نہ اپنے جذبات کو قابو سے باہر ہونے دیا ہے۔

جانِ وفا شعار کو شکوۂ غم سے کیا غرض   عذرِ جفا سے کام کیا، عرضِ کرم سے کیا غرض

اس تیرہِ خاک یار و پوش باؤلی کے سلسلہ میں ایک دوسری باؤلی یاد آگئی۔ جو اسی عہد یا متقارب زمانہ کی یادگار ہے اور موضع برہم باد (ابراہیم آباد، مضافات بیانہ، علاقہ بھرت پور) میں فتح پور سیکری کی سڑک پر ایک عالیشان مسجد سے تھوڑے فاصلہ پر واقع ہے[1]۔ اس کو مع اس کے وسیع باغ کے سنہ سات جلوس جہانگیری یعنی ۱۰۲۲ھ (۱۶۱۳ء) میں اُس نامور و عالی نژاد راجپوت شاہزادی نے تعمیر کرایا تھا جس کو ایک بڑے شاہنشاہ (اکبرِ اعظم) کی ملکہ اور ایک جلیل القدر فرمانروا (جہانگیر) کی ماں ہونے کا فخر حاصل ہے اور جس کو تاریخ راجہ بہاری مل کچھواہہ والی امبیر کی بیٹی[2] اور مریم زمانی کے لقب[3] سے یاد کرتی ہے۔

[1] رسالہ مخزن لاہور، نمبر ۶ جلد ۱۲، بابتہ مارچ ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۲، نیز۔ تزک جہانگیری (ترجمہ انگریزی از بیوریج) حصہ دوم صفحہ ۶۴ مع نوٹ مفصل) [2] مآثر الامرا، جلد دوم، صفحات ۱۱۱ الغایتہ ۱۱۳۔ [3] اصلی نام معلوم نہیں۔ مولوی سعید احمد مارہروی اپنے سیاحت نامہ میں مریم الزمانی لکھتے ہیں لیکن قطعہ کو نقل کرتے وقت سہواً مریم مکانی قلم سے نکل گیا ہے۔ صفحہ ۲۲۔ مریم مکانی۔ حمیدہ بانو، حاجی بیگم مادرِ اکبر نے بعد وفات یہ لقب پایا تھا۔ بیل صاحب کی اورینٹل ڈکشنری صفحہ ۲۷۱ اور ڈاکٹر فوہرر کی آرکیالوجی کل سروے آف انڈیا، جلد دوم، صفحات ۱، و ۲، بھی ملاحظہ ہوں۔ اکبر کے عہد میں ایسے لقب یا خطاب زیادہ رائج تھے۔ اُس کی پہلی ملکہ رقیہ بیگم "خدیجۃ الزمانی" تھی۔ حکیم ابوالفتح "علامۃ الزمانی" اور حکیم علی گیلانی "جالینوس الزمانی" بنائے گئے تھے۔

وقار انبالوی سلطانۂ مریم زمانی کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں۔ اور وہ حقیقتاً اس ستایش کی مستحق ہے۔

ترے انوار سے تاریخ کے صفحات روشن ہیں   ترے جلووں سے مریمِ ہند کے دن رات روشن ہیں

تری خوشِ طالعی پر فخر کرتی ہے جہانداری   عروسِ آسماں کو یاد ہے تیری طرحداری

تری رنگینیوں سے فصلِ گُل ہے مالا مال اب تک   تری رعنائیوں سے گلشنِ فطرت ہے نہال ابتک

اس باؤلی کا نہایت بلند و شاندار سہ منزلہ دروازہ اور فراخ نشست گاہیں پورب کی طرف واقع ہیں۔ اس پر نہایت خوش خط نستعلیق حرفوں میں یہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے۔

بعہدِ شاہِ نورالدیں جہانگیر — جہاں شد گلشن از مہ تا بماہی
بحکمِ مادرش مریم زمانی — کزو تابندہ شد نورِ الٰہی
مرتب گشت باغ و بائی دلکش — ز شرمش خلد را شد چہرہ کاہی
خرد گفت از پئے تاریخ ہجری — سنہ ہفتِ جلوسِ بادشاہی

یہ قطعۂ تاریخ یا کتابہ ہم کو بے اختیار اپنے خلد آباد (الہ آباد) کے پھاٹک والے قطعہ[1] کی یاد دلاتا ہے جو اسی بحر میں ہے۔ جس کا وزن، جس کا قافیہ، حتیٰ کہ بیشتر الفاظ بھی وہی ہیں۔ قیاس غالب ہے کہ ان دونوں قطعوں کا ناظم ایک ہی تھا، یا اگر دونوں ایک ہی شخص نہ ہوں تو بھی اس میں شک نہیں کہ اس دوسرے تاریخ گو نے اپنے الہ آبادی پیشرو کا نہایت کامیاب، حیرت انگیز و قابل قدر تتبع کیا ہے۔



تری توصیف میں ابتک ہوائیں گیت گاتی ہیں — ترے انوار سے ابتک فضائیں جگمگاتی ہیں
تری رنگیں نوائی سے ہے موسیقی میں جوش ابتک — ترے جاں بخش نغموں کا اثر فردوسِ گوش ابتک
نزاکت آج تک کھاتی ہے تیرے نام پر قسمیں — لطافت اب بھی ہے گویا تری توقیر کے بس میں
تری تصویر سے جاری ہے سیلِ رنگ و نور اب بھی — ترے دیدار سے آتا ہے ہر دل کو سرور اب بھی

(صفحۂ ہٰذا) [1] قطعۂ تاریخ یہ ہے۔ بفرمانِ شہنشاہِ جہانگیر — کہ زیبد ملکش از مہ تا بماہی
بنا شد ایں سرائے آسماں قدر — [کہ باد آباد خلد آبادِ شاہی]

(منقول از صفحہ ۱۵ کتاب ہذا)۔ لیکن ڈسٹرکٹ گزیٹیر ۱۸۸۴ء کے صفحات ۱۹۶ و ۲۰۲ پر لکھا ہے کہ خلد آباد کی سرا کے پھاٹک پر جو خسرو باغ کے اصلی پھاٹک کے بالکل مقابل تھا یہ پورا قطعہ لکھا ہوا تھا۔ (صفحہ ۲۰۲ تاریخ ہذا)۔

مقبرۂ زینت النسا بیگم

اسی کتاب میں (صفحہ ۶۲ پر) ڈاکٹر فوہرر کا یہ قول نقل کر چکا ہوں کہ الہ آباد میں عہدِ مسلمانان کی یادگاریں کم ہیں اور جو ہیں وہ بھی کوئی بڑی دلچسپی کی چیز نہیں[1]۔ میرا تجربہ اور مشاہدہ اس سے مختلف ہے۔ موصوف کی نظر بہت وسیع و بلند تھی اور معیارِ پسند بلند تر۔ وہ عمارات کی جستجو، دستیابی اور بالآخر انتخاب کے وقت خاص خاص اوصاف، تکلفاتِ تعمیر، وسعتِ عمارت اور سب سے زیادہ شہرت وشان و عظمت پر نگاہ رکھتے تھے۔ ہر ایک چیز اُن کی آنکھ میں کیسے کھُب سکتی تھی۔ تاہم عرض کروں گا۔

حریفِ کاوشِ مژگانِ خونریزش نۂ ناصح　　بدست آور رگِ جانے و نشتر را تماشا کن

اس گئی گزری حالت میں بھی شہر اور اطرافِ شہر میں قابلِ دید و لائقِ ذکر صنادیدِ کُہن کی کمی نہیں۔ الہ آباد کے آباد ہونے سے نام کے شاہ عالم کے قیام، یا انگریزوں کے قبضہ کرنے تک، یعنی تقریباً دو سو برس سلطنتِ تیموری اور دولتِ اسلامی کا یہاں دَور دَورہ رہا ہے۔ بے شبہ مسلمانوں نے اپنے اتنے دنوں کی زندگی کی بہت سی یادگاریں یہاں چھوڑی تھیں۔ شہر کے ایک کنارے سے دوسرے تک کوئی دیکھتا ہوا گزر جائے تو اُس کو عہدِ ماضی کے بیسوں تبرکات ہر سمت جا بجا ملیں گے۔

چپہ چپہ پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک　　دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

البتہ ماننا پڑے گا کہ حکومتوں کے تبادلے اور فنا کردار روزگار کی گردشوں نے بہت سے قدیم آثار کو درہم و برہم کر دیا یا نیم ویران بنا رکھا ہے۔

میرے علم میں خسرو باغ کے پھاٹک[2] کے بعد، مسلمانوں کی سب سے پُرانی تعمیر رہ گئی

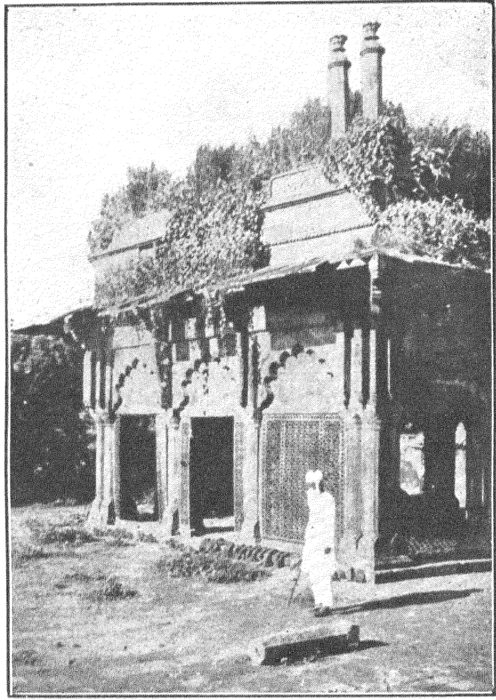
---

[1] صنادید قدیمہ اور کتبے، ۱۸۹۱ء، صفحہ ۱۳۰۔ [2] صفحات ۵۵ لغایتہ ۵۷۔ کتاب ہذا۔

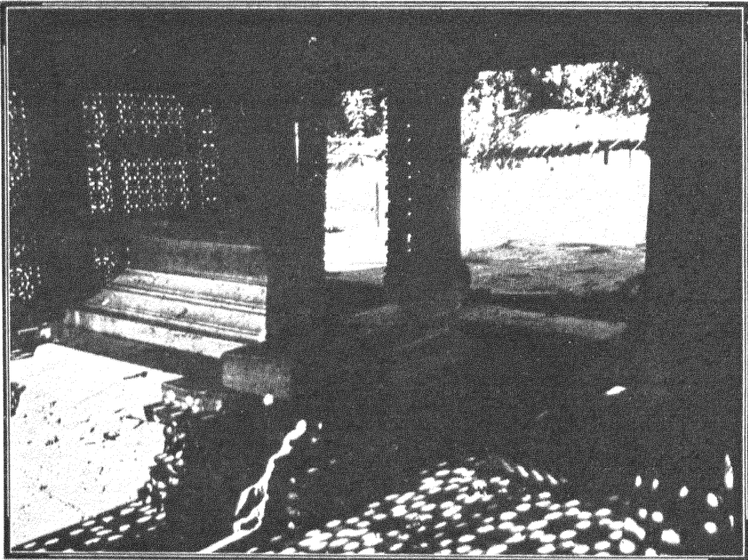
تاریخ الہ آباد

مقبرۂ زینت النسا بیگم

(۹) باہر سے
(۱۰) اندر قبر - جالیاں



مقبول صمدنی



محمد قلی کو اس سے انکار تھا۔ محمد قلی الہ آباد میں صوبہ دار رہا تھا[۱]۔ اسکی کثیر الملاک یہاں تھیں۔ سید کمال الدین حیدر طبا طبائی نے اس کو محمد قلی خانِ شہید لکھا ہے[۲]۔

زینت النساء نے ۱۱۷۴ھ (۱۷۶۱ء) میں انتقال کیا۔ اسی شہر میں دفن ہوئی[۳]۔ اسی خلفشار اور پس ماندگاں کی دار و گیر اور انتشار و ناداری کے باوجود اس کا نہایت خوبصورت مقبرہ ایک خاص طرز و شان سے تیار کیا گیا۔ احاطہ بہت وسیع تھا۔ گرداگرد پتھر کی دیوار تھی۔ دیوار کے پتھروں پر، ادھر اُدھر، نیز خاص عمارت (؟) میں عربی و فارسی کے بہت سے قطعاتِ تاریخ منقوش تھے۔ حسب روایت مسٹر بیل یہاں تین تربتیں (قبریں) تھیں۔ دو پر تاریخ کندہ تھی۔ تیسری سادہ و صاف تھی۔ کچھ لکھا نہیں تھا۔ خود بیگم کا قطعۂ تاریخ یہ تھا۔

چو زینت نسا رفت از دارِ فانی — بفردوس جائے سکونت گرفتہ
بجستیم تاریخ سالِ وفاتش — خرد گفت جائے بہ جنت گرفتہ ۱۱۷۴ھ

دوسرے مزار (یا قبر) پر۔

ہزار و یک صد و با پنج و ہفتاد — برفت مریم سوئے فردوس دلشاد ۱۱۷۵ھ

فارسی کے اشعار بہ تعدادِ کثیر مع متعدد مادّہائے تاریخ کے دیواروں پر باہر کی جانب کندہ تھے۔ سو برس پہلے تک یہ شعر اور مختلف کتبے موجود و مرقوم تھے۔ افسوس ہے کہ بیل صاحب نے سب کو نقل نہیں فرمایا۔ ذیل کی سات بیتیں لکھ کر باقی چھوڑ دی تھیں۔ جن کا آج نہ نشان ہے نہ کہیں یادداشت۔

جبرئیلش ز سرِ صدق و صفا رہبر شد — تا کہ داخل بسرا پردۂ پیغمبر شد
رفت با فاطمۂ بنتِ رسولِ مدنی — گشت ہم صحبتِ او رست ز دنیائے دنی
روحِ پاکاں ہمہ با طائفۂ حورالعیں — گشتہ از صدق و صفا خضرِ رہِ خلدِ بریں
منزلش خلدِ بریں کرد خداوندِ جلیل — خبرم داد ز تاریخِ وفاتش جبریل

---

[۱] ڈکشنری، صفحہ ۲۰۲۔ [۲] سوانحِ سلاطین، صفحہ ۱۵۔ [۳] مفتاح، صفحہ ۵۱۸۔

کز سرِ شعر بکن نقشِ سرِ لوح[30] مزار | ولد غلی جنتی از سورۂ والفجر بیار ۳۰+۱۱۴۴=۱۱۷۴ھ
اندریں ظلمتِ شب خالقِ ستارِ مجید | بضیافت برِ خود زینت نسارالطبید
بہزار و صد و ہفتاد و چہارِ ہجرت | رفت از عالمِ فانی بریاضِ جنّت ۱۱۷۴ھ

وہ لکھتے ہیں کہ سرِلوح یعنی لام کے عدد تیس ولد غلی جنتی کے ساتھ جوڑ دئے جائیں تو تاریخِ وفات نکل آئے گی۔ مگر نہ تو (تلمیذ الرحمٰن) حضرتِ شاعر نے اور نہ بیل صاحب نے لحاظ فرمایا کہ قرآن میں وادخلی جنتی[1] وارد ہوا ہے۔ ولد غلی نہیں[2]۔ صحیح الفاظ کے اعداد صرف ۱۱۱۴ نکلتے ہیں نہ کہ ۱۱۴۴۔

یہ قبر یا خاکِ فراموشاں، سنگِ سرخ کی شاندار بارہ دری کے اندر موجود ہے، جو گز سوا گز اونچے اور اٹھائیس اٹھائیس گز لمبے چوڑے سنگین چبوترہ پر بنائی گئی تھی۔ چبوترہ سے اس کا فرش تو انچہ اونچا ہوگا۔ اس خوبصورت چھتری نما عمارت کا ہر ضلع نو نو گز ہے۔ ہر ضلع میں تین تین در ہیں۔ جو نہایت نازک نظر فریب پتھر کی جالیوں سے بند تھے۔ صرف ایک شمال طرف کو بیچ والا آمد و رفت کے لئے کھلا رکھا گیا تھا۔ پتھر کے دوہرے دوہرے (آگے پیچھے) بھاری بھاری مضبوط بارہ پہل کے کھمبوں پر یہ عمارت قائم ہے۔ ان پایوں کی تابیں بھی اسی مناسبت سے موٹی موٹی زبردست ہیں۔ پُرتکلف و منقش بھی۔ پیالہ دار محرابیں اُس زمانہ کی رائج وضع کے مطابق ہیں، جو آج بھی ویسی ہی اچھی اور پسندیدہ سمجھی جاتی ہیں۔ بوچھار اور دھوپ سے بچانے کے لئے خوب دور تک نکلا ہوا مضبوط مگر سبک چھجا چاروں طرف گھیرے تھا۔ چھت کے پاٹنے میں خاصا تکلف و اہتمام ہوا تھا۔ یعنی ہر چہار جانب سے ستونوں اور محرابوں پر پتھر کے مُقوّس و مُحدّب تختے رکھ کر اس حصۂ بالائی کو اندر سے مربع و مسطح بنا لیا اور اوپر سے چونے اور گچ سے بند کر دیا تھا۔ اس سے گنبد یا بُرج کی ایسی گولائی اور پوری اونچائی تو پیدا نہیں ہونے پائی تھی۔ تاہم مسقّف و مشیّد ہو کر مجموعی کیفیت اندر اور باہر سے یکساں اثر انداز، دل پسند اور

---

[1] سورۃ الفجر، آیتہ ۳۰، پارۂ عم۔ [2] مفتاح التواریخ، صفحہ ۵۱۸۔

خوش منظر ہو گئی تھی۔

قبر کا چبوترہ (تابوت و تعویذ ملا کر) تین گز لمبا، دو گز چوڑا، ڈیڑھ گز اونچا ہے۔ قبر نہایت مستحکم تھی بارہ دری کے اندر کا فرش بھی خوب مستحکم تھا۔ قبر میں سنگ مرمر کے موٹے موٹے بڑے بڑے تختے جڑے تھے۔ سادہ تھے لیکن شفاف اور جلادار۔ تعویذ ایک ڈال مرمر کا تھا جو مسطح و ہموار ہے۔ اس پر نہ تختی کا نشان ہے نہ قلمدان بنا ہے۔ سنگِ بالیں پر چراغ دان یا چھوٹا سا طاق ہے۔ بلند تعویذ کے اردگرد، چبوترۂ قبر کے مرمریں تختوں میں چوکور سوراخ کچھ کچھ دُور پر کھُدے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شامیانہ وغیرہ نصب کرنے اور چوبوں کے کام میں آتے تھے۔ میرے خیال میں یہاں چوبیں یا مرمریں کٹہرا لگا ہوگا۔ شاید چپر کھٹ کا انتظام بھی رہا ہوگا۔ یہ سوراخ بعد کو کسی دوسرے پتھر سے بند کردیے گئے ہیں۔

چبوترہ اور بارہ دری کی تجویز اور زمین کی تقسیم اس خوبی و خوش نظری سے کی گئی تھی کہ ہر چیز اور اُس کا ہر جزو اور ہر پہلو نو نو گز کا تھا۔ مقبرہ کا طول و عرض اگر نو نو گز ہے تو اُس کے باہر بھی ہر طرف، اور چبوترہ کے ہر ایک رُخ کا ہر ایک ٹکڑا اور ہر ٹکڑے کا ہر ضلع نو نو گز کا بن جاتا ہے۔ چبوترہ پر چڑھنے کے لئے چاروں طرفوں میں لمبے چوڑے زینے پانچ پانچ سیڑھیوں کے بنائے گئے تھے۔ جن کے پتھر آنے جانے والوں کی ناپیدائی اور اپنی شکستہ پائی سے دلگیر و دل برداشتہ ہو کر قدم قدم پر ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

مقبرہ کی موجودہ حالت یہ ہے۔ کوٹھا پارچہ علاقۂ بہادر گنج میں پختہ سڑک سے کچھ دور، ایک پیچ دار راستہ سے جانے پر وہ بند اور تنگ جگہ ملے گی جو اسی قبر کی بدولت اب بھی "بیگم باغ" کہلاتی ہے۔ حالانکہ نہ باغ باقی ہے نہ اُس کا وسیع و فراخ احاطہ۔ احاطہ کی دیواروں کا پتہ نہیں۔ اسکے لمبے چوڑے رقبہ پر مکانات بن گئے یا کسی نہ کسی اور صورت میں یار و اغیار کے تصرف میں ہیں۔ چبوترہ سے ہٹ کر یا یوں کہئے کہ نیچے اُتر کر دو دو گز سے زیادہ زمین کسی طرف نہیں چھوٹی ہے۔ ہر سمت محدود و معمور ہے۔ یہ تنگ حصہ یا جائے مرور بھی گندگی و نجاست سے ناقابل گزار رہتا ہے۔ چبوترہ کے فرش کے پتھر جابجا کھُل گئے ہیں۔ اُکھڑ گئے ہیں، کچھ غائب بھی۔ چبوترہ کے پہلوؤں کی بنیادی دیواریں ہر طرف ڈھلوں پر مستطیل جدولیں اور خوش نما کام تھا۔ یہ پتھر بھی اب ایک دوسرے سے مفارقت کر رہے ہیں۔ چاروں گوشوں کے بھاری بھاری پتھر کے ٹکڑوں پر جو سنگ تراشی و نقاشی کی گئی تھی، چھوٹے چھوٹے ملتصق کھمبوں کی شکل میں ہنوز برقرار ہے۔ پتھر کا کٹہرا جو اس فراخ و پہن چبوترہ کی پوری وسعت پر محیط تھا کہیں، اور پہنچا۔ اب صرف اسکی نالیاں اور کہیں کہیں سوراخ یا آثار دکھائی پڑ جاتے ہیں۔

بارہ دری کی ستونوں اور محرابوں کے اوپر والے پتھراور چھجے کے تختے بالکل کھل گئے بہت سے کھل گئے ہیں۔ بعض گر کر ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ اسی طرح گنبد یا چھت کے پتھر ایک دوسرے سے منفصل و جدا ہو رہے ہیں۔ ہشت پہل سنگی منارے جو مقبرہ کے چاروں گوشوں پر ایک وسط میں عین کونے پر اور دو کسی قدر فصل سے ادھر اُدھر لگائے گئے تھے، اب معدودے چند اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ ایک آدھ کے پُر تکلف نقشین ٹکڑے زمین پر جبہ سائی کر رہے ہیں۔ چھجے سے اوپر اوپر دو دو گز کے قریب اونچی دیوار اُٹھائی گئی تھی۔ اس میں پُر تکلف منقش پتھر زرکار میں لگے تھے جس سے عمارت کے سامنے بالائی حصہ کا نظارہ اور بھی دلکش ہو گیا تھا۔ یہ اب بھی کم و بیش اصلی حالت میں ہے۔ اس کے چاروں کونوں پر ہشت پہل کام کٹاؤ کا تھا۔ پھول پتیاں تھیں۔ اب بھی ہیں۔ چھجے کے منزل پتھر کے ہیں۔ ان میں شامیانہ نصب کرنے، پردے لگانے، رسیاں باندھنے کے لئے چھید موجود ہیں۔ لوہے کے بھاری بھاری کڑے بافراط لگے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب لوہا کمیاب اور سونے کی طرح گراں تھا۔ مقبرہ کے اندر اور باہر کچھ ایسی چیزوں کے ٹکڑے جو غالباً کسی اور موقع یا کسی دوسری قبر پر لگے ہونگے اور کچھ متفرق سامان اور پتھر کے تختے بھی اِدھر اُدھر پڑے ہیں۔ بعض پر نفیس کندہ کاری ہے۔ نقش و نگار ہیں۔ دو دروازوں کو چھوڑ کر باقی کی لمبی چوڑی اونچی اونچی باریک و نازک کام کی جالیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ ان کے اجزا بکھر گئے ہیں۔

قبر کا نظارہ سب سے زیادہ رنج دِہ اور الم آفریں ہے۔ چونا کئی جگہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ سوراخ اور شگاف ہو گئے ہیں۔ سنگ مرمر کے کئی تختے اُکھڑ گئے ہیں۔ کچھ اپنی جگہ پڑے ہیں کچھ اِدھر اُدھر منتشر۔ سنگِ بالیں جو سامنے سے سادہ اور پشت کی جانب سے ہشت پہل دار تراشا گیا تھا معذورانِ شکستہ پا کی طرح سرہانے چت پڑا ہے۔ غرضکہ سارا نظام درہم و برہم ہو رہا ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ ان سہل الانتقال سریع الانہضام قیمتی اشیا کا کوئی جوہر شناس قدرداں اب تک پیدا نہیں ہوا۔ شاید

طفلانِ شہر بے خبر اند از جنونِ ما ؎ یا ایں جنون ہنوز سزاوارِ سنگ نیست؟

اس عمارت کو بنے ہوئے دو سو برس بھی پورے نہیں ہوئے مگر اسکی مجموعی ہیئت اور ظاہری کیفیت اسکو دونی عمر کا بنا کر دکھا رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پوری عمارت نہایت مخدوش، اندیشہ ناک اور سراسر پُر خطر حالت میں ہے۔ قریب انہدام۔ مسٹر بیل! تمہاری گور خنک رہے اور تمہاری کتاب زندہ جس سے اس مقبرہ کی یاد صفحۂ ہستی پر کچھ دن اور رہ جائے گی۔ ورنہ نہ تو وہ دونوں تربتیں باقی ہیں نہ اُن کے قطعاتِ تاریخ۔ نہ باغ ہے نہ باغ کا احاطہ۔ نہ احاطہ پر کی منقوش تاریخیں[1] رہے نام باقی بس اللہ کا۔

---

[1] مفتاح التواریخ: صفحہ ۵۱۸۔

جامع مسجد

یہ مسجد خسرو باغ سے دور، دریائے جمن کے کنارے، قلعہ کے پاس، پچھم طرف، نو پیدا و نو خاستہ منٹو پارک کے دکھن واقع تھی۔ اس کا ذکر اسی کتاب کے صفحات ۲۱۴ و ۲۳۷، پر کسی دوسرے سلسلہ میں کر چکا ہوں۔ جس سے اس کی مختصر سرگزشت یعنی ابتدائی کیفیت، درمیانی تغیرات و انقلابات اور موجودہ حالت و تباہی کا اندازہ ہوا ہوگا۔ یہ مسجد اس وقت کسی عمارت کی صورت میں باقی نہیں ہے۔ اگر بحالہ قائم ہوتی تو بھی فی الحال اس کو میری تحقیقات کے حدود دائرۂ تحریر سے خارج و باہر رہنا چاہئے تھا۔ ناظرینِ موقع اور قاریانِ کرام عالمِ تصور میں اس کی تصویر بنا سکتے ہیں۔

۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء یعنی مفتاح التواریخ کے زمانۂ تالیف) تک مسٹر بیل نے اس کو دیکھا تھا۔ اور اس کا تذکرہ مفتاح میں "جامع مسجد بلدۂ الٰہ آباد" کے عنوان سے کیا ہے۔[1] اور بیٹل بیاگرفی کل ڈکشنری کے اوراق پر بھی اس "گے تھیڈرل ماسک" Cathedral Mosque کی نسبت گل افشانی فرمائی ہے۔[2]

مسجد کے بانی کا نام ابو طالب مرزا مراد تھا۔ جو اعتماد الدولہ مرزا غیاث بیگ طہرانی[3] کا پوتا، یمین الدولہ خواجہ ابو الحسن آصف خاں[4] کا بڑا بیٹا، اور ان دونوں سے بھی زیادہ مشہور و معروف بیگم نور جہاں کا بھتیجا تھا۔ ہندوستان کی تاریخیں اور دولتِ تیموریہ کے دفاتر اس کو امیر الامرا عمدۃ الملک خانِ جہاں بہادر[5]

---

[1] صفحہ ۳۶۹، مطبوعہ ۱۸۴۹ء۔ [2] صفحہ ۲۵۰۔ [3] جس کا مفصل حال مآثر الامرا، جلد اول، صفحات ۱۵۱ لغایتہ ۱۶۰ میں درج ہے۔ [4] اقبال نامۂ جہانگیری، صفحہ ۲۷۵۔ و۔ مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۳۴۔ و۔ بیاگرفی کل ڈکشنری، صفحہ ۵۵۔ و۔ تاریخ معین الآثار، صفحہ ۳۵۔ و۔ تاریخِ تاج انگریزی، صفحہ ۳ ملاحظہ ہوں۔ [5] شاہ جہاں نے خانِ جہاں بہادر خطاب ۱۰۶۶ھ (۱۶۵۶ء) میں عطا کیا اور شش ہزاری منصب پر ترقی دی تھی۔ منتخب اللباب، جلد اول، صفحہ ۷۵۰۔

نواب شایستہ خاں[1] کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ باپ کے مرنے پر[2] ۱۰۵۱ھ (۱۶۴۱ء) میں شاہ جہاں نے اس کو منصبِ جلیلۂ وزارت پر مامور و سرفراز کیا تھا۔ جس پر عہدِ اورنگ زیب میں بھی بحال و قائم رہا۔ اس طاقتور جنرل[3]، منتظم گورنر، دور اندیش مدبّر[4] کی عظیم الشان خدمات اور ملکی و سیاسی یا جنگی کارناموں کے گنانے کا نہ یہاں موقع ہے نہ ضرورت۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز گماشتوں، پرتگالیوں اور مرہٹوں سے اس کو سابقہ پڑا تھا۔ معاملہ و مقابلہ رہا تھا۔ وہی لوگ اس کو اچھے لفظوں میں یاد نہیں کرتے ہیں، نہ اُن کے اخلاف وریزہ چیں اس کو اچھی نگاہ سے دیکھتے ہیں[5]۔

شاید یہ زباں تشنۂ فریاد رہے گی
جب تک خلشِ دردِ خداداد رہے گی

ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں لکھا ہے کہ شایستہ خاں ۱۶۳۷ء (۱۰۴۷ھ) میں الہ آباد کا گورنر تھا[6]۔ مجھے اس کے صحیح ماننے میں تامل ہے۔ مُلّا عبد الحمید لاہوری، تعین تاریخ کے ساتھ، بادشاہ نامہ میں لکھتے ہیں کہ شایستہ خاں ۱۱ ذی الحجہ ۱۰۵۲ھ (۲۴ فروری ۱۶۴۳ء) کو نظامتِ صوبۂ بہار سے تبدیل ہو کر صوبہ داری الہ آباد پر بجائے سید عبد اللہ خاں بہادر فیروز جنگ کے مامور ہوا تھا[7]۔ اسی طرح خافی خاں کی تحریر سے یہ بھی ثابت ہے کہ وہ شروع جمادی الاولی ۱۰۵۵ھ (وسط جون ۱۶۴۵ء) میں مالوہ بھیجا گیا[8] اور صوبۂ الہ آباد شاہزادۂ بیدار بخت کے سپرد کیا گیا تھا[9]۔

وہ ۱۶ شوال ۱۱۰۵ھ (۱۳ مئی ۱۶۹۴ء) کو ترانوے سال قمری کی عمر میں اس عالم سے رخصت ہوا[10]۔ آگرہ میں جمنا کنارے اپنی بہن ملکۂ جہاں، ارجمند بانو، ممتاز الزمانی کے شہرۂ آفاق مرقد کی سرزمین

---

[1] ابو طالب کو جہانگیر نے ۱۰۳۵ھ (۲۶-۱۶۲۵ء) میں شایستہ خاں خطاب دیا تھا۔ منتخب اللباب، جلد اوّل، صفحہ ۲۸۸۔ [2] بادشاہ نامہ، حصّۂ اوّل، دَورِ اوّل، صفحہ ۲۹۶۔ و گنجِ تاریخ، صفحہ ۲۰۳۔ [3] شاہ جہاں نامہ، جلد دوم، صفحہ ۳۴۶۔ [4] ایضاً، جلد دوم، صفحہ ۴۰۵۔ [5] اورینٹل ڈکشنری، صفحہ ۲۵۰۔ [6] سابق، جلد ہشتم، صفحہ ۵۲، مطبوعہ ۱۸۸۴ء۔ نیز گزیٹیر جدید، صفحہ ۹۶، مرتبہ ۱۹۱۱ء۔ [7] حصّۂ اول، دَورِ اول، صفحہ ۳۲۲۔ [8] منتخب اللباب، جلد اوّل، صفحہ ۶۱۰۔ [9] بادشاہ نامہ، حصّۂ دوم، صفحہ ۴۴۲۔ [10] اورینٹل ڈکشنری، صفحہ ۲۵۰۔ و۔ مخبر الواصلین۔ و گلستانِ مسرت، صفحہ ۴۹۹، مطبوعہ ۱۲۶۷ھ۔

پر ایک پُر فضا باغ اور نفیس مقبرہ میں پیوند خاک کیا گیا تھا۔ مگر اب وہاں خاک ہی خاک اُڑتی ہے اور نام ہی نام رہ گیا ہے۔[1]

شاہ جہانی عہد کی یہ قابلِ نازش یادگار آشوبِ ہندوستان یعنی ۱۸۵۷ء تک قائم تھی۔ نام نہاد پیش بینیوں، دور رسیوں، فوجی مصلحتوں اور جنگی ضرورتوں سے حکومتِ وقت نے گولہ باری اور ڈائنامیٹ بازی فرماکر شہید کرادیا۔ اس منہدم و مسمار عمارت کے بڑے بڑے مضبوط ٹکڑے اور ٹوٹے ہوئے بُرج و منارے غرقِ آب اب بھی نظر آتے ہیں۔ بعض دروازے بھی کسی قدر بلندی تک نمودار ہیں۔ مسجد کی ہیئتِ مجموعی البتہ مٹ چکی ہے۔ سنگی دیواروں کے برائے نام جابجا آثار، آب رسانی کے لئے زمین دوز نالیاں، پانی کے بدررو، دریا میں جانے کے لئے سیڑھیاں، تقریباً آدھ میل تک کچھ نہ کچھ موجود ہیں۔ جن سے اس عمارت کی وُسعت و عَظمت اور رِفعت و فُسحت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ جاننے والے یہ بھی بتاتے ہیں کہ کبھی یہاں تسبیح خانہ تھا۔ یہ وضو کی جگہ تھی۔ یہاں علماء و صلحا کی فرودگاہیں تھیں، یہاں مشائخ و فقرا کے لئے زاویئے، یہاں وارد و صادر کے ٹھہرنے ٹھہرانے کے ٹھکانے تھے۔ یہ حصہ طالب علموں کے لئے مخصوص تھا۔ اِدھر غسل خانے تھے۔ غرض ہر طبقہ اور ہر فرد کے لئے پوری آسایش اور کامل فراغت کا انتظام و اہتمام تھا۔

ایک کنواں بھی وسیع و مضبوط تھا۔ اُس زمانہ کی تمام ضرورتوں کو بخوبی پورا کرتا ہوگا۔ اب بھی موجود ہے اور اُس کا کتابہ بھی محفوظ۔

تعمیر کا آغاز غالباً ۱۰۵۳ھ (وسط ۱۶۴۳ء) میں ہوا ہوگا۔ ختم ہونے کی نوبت سنہ ۲۰ جلوس یعنی ۱۰۵۶ھ (۱۶۴۶ء) میں پہنچی۔ قطعۂ تاریخ مسجد کے اندر گنبد کے قریب منقوش تھا۔ اسمیں تیئیس شعر تھے۔ ان میں سے تین شعر تو چونہ گاری کی بدولت مسٹر بیل بھی نہ پڑھ سکے تھے،[2] نہ کوئی اور اُن کو بتا سکا تھا۔ باقی بیس شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ آخر میں وہ فقرہ بھی ہے جس سے

---

[1] ڈکشنری صفحہ ۲۵۰۔ [2] مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۶۹۔

نگرانِ تعمیر کا نام معلوم ہوتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کچھ دن بعد اس مسجد کا احوال اور ان اشعار کا بتانے والا یا پتہ دینے والا بھی صفحۂ ہستی پر نہ مل سکے۔

زہے بنائے ہمایوں کہ در الہ آباد — بحکم بادشہِ دین پناہ شد بنیاد
شہے کہ از پئے آرایشِ سریر و کلاہ — چو او زمادرِ ایام ہیچ گاہ نزاد
شہے کہ عالم آبائے علوی و سفلی — براد؛ دین و شرافت چو او نہ آرد یاد
شہِ جہاں کہ بزیرِ نگیں گرفتہ جہاں — چو آفتاب فروزاں ہمیشہ عدل و داد
غبارِ معصیتش می برد نسیمِ عطا — کسے کہ ناصیۂ صدق را بخاک نہاد
رواج یافتہ دیں در جہاں ازیں مسجد — نکرد خانۂ دیں کس چو بادشہ آباد
کس از شرافت و قدرش نیاورد بشمار — بسطحِ صحنشِ سقفِ فلک بود ہمزاد
چو خشت بہر بنا ماند بر زمیں معمار — ملک ز عرش بیامد پئے مبارکباد
بلند قدر بنائے کہ بہرِ کسبِ ضیا — بر آستانشِ مہرِ منیر سر بنہاد
بحلق سنگِ درش عینکِ خدا بینی — زہے صفائیِ دستِ ہنرورِ استاد
ازیں بنا بدو عالم ز باعث و بانی — خداست راضی و سر خدا و کشاد (؟)
بشد ز لطفِ الٰہی بایں بنا باعث — ز صدق و صافیٔ شایستہ خانِ نیک نہاد
زہے بنائے زہے باعث و زہے بانی — بہ لطفِ حق ہمہ معمورِ دین و دنیا باد
ز چار سوے بنا عفوِ جرم می بارد — زہے شرافتِ بانیٔ و رتبۂ بنیاد
چو دورِ گنبدِ ایں کعبہ دید چشمِ فلک — براہِ حیرتِ ہمچوں زمیں زپا افتاد
بنہ بسجدہ سرِ ایں جا کہ فیضِ مسجدِ شاہ — بہ ہیں بسنگ چو انساں زبانِ گویا داد
قدم ز سر پئے اتمام ساختی غنی (؟) — چو اہتمام بنامِ من اتفاق افتاد
بہ نورِ دین اندیشہ دلومش تزئین (؟) — نہ ہیچو کوہ کن از دستِ دستۂ فولاد
بگفت ہاتفِ تاریخ سالِ تعمیرش — بر آستانشِ مہرِ منیر سر بنہاد

۱۰۵۷

ہزار و پنجہ و شش رفتہ بود از ہجرت　　کہ دست باز کشید از عمارتش استاد

با ہتمام مرید فدوی خلیل اللہ موسوی باتمام رسید۔ فقط

آستان اور مہرِ منیر کے اعداد کے ملانے سے، ۱۰۵۰ نکلتے ہیں۔ صحیح سال کے حساب سے ایک بڑھ جاتا ہے۔ اس نقص کے سوا یہ نظم زبان و بیان کی خامیوں سے بھی خالی نہیں پائی جاتی، جن میں سے کچھ نہ کچھ تو کاتبوں اور نقل کرنے والوں کے دستِ فیض و نگاہِ کرم کی طرف منسوب و محمول کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اس ہیچ مداں کے نزدیک خود "آستانِ مہرِ منیر" کسی ایسی رفیع الشان عبادت گاہ کے لئے قابلِ قدر و لایقِ ستایش تاریخ قرار نہیں دی جا سکتی۔ سترھویں شعر سے واضح ہوتا ہے کہ یہ قطعہ مرزا طاہر غنی[۱] کا ہے، جو اُس دَور کے ممتاز و نامور شعرا میں تھے۔ لیکن ان کے دیوان میں نہیں ملتا۔ سب سے پُرانا نسخہ بھی دیکھ چکا ہوں جو مطبعِ مصطفائی لکھنؤ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) کا نہایت صحیح اور پاکیزہ چھپا ہوا ہے۔ چھاپنے والوں نے اس مجموعہ کی ترتیب و تہذیب میں بڑا اہتمام کیا تھا۔ دیوان کے متعدد قلمی نسخے جمع کر کے سامنے رکھے تھے اور مقابلہ کر کے مکمل و شایع فرمایا تھا۔

ملا غنی کے موجودہ دیوان کو ناقص کون کہہ سکتا ہے، جس کی نسبت مسٹر بیل تحریر فرماتے ہیں کہ محمد علی مرزا ماہر نے ترتیب دیا تھا جو مرزا جعفر معمائی کے متبنّٰی تھے[۲]۔ میر حسین دوست سنبھلی راوی ہیں کہ غنی کے اشعار انبار در انبار بلکہ ایک لاکھ شمار میں تھے، جن میں سے خود ہی چھانٹ کر صرف ایک ہزار رکھے تھے، باقی دریا میں بہا دیئے تھے[۳]۔ وہی مجموعہ منتخب مرزا صاحب کے نذر کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نچوڑ میں ہر رطب و یابس یا کم سے کم ایسی تاریخ کی گنجایش کہاں ہو سکتی تھی۔ یہ مسلم ہے کہ ملّا صاحب شوقین و رنگین تاریخ گو تھے۔ ان کے دیوان میں نیز اُس کے

---

[۱] غنی، اصلاً و نسلاً کشمیری تھے، کشمیر ہی میں رہے۔ یہ بھی جوان تھے اور ان کی شاعری و شہرت بھی جوان، اٹھارہ سال کی تھی کہ ۱۰۷۹ھ (۱۶۶۸ء) میں ایک عجیب و غریب کیفیت سے وفات پائی۔ بڑے قانع، بے نیاز، اسمِ بامسمّٰی تھے۔ سروِ آزاد، صفحہ ۱۰۳۔ شمعِ انجمن، صفحہ ۳۳۹۔ بیل کی ڈکشنری، صفحہ ۹۴۔ مفتاح التواریخ، صفحہ ۴۰۹۔ یدِ بیضا قلمی، اوراق ۱۵۴ و ۱۶۸۔ [۲] مفتاح التواریخ، صفحہ ۴۰۹۔ [۳] تذکرۂ حسینی، صفحات ۲۲۸ و ۲۲۹۔

باہر! ان کی نکالی ہوئیں تاریخیں اچھی اچھی نظر پڑتی ہیں[1]۔ غنی کے اُستاد شیخ محمد محسن فانی تھے۔ وہ اس صوبہ (الہ آباد) میں سالہاسال خدمتِ صدارت پر ممتاز رہے تھے[2]۔ شاہجہاں ان پر بہت مہربان تھا۔ پھر یہ عتاب میں آگئے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ مُلّا صاحب نے یہ قطعہ اُستاد کی فرمایش وارشاد سے کہا ہو۔

لیکن اگر اس (سترھویں) شعر کے پہلے مصرع کی غلطی' بیل صاحب کی ہو یا چھاپنے والوں کی' غلطی مان لی جائے تو یہ عقدہ خود بخود کُھل جاتا ہے۔ یعنی۔ غنی' کی جگہ " فانی" پڑھا جائے۔ مصرع پورا اور شعر کا وزن بھی ٹھیک ہو جاتا ہے اور حالات بھی صحیح ہو جاتے ہیں۔ غنی کا گھر سے نکلنا' خاصکر الہ آباد پہنچنا ثابت نہیں ہوتا۔ بخلاف اس کے محسن فانی اُس وقت بھی الہ آباد میں موجود اور برسرِ کار تھے۔ حسب دعوی مصرعِ دوم اگر کسی اہتمام کا قرعہ اُن کے نام پڑا ہو تو کچھ بعید نہیں۔ فانی کا دیوان مجھے دستیاب نہیں ہوا۔ ورنہ پورا اطمینان ہو جاتا۔ خاصا ضخیم سات ہزار شعر کا بتایا جاتا ہے۔

اگر شاعرانہ طباعی' اظہارِ نیاز اور شاہانہ عقید تمندی و وفا کوشی کا جوش نہ سمجھا جائے تو اس قطعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شایستہ خاں نے اس مسجد کی بنیاد ازخود نہیں ڈالی تھی' بلکہ اس کی تعمیر کے لئے بارگاہِ جہاں پناہی سے ایما ہوا تھا۔ اسی لئے شاعر نے کئی جگہ بادشاہ کو باعث اور نواب کو بانیِ تعمیر کے لفظ سے یاد کیا ہے۔

مہتمم تعمیر' خلیل اللہ موسوی' کا حال مجھے کسی کتاب میں نہیں ملا۔ عمدۃ الملک خلیل اللہ

---

[1] گلستانِ مسرت ملقب بہ حدائق المعانی' مطبوعہ ۱۲۶۷ھ' مصطفائی' لکھنؤ' صفحہ ۲۰۴۔ یہ وہی کتاب ہے جس کا ذکر نامور فرانسیسی مستشرق شیفر CH. SHEFER نے اپنی کتاب Chrestomathie Persane کے حصہ دوم Tome Second مطبوعہ پارس' ۱۸۸۵ء میں صفحہ ۲۵۶ پر کیا ہے اور جس سے بذیلِ "اشعارِ متنوعہ" بعض تاریخیں نقل فرمائی ہیں۔ (صفحات ۳' ۲۷ وغیرہ)۔ [2] مفتاح التواریخ' صفحہ ۲۱۱۔ ۲۱۰۔ اور ینٹل ڈکشنری' صفحہ ۱۹۴۔

خانِ شاہجہانی[۵] کے حالات پڑھنے کے بعد احتمال ہوتا ہے کہ وہ کوئی اور بڑے شخص ہوں گے یا شاید 'گنجِ تاریخ' والے میر خلیل اللہ خاں ولد میر میران نعمت اللہ خاں[۵۵] یہی ہوں۔ جن کو یہ عروج ومرتبہ اور ششش ہزاری منصب بعد کو نصیب ہوا ہو۔[۳]

ایک حقیقت شناس حق اندیش نے سچ کہا تھا۔

یادِ من در بیں من فاتحہ خوانم باقی است گرچہ فانی شدہ ام نام و نشانم باقی است

مسجد باقی نہیں لیکن عوام الناس میں اس کی یاد، اس کے نام سے منسوب گھاٹ کی وجہ سے باقی ہے اور باقی رہے گی۔ جس کا مختصر ساذکر گزیٹیر نویسوں نے بھی کیا ہے۔ ریلوں کے نکلنے سے پیشتر مال تجارت کے لانے لے جانے کا کاروبار زیادہ تر نہروں اور دریاؤں کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔ ساٹھ برس ہوئے محکمۂ زراعت و تجارت کے قائم ہونے پر اس صوبہ کی (جو اس وقت ممالکِ مغربی وشمالی واودھ سے موسوم تھا) بحری درآمد و برآمد کے بارہ میں تحقیقات کرائی گئی تھی۔ ۸۰-۱۸۷۹ء کے متعلق مسٹر (بعد ازاں سر) جے بی فلر B. F. Fuller اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمۂ مذکور کی مفصل ومکمل رپورٹ کا خلاصہ یہ ہے کہ الہ آباد خاص میں جمنا کے مُعتبر تین ہیں۔ ایک بلوا گھاٹ۔ دوسرا گئو گھاٹ۔ تیسرا جامع مسجد کا۔ اس جامع مسجد والے گھاٹ سے وابستہ چالیس کشتیاں تھیں اور سب سے زیادہ مال یعنی سوا دولاکھ من سالانہ یہیں اُترتا تھا۔[۵۵۵] اس کی تائید میں پُرانے گزیٹیروں اور رپورٹوں کا حوالہ بھی دیا تھا۔ گھاٹ کی کیفیت و ترقی اور نام کی شہرت ہنوز بدستور ہے بلکہ روز افزوں۔

اس نام کی دوسری یادگار میونسپلٹی کی چونگی چوکی ہے۔ اس کی گرم بازاری و رونق بھی برقرار ہے۔

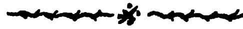
'مسجد کا ہے چراغ بجھایا نہ جائے گا' ظاہری حیثیت سے مسجد رخصت ہو چکی۔

---

[۵] اورینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری، صفحہ ۱۴۲۔ [۵۵] گنج تاریخ یا تاریخ سروری، صفحہ ۲۰۳۔ [۵۵۵] ڈسٹرکٹ گزیٹیر سابق، صفحہ ۱۱۷، جلد ہشتم، مطبوعہ ۱۸۸۴ء۔ [۳] تحقیق مابعد۔ میر خلیل مخاطب بہ خانِ زماں، یمین الدولہ آصف خاں کا داماد تھا۔ بہرفن کامل۔ عہد عالمگیر میں پنج ہزاری منصب پر ممتاز اور مالوہ کا گورنر ہوگیا تھا۔ مآثر الامراو ڈکشنری، صفحہ ۱۴۹۔

نیستی کا سیلاب اُس کے پیکرِ خاکی کو یکسر بہالے گیا، اُس کا ذرّہ ذرّہ تباہی و بربادی کے ہاتھ سے فنا کی نذر ہو رہا ہے۔ لیکن یہاں کی فضائے بسیط میں تسبیح و تہلیل کی صدائیں عالمِ بالا سے گونجتی ہوئی اب بھی آجاتیں اور فردوسِ گوش ہوتی ہیں۔ انوارِ الٰہی کی تابش، رحمتِ نامتناہی کی بارش دیکھنے والی آنکھوں کو سرد و خنک رکھتی ہے۔ بے شبہ یہ پرتوے، یہ تجلیاں، یہ تابانیاں اہل اللہ اور اہل دل کے لئے مخصوص ہیں جو روحانی نزاکتوں اور پاکیزگیوں سے مالا مال ہیں۔ ہم ایسے بے بصر بندگانِ دُنیا کا ان لطافتوں اور نظافتوں میں حصّہ کہاں۔

خستۂ عجزیم و از ما جز گنہ مقبول نیست تکیہ دارد بر شکستِ توبہ استغفار ما



قلعہ

شائستہ خاں کی بے قرار روح کی بے چینی اور بھی بڑھ جاتی ہے، جب وہ اپنی مسجد کے ویرانہ کے قریب ہی اکبر اعظم کے عظیم الشان قلعہ کو بھی بگڑی اور بگاڑی ہوئی حالت میں پاتی اور اکبر کی روح کو قلق و اضطراب میں دیکھتی ہے۔ یہ وہی قلعہ ہے جو شہنشاہ کی ذاتی تجویز و ہدایت سے بنا تھا۔[۱] جس کی بنیاد ڈالنے کے لئے جہاں پناہ کو چار مہینے یہاں ٹھہرنا پڑا تھا۔[۲] جس کی تعمیر و تیاری شاہزادۂ ولی عہد مرزا سلیم کی نگرانی میں ہوئی۔ جس کے اہتمام و تکمیل میں شجاعت شعار سعید خاں، مخلص خاں، راجہ ٹوڈرمل، رائے بھارتھ دیوان اور پیاگ داس شرف نے خون پانی ایک کر دیا تھا۔[۳] جس کی مختصر سی ابتدائی تاریخ یہ ہے کہ اکبر ۹۸۱ھ (۱۵۷۳ء) میں پٹنے کی مہم پر جا رہا تھا اس مقام (پریاگ) پر پہنچا تو حکم دیا کہ "ایک حصار عظیم الشان قلعہ آگرہ کے نقشہ پر تعمیر ہو۔ اور یہ ایجاد زیادہ ہو کہ چار قلعوں میں تقسیم ہو۔ ہر قلعہ میں محل، مکانات، بالاخانے، خوشنما طرزوں کے ساتھ مرتب ہوں۔ پہلا قلعہ وہاں ہو جہاں ٹھیک دونوں دریاؤں کی ٹکر ہے۔ اس میں بارہ خانہ باغ ہوں۔ ہر باغ میں کئی کئی مکانات دلکشا۔ یہ خاص دولت خانۂ بادشاہی۔ (۲) میں بیگمات اور شاہزادے۔ (۳) اقربائے سلطانی۔ ملازم اور اہل خدمت۔ خاص و عام۔ (۴) ...۔ استادانِ ہنر ہوش نے اُس کے نقشوں کی تراشیں پیدا کرنے میں ذہن لگا کر کارنامے دکھلائے۔ اور ساتھ ہی ایک کوس طولانی، چالیس گز عریض، چار گز بلند، بند مستحکم باندھ کر عمارتیں تیار کھڑی کر دیں۔ ۲۵ سنہ جلوس میں عمارت کا کام ختم ہوا تھا۔"[۶] یہ پوری عبارت منشی الملوک لالہ سبحان رائے بٹالوی کی خلاصۃ التواریخ سے ماخوذ بلکہ حرف بہ حرف ترجمہ ہے۔ اُس کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

---

[۱] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، صفحہ ۱۹۵۔ [۲] ایلیٹ صاحب کی تاریخ ہندوستان، جلد پنجم، صفحہ ۴۲۳۔ و ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، صفحہ ۱۶۶۔ [۳] مفتاح التواریخ، صفحہ ۱۹۶۔ [۴] دربار اکبری، صفحات ۱۲۲ و ۱۲۳۔ [۵] قلمی، موجودہ کتاب خانۂ صمدن، ورق ۱۴۱۔

اسی قلعہ کے تیار ہو جانے پر شاہی مورخ منشی محمد کاظم بن محمد امین نے عالمگیر نامہ میں فرمایا تھا کہ "قلعۂ الٰہ آباد در متانت و حصانت شہرۂ آیام است"۔ لے۔ خافی خاں نے تحریر کیا تھا کہ "قلعۂ الٰہ آباد با گردون ابد بنیاد ہم اساس است"۔ ہے میر غلام حسین خان طباطبائی نے لکھا تھا "قلعۂ سنگین آنجا (الٰہ آباد) با کاخ و ایوانہائے دیگر بسعی اکبر بادشاہ افراختہ آمد"۔ ہے مسٹر بیل نے بتایا تھا "در متانت و استحکام نظیرے ندارد"۔ ہے۔

گردشِ روزگار سے وہ قلعہ اُن بے درد و ناقدر یا نااہل ہاتھوں میں پہنچا، جنھوں نے اپنے قبض و تصرف کے آغاز ہی سے اُس کو ستیاناس کر دیا اور مسخ و بدنما بنا ڈالا۔ فوجی آئین و قوانین کی دارو گیر نیز سرکاری رازوں کے افشا کی ممانعت ہمہ گیری و مواخذہ کا اندیشہ ہے۔ پوری تفصیل یا تطویل کے ساتھ لکھنے سے قلم رکتا ہے۔ اس لئے چند معتمدین حکومت ہی کی تحریرات کو مختصراً نقل کر دینا قرینِ مصلحت سمجھتا ہوں۔

سب سے پہلے ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۸ء) میں کرنیل کیڈ (کیٹ) نے اس پر ہاتھ صاف کیا۔ اندر قلعہ کے مکانات گرا کر باقی چیزوں، عمارتوں اور قلعہ کی دیواروں کی صورت و ہیئت یکسر بدل دی۔ مسٹر بیل نے اسی پر داد تحسین دی تھی "راست این است کہ بیشتر ازیں لائق بزم بود حالا قابل رزم است"۔ ہے کپتان (بعدہ جنرل) گاڈفرے چالیس منڈی شروع فروری ۱۸۲۸ء میں الٰہ آباد آئے تھے قلعہ بھی گئے تھے۔ اس کو نہایت وسیع و مستحکم بتاتے ہیں۔ دونوں دریاؤں کی کشتیاں اور کشتی راں یہاں سے نظر پڑتے تھے۔ لکھتے ہیں کہ اکبر نے اس نئے شہر کی بنیاد ۱۵۸۱ء میں ڈالی تھی۔ اس کے نابکار اخلاف کے ہاتھوں سے نکل کر قلعہ انگریزوں کے پنجہ میں ۱۷۶۵ء میں آیا ...... یہیں پر شاہ عالم بادشاہ دہلی سے لارڈ کلایو نے بشرط حفاظت صوبۂ بنگالہ کا قبضۂ قانونی حاصل کیا تھا۔ اس اہم حصار کی قلعہ بندیوں میں کمپنی نے زر کثیر صرف کر دیا۔ اس کو فوجی ذخائر کا ایک بہت بڑا ڈپو بنا یا ہے"۔ لہ۔

مسٹر اسٹیل اور اُن کے ہم قلم رفقا نے ۱۸۶۴ء میں کیفیت یہ بتائی تھی کہ قلعہ تو اب بھی قائم و برقرار

لہ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۸ء، صفحہ ۱۲۹۔ لہ منتخب اللباب، حصہ اول، صفحہ ۱۳۶۔ سہ سیر المتاخرین، جلد اول، صفحہ ۲۰۔ کہ مفتاح التواریخ، صفحہ ۱۹۶۔ شہ مفتاح التواریخ، صفحہ ۱۹۶۔ لہ سفرنامہ، صفحہ ۲۵۲۔

ہے لیکن اُس کی خوبصورتی و خوشنمائی رخصت کر دی گئی ہے۔ بقول مسٹر ایچ جی کین زمانۂ حال کی تحصین و قلعہ بندی نظر آتی ہے۔ برج و منارے کانٹ چھانٹ دئے گئے ہیں۔ اونچی اونچی پتھر کی دیواریں جو خشکی کی جانب تھیں اُن کے اوپر گھانس دار فصیلیں قائم کی گئیں اور ہرے بھرے ڈھالو پشتوں سے ڈھانک دی گئی ہیں۔ قلعہ فوجی اغراض کے لئے مستعمل ہے اس لئے حسب قواعد و آئین اُس کی تفصیلات نہیں دی جا سکتیں"۔[1]

لفٹننٹ کرنیل ایچ آر نیویل کو گزیٹیر جدید میں اقرار کرنا پڑا تھا کہ "یہ قلعہ جب اکبر نے تعمیر کرایا تھا تو آگرہ[2] اور دہلی کے قلعوں کی شان و نمود کو مات کرتا تھا۔ مگر بد قسمتی کہنا چاہئے یا اتفاق وقت کہ اس کی گزشتہ عظمت و شان کے آثار اب کچھ بھی باقی نہیں ہیں ...... انگریزوں نے جب اس پر قبضہ کیا تو کوشش کی کہ اس قلعہ کو عصر حاضرہ کا ایک حصن حصین بنا دیں۔ اور اس کی اصلاح و استحکام ووبوں Vauban کے طرز تعمیر و قلعہ بندی پر کیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۳۸ء میں یا اُس کے قریب ان اصلاحات اور درستیوں کی تکمیل ہوئی۔ قلعہ کی خوشنمائی و خوبصورتی اور حُسنِ تعمیر کا خون کر دیا گیا۔ بُرج و منارے کانٹ چھانٹ کر صاف کر دئے گئے ...... دریا کے رُخ صرف اسی قدر عنایت ہوئی کہ مغلوں کی دیواریں اور فصیلیں دور کر دی گئیں۔ قلعہ کی شان و لطف نظارہ میں بڑا فرق آگیا۔ جمنا دروازہ بند کر دیا گیا۔ صدر دروازے کی اوپر والی منزلیں گرا دی گئیں ...... لارڈ ایلن برا کے نام سے منسوب کر کے بڑی بڑی بارکیں قلعہ کے اندر تعمیر کر دی گئیں ...... گورنرانِ الہ آباد کا پُرانا محل تبدیل کر کے سلاح خانہ کر دیا گیا۔ بیچ والی عمارت جو مغلیہ تعمیرات اور بود و باش کے مکانات کا نفیس ترین اور عمدہ سے عمدہ نمونہ کہی جا سکتی تھی اس پر بھی عہد جارج کے معمولی طرز کا لیس چڑھا دیا گیا۔ بعد کو لارڈ کرزن کی توجہ و نظر التفات سے یہ عمارت اپنی اصلی حالت پر لائی گئی اور پلاسٹر ہٹا دیا گیا ہے لیکن شاہی محلسرا ہنوز محکمہ آرڈیننس کے تصرف میں ہے۔ اس میں سلاح خانہ قائم ہے۔ اس میں مزید رد و بدل اغراض فوجی مقبول!۔ گم کردہ راہ کہاں سے کہاں پہنچا۔ خسرو باغ میں بہاراں کا لطف اُٹھایا۔ گُل افشانیاں دیکھیں۔ شائستہ خانی مسجد کے کھنڈروں پر آنسو بہائے۔ ناصیہ فرسائی کی۔ دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔ اب قلعہ کی زبوں حالی کا ماتم ہے اور اشک ریزیاں۔

ان نوحہ خوانیوں سے اُکتا گئی طبیعت   پھولوں کی ڈالیوں میں تو سوز خواں یہ کب تک

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر سابق، مطبوعہ ۱۸۸۴ء، صفحہ ۱۷۵۔ [2] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، ۱۹۱۱ء، صفحہ ۲۰۹۔

ہوئے بستان

حال (نومبر ۱۹۳۷ء) میں ایک بہاری اہلِ قلم حافظ سید عبدالرؤف فاضل اورنگ آبادی نے نواب داؤد خاں بیسر بھیکن خاں قریشی کے حالات کی ضمن میں کسی پرانی بیاض کے حوالہ سے لکھا تھا کہ اُنھوں نے "الٰہ آباد کی صوبہ داری کے زمانہ میں الٰہ آباد کو گنگا کے سیلاب سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک نہایت مضبوط و مستحکم پشتہ تیار کرایا تھا اور شہر کے باہر ایک بلند سطح پر خلد آباد کے نام سے ایک نئی آبادی بسائی، اور ایک سرائے، مسجد اور کنواں پختہ تعمیر کرایا تھا۔[1]" بادی النظر میں ان دعاوی کی وقعت و حقیقت کسی طبل بلند بانگ کی آواز سے زیادہ ثابت نہیں ہوتی تھی۔ میں ان کو صحیح ماننے سے معذور تھا۔

مُرغِ دلِ من نغمۂ داؤد نداند آزاد کنیدش کہ نہ مرغِ قفس است ایں

اس لئے میں نے راقمِ مضمون اور نواب مرحوم کے اخلاف سے اُس حصۂ بیاض کی نقل کی درخواست کی تاکہ اُس کی مدد و رہبری سے تحقیق و تلاش میں سہولت ہو اور ان چیزوں کی حالتِ موجود اور آثارِ باقیہ کا اندازہ کیا جا سکے۔ حافظ صاحب نے عنایت فرمائی شکر گزار ہوں۔ عبارت یہ ہے:-

"صوبہ داری الٰہ آباد از تغیری میر خاں مقرر شدہ بود۔ چوں در وقتے خاں مذکور سیلے بافراط آمدہ بود کہ تمام شہر را غارت کردہ برفت۔ وایشاں را بعتاب تمام طلب حضور فرمودند۔ از انکہ در وقت غارت ہر کہ زرے بموکلِ ناظم می داد اورا در قلعہ می گرفتند و غربا را بغارت می دادند۔ چوں صوبۂ الٰہ آباد متعلق نواب آمد۔ اول پشتۂ محکم برائے محافظت شہر و از آسیب سیلے دریا بستہ۔ و طرح آبادی نو کہ بدان سیل ضرر نہ رساند بنیاد نہادند۔ و بہ خلد آباد موسوم کردند۔ و از برادر زادہائے نواب ہر یک سراہائے برائے مسافرین ترتیب دادند۔ الحال سرائے احمد خاں مشہور است۔ وایشاں پسر سوم خان خاناں برادر خورد نواب ممدوح بودند"[2]......

اس بیاض فارسی کا عنوان ہے "مؤلفہ نواب حمید خاں نبیرۂ نواب ممدوح ۱۱۴۷ھ (۳۵-۱۷۳۴ء)۔"

[1] رسالۂ معارف، نمبر ۵ بابتہ ماہ نومبر ۱۹۳۷ء، جلد ۴۰ صفحہ ۳۴۳ - ۵۲ سے نقل ہے۔ انشاء و املا کی صحت کی ذمہ داری مجھ پر نہیں۔

مؤلف تاریخ داؤدیہ نے بھی یہی تفصیلات اسی بیاض سے لے کر اپنے یہاں درج کی ہیں۔[1]

(ترجمہ)۔ نواب داؤد خاں صوبہ داری الٰہ آباد پر بجائے میر خاں کے مقرر ہوئے تھے۔ خان مذکور کے وقت میں بڑا بھاری سیلاب آیا تھا جس سے تمام شہر غارت ہوگیا تھا۔ اس لئے اُن پر بڑا عتاب ہوا اور وہ حضور میں بلائے گئے۔ وجہ یہ تھی کہ سیلاب کے وقت جو کوئی ناظم کے موکل کو روپیہ دے دیتا تھا اُس کو قلعہ میں لے لیتے تھے۔ غریب غربا غارت و تباہ ہوتے۔ جب صوبۂ الٰہ آباد نواب کے متعلق ہوا تو پہلے مضبوط پشتہ حفاظتِ شہر اور سیلاب سے بچانے کے لئے باندھا اور ایک نئی آبادی کی بنیاد ڈالی کہ اُسے سیلاب کا نقصان نہ پہنچے۔ اس کا نام خلد آباد رکھا۔ نواب کے بھتیجوں میں سے ہر ایک نے مسافروں کے لئے سرائیں بنوائیں۔ احمد خاں کی سرا اب تک مشہور ہے۔ یہ تیسرے بیٹے خان خاناں کے تھے جو نواب ممدوح کے چھوٹے بھائی تھے۔[2]

بیاض کی تحریر واقعیت اور تسلسل واقعات و صحت موقع سے بظاہر خالی، اور سُنی سنائی بلکہ دیکھی ہوئی باتوں سے مجھے مختلف نظر آئی۔ جاننے والوں کو خلد آباد کے قریب دریا شہر کے اُس طرف ہونے پر ہنسی آتی تھی۔ فاضل مقالہ نویس کی تحریر اور اس عبارت میں اختلاف بھی نمایاں تھا۔ اس میں نہ گنگا کا نام لیا گیا ہے نہ شہر کے باہر بلند سطح پر اس خلد آباد کا موقع بتایا ہے۔ نہ نواب کی توجہ سے کسی سرا یا مسجد یا چاہ پختہ بنائے جانے کا ذکر ہے۔ بظاہر ان کے متعلق بحث کرنا فضول تھا تاہم مجھے گوارا نہ ہوا کہ پشتہ اور سرائے متذکرہ کے متعلق تفتیش و تلاش نہ کی جائے۔

یہ مسلم ہے کہ داؤد خاں عہد عالمگیر کا ایک کارگزار و دلاور پنج ہزاری امیر تھا۔ منشی الملک مستعد خان محمد ساقی[3] اور مسٹر بیل[4] کی تحریرات سے پایا جاتا ہے کہ وہ ۱۰۸۱ھ (۱۶۷۰ء) میں میر خاں معزول کی جگہ

---

[1] مطبوعہ ۱۳۱۳ھ، مؤلفہ مولوی سید محمد ناصر بلگرامی بحوالہ حافظ صاحب۔ [2] اسی آرٹیکل (صفحہ ۲۴۸) معارف سے پایا جاتا ہے کہ احمد خاں، محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۲ء) میں الٰہ آباد کی نائب صوبہ داری کے لئے نامزد ہوئے تھے۔ اسی کے بعد عظیم آباد کی صوبہ داری پر مامور ہو گئے تھے۔ یہ خلف حیدن خاں پسر تہیہ خاں ولد داؤد خاں تھے لیکن بیاض والی عبارت سے ختم پر احمد خاں کو خان خاناں کا بیٹا بتایا ہے اور خان خاناں کو داؤد خاں کا چھوٹا بھائی۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی دوسرے احمد خاں ہوں گے معلوم نہیں کہ ان کا تعلق بھی الٰہ آباد سے کچھ رہا تھا یا نہیں۔ رہا تھا تو کس حیثیت سے۔ [3] عالمگیر نامہ مطبوعہ آگرہ ۱۲۹۰ھ، صفحہ ۵۲۔ و مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۱ء، صفحہ ۱۱۰ مآثر عالمگیری۔ [4] اورینٹل بیاگرافیکل ڈکشنری، صفحہ ۸۰۔

برہان پور (خاندیس) سے تبدیل ہوکر گورنری الٰہ آباد پر آیا تھا۔ مگر اس کے قیام کی مدت اور یہاں سے منتقل ہوجانے کا سال کسی تاریخ میں میری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ اس زمانہ میں پانچ سات برس کے اندر اندر یکے بعد دیگرے کئی صوبہ دار الٰہ آباد بھیجے اور جلد جلد ہٹائے گئے تھے۔ قیاس چاہتا ہے کہ داؤد خاں کا قیام تھوڑے ہی دن رہا ہوگا۔

بقول رڈیارڈ کپلنگ میں بھی کہوں گا کہ الٰہ آباد کو وہ لوگ جان ہی نہیں سکتے جو صرف الٰہ آباد کو جانتے ہیں۔

یہ باہر کی خبر تھی۔ اس لئے امور مندرجۂ مقالہ متذکرہ کی نسبت میں نے احتیاط و کاوش سے تفتیش و تلاش کی تو ایک حد تک صحیح پایا۔ اس کتاب کے آئندہ صفحہ میں جب بعد پیمائش و مساحت دریا کے یا شہر کے باندھوں کا ذکر آئے گا تو گنگا کے متدعویہ پشتہ کے بارہ میں گزارش کیا جائے گا۔ پرانی تاریخوں سے تو اسی قدر پتہ چلتا ہے کہ اکبر نے دونوں دریاؤں کے ملنے کی جگہ پر ایک مضبوط قلعہ کی بنیاد ڈالی تھی اور نیا شہر آباد کرکے الٰہ باس نام رکھا اور ایک مستحکم بند تعمیر کرایا تھا جو طول میں کوس بھر عرض میں چالیس گز اور بلندی میں چار گز تھا۔ یہ عمارتیں اٹھائیسویں سالِ جلوس میں مکمل ہوئی تھیں۔ "منشی سبحان رائے کھتری اور میر غلام حسین خان طباطبائی الٰہ آباد کے بسائے جانے کے سلسلہ میں فرماتے ہیں" ...... بجائے اتصال ہر دو دریا قلعۂ محکم اساس نہاد و شہرے بتازگی احداث فرمودہ اللہ باس نام گذاشت ۔ و بندے مستحکم در طول یک کروہ[1] و عرض چہل گز و ارتفاع چار درعہ مقرر گشت ۔ و ایں عمارات در سال بست و ہشتم جلوس اکبر با تمام رسید[2]" ایسے ہی الفاظ مورخ بدایونی کے ہیں۔ "تاسیس شہر الٰہ آباد" و "تعمیر قلعہ" و "تکمیل عمارات" کی تفصیل کے لئے ابوالفضل علامی کا اکبر نامہ[3] ملاحظہ طلب ہے۔

اہل شہر کو دھوکے سے بچانے اور غلط فہمی سے بچنے کے لئے سرسری طور پر یہ بتا دینا لازم ہے کہ اگر ایک طرف خلد آباد کے نام سے کسی اور نئی بستی کا آباد کیا جانا تعجب خیز ہے تو دوسری طرف بڑی جہانگیری سرائے (خلد آباد) کی تعمیر کو داؤد خاں سے منسوب سمجھ لینا فاش بلکہ فاحش غلطی ہے۔ خلد آباد اور بڑی سرا دونوں داؤد خاں کے الٰہ آباد آنے سے اسّی نوّے برس بیشتر عرصہ گاہ عالم میں قدم رکھ چکے تھے۔ قطعۂ تاریخ جو پھاٹک پر ثبت ہے یا تھا (صفحات ۶۲ و ۲۷۰) شاہد ناطق ہے۔

بفرمان شہنشاہ جہانگیر شاہ — کہ زیبد ملکش از مہ تا بماہی

---

[1] کروہ۔ ایک کوس یا چار ہزار گز مسافت زمین سے مراد ہے۔ گز دو ذراع کا ہوتا ہے اور درعہ آٹھ گرہ کا۔ گز سولہ گرہ کا ہوا۔
[2] سیر المتاخرین، حصہ اول، صفحہ ۱۹۰ مطبوعہ نولکشور۔ [3] صفحہ ۱۲ ام جلد سوم مطبوعہ نولکشور ۱۸۶۷ء۔

بناشد ایں سرائے آسماں قدر کہ بادآباد خلد آبادِ شاہی [۱]

اس میں سرا اور خلد آباد دونوں کا نام اور دونوں کا ذکرِ تعمیر موجود ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی پرانی تحریرات بھی ملتی ہیں۔ الٰہ آباد کے مشہور پیرِ طریقت اور ہندوستان کے مقبول و عارف ولی اللہ حضرت شیخ محب اللہ رح نے اپنے ایک عزیز دوست و مخدوم کو لکھا تھا "چند روز است کہ فقیر را گونہ وحشت رو دادہ بود بنا برآں در شہر آرا باغ قرار گرفتہ است کہ اگر وحشت فقیر در ساعتے مرتفع شد چنانکہ می دانند کہ ہمہ را معذور باید داشت ..... لیکن چوں در اینجا آرام دید و تن آسانی یافتہ و بے جمیعتی ایں بے فکر در اذہانِ آشنایاں مقرر و مسلم است آں قرار را برقرار داشت و از تن آسانی فرار نمودہ در ہفتہ یک دو شب درخانہ نیز می باشد و احیاناً سیر باغِ خلد آباد نیز می کند۔ و یک دو شب در آنجا نیز می گزراند۔۔۔" [۲] شیخ نے ۹ رجب ۱۰۵۸ھ ہجری (۲۲ر جولائی ۱۶۴۸ء) کو رحلت فرمائی تھی [۳] اور یہ زمانہ داؤد خاں کے آنے سے بہت پہلے تھا۔

رہی سرا۔ میر شیر علی افسوس، مؤلف آرائش محفل کے زمانہ تک شہر الٰہ آباد میں بارہ سرائیں اور بارہ دائرے تھے [۴] صحیح یہ ہے کہ خلد آباد والی سرا سے اسی طرف قریب، مگر مخالف سمت پر شہر میں نواب نے بھی ایک سرا یا آبادی کی بنیاد ڈالی تھی۔ پتھر گلی کے ایک گوشہ میں ایک جگہ اب تک سرائے داؤد خاں یا سرائے داؤد کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ اس وقت وہاں کوئی عمارت سرا کی شکل نہیں رکھتی۔ بود و باش کے معمولی مکانات نئے پرانے بنے ہیں۔ بڑے بوڑھوں کی روایت بھی یہی ہے کہ نام کے سوا یہاں سرا دیکھی نہیں گئی۔ کبھی یہاں چند خام کوٹھریاں سرا کے طور پر تھیں جو مدت ہوئی ویران ہوگئیں۔ ان پر مکان بن گئے۔ دو پرانے پختہ کنوئیں بھی اسی رقبہ کے اندر تھے جو اب گھروں میں آگئے ہیں۔ ایک پرانی مسجد بھی باقی ہے۔ مسقف اور معمولی۔ نہ سنگی ہے نہ اس پر کوئی سنگ کتابہ۔ اس سے عالی ہمت نواب کی بلند حوصلگی کا اظہار نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ سال ڈیڑھ سال کی نظامتِ الٰہ آباد میں نواب اس سے زیادہ کیا یادگاریں چھوڑ سکتے تھے۔ سرائے داؤد خاں اب ایک مختصر سا محلہ ہے جیسا کہ شہر کے بعض اور محلے سرا کے لفظ سے مشہور اور کسی سابق گورنر کے نام سے منسوب پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سرائے میر خاں، سرائے [illegible] خاں، [illegible] وغیرہ۔ [۵]

---

[۱] گزیٹیر سابق، صفحہ ۱۶۶۔ [۲] مجموعۂ مکتوبات، قلمی ضخیم۔ موجودہ کتاب خانۂ خانقاہِ حضرتِ شیخ۔ [۳] مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۵۵۔ و۔ اورینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری، صفحہ ۱۹۲۔ [۴] صفحہ ۱۶۰۔ و حیاتِ جلیل، حصہ دوم، صفحہ ۱۲۴، نوٹ ۱۰۲۔
[۵] گزٹیر سابق ۱۸۸۴ء، صفحہ ۱۶۹۔

معذرت

وَالْعُذْرُ عِنْدَ کِرَامِ النَّاسِ مَقْبُوْلٌ - یہ دیسی لکھنے والا اپنی خدمت انجام دے کر قلم رکھ چکا۔ اپنی پریشاں خیالیوں اور کوتاہیوں کا اُس کو احساس ہے اور دل سے تاسف۔ اُس نے شہر اور خسرو باغ کے متعلق ہر چیز کے تفحص و تجسس اور تحقیق و تدقیق، بحث و تمحیص میں حتی الوسع پوری کوشش و جانکاہی سے کام لیا ہے۔ جہاں تک کامیاب ہوا قدر شناس دوستوں کا اقبال ہے اور نگاہِ کرم۔ جس حد تک ناکام رہا اُس کو اپنی بے بضاعتی اور حرمان نصیبی کے سوا کیا تعبیر کر سکتا ہے۔ راقم سطور ایک طرف اپنی مزمن بیماریوں اور جسمانی شکایات سے معذور تھا، دوسری طرف "جلد اول" کی محدود ضخامت و تنگدامانی سے مجبور۔ بایں ہم تاریخی اطلاعات کے لئے جہاں تک بن پڑا چھان بین کی۔ اوراقِ کتاب میں گنجائش نکالی اور جتنا لکھنا ضروری سمجھا حوالۂ قلم کر دیا۔ زندگی نے وفا کی اور ناتندرستی نے مہلت دی تو یہ کمی و خامی بھی کبھی نہ کبھی پوری ہو جائے گی اور جو کچھ اور معلوم ہو سکے گا، آئندہ جلد - وال "تذکرہ سلطان خسرو" میں گزارش کر دوں گا۔ آرزو ہے کہ وہ دونوں چیزیں اس نقشِ اول سے بہتر صورت میں، مکمل معلومات کے ساتھ پیش ہوں۔ مگر اس وقت اس کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔

ایران کے جنگی شاعر فردوسی طوسی نے اپنے کارنامہ کے پورا ہو جانے پر شیخی سے نہیں بلکہ افتخارِ جائز کے طور پر فرمایا تھا۔

چنیں نامدارانِ گردن کشاں　　　　که دادم یکایک ز ایشاں نشاں
ہمہ مردہ از روزگارِ دراز　　　　شد از گفتِ من نامِ شاں زندہ باز
چو عیسیٰ من ایں مردگان تمام　　　　سراسر ہمہ زندہ کردم بنام

فقیر عاجز نے بھی بہت سے گڑے مردے اکھاڑے ہیں اور "تاریخ الٰہ آباد" کے طفیل بہت سے نامور گمناموں کو اپنی جنبشِ قلم سے زندہ اور اُن کی یاد کو تازہ کر دیا ہے، وہ جن کو دنیا بھول چکی اور بھلا چکی تھی۔ ولا فخر[1] و لا مباہات۔ پھر بھی احتمال ہے کہ میں نے بہت سے شہری بھائیوں اور الٰہ آبادی عزیزوں کو

---

[1] اس پر نہ مجھے فخر ہے نہ ناز۔

مایوس وناامید کردیا ہوگا جو یہ توقع رکھتے ہوں گے کہ ان کے اسلاف کا تذکرہ ان بے حقیقت صفحوں پر کسی نہ کسی پیرایہ میں ضرور آجائے گا۔ اور وہ چھوٹی بڑی باتیں جو کچھ عرصہ سے کسی شخص خاص یا خاندان وجماعت کے ساتھ منسوب ومشہور ہوگئی ہیں، اس شکستہ قلم کی مدد سے تختۂ کاغذ پر ثبت ہوجائیں گی۔ ایسے حضرات سے میرا روئے سخن اور عذر یہ ہے کہ اپنے امکان بھر اس سیہ نامہ نے ذاتیات وشخصیات، ہنگامی مناقشات، مقامی اختلافات اور متنازع فیہ روایات ومعاملات کو قلمبند کرنے سے احتراز کیا ہے۔ رطب ویابس کو احتیاط سے چھانٹا اور لغویات سے اجتناب مدنظر رکھا ہے۔ صرف وہی باتیں سپرد قلم کی ہیں جن کی کسی تحریر یا کم سے کم تواتر روایات سے تصدیق ہوتی تھی۔

افسوس ہے کہ الہ آباد ایسا بڑا اور پرانا بیت العلم جس کی موجودہ شہرت اور تابناک عمر چار سو برس سے کم نہ ہوگی، جس کو اپنے اور اپنے کارناموں کے متعلق بہت سے دفتر مرتب ومدون رکھنا چاہئے تھے ایک تاریخ بھی قابل لحاظ پیش نہیں کرسکتا۔ کوئی مستقل کتاب دکھانا تو درکنار، وہ پرانی تحریرات یا اردو فارسی کے کاغذات حتی کہ قصوں اور افسانوں ہی میں کوئی نمودار عنصر نہیں رکھتا ہے۔ مجھے مان لینا چاہئے کہ یہ محض میری بدنصیبی وناقابلیت تھی کہ بہت سی تاریخوں کی ورق گردانی کے بعد بھی شہر اور اہل شہر کے بارہ میں کوئی کارآمد بلکہ بیکار بات بھی بعض سے اخذ نہ کرسکا۔ بے شبہ ان میں کہیں کہیں گورنروں کے نام ملتے ہیں، کہیں فوجداروں اور قلعہ کے محافظوں کے۔ بعض اوقات صوبہ داروں کی معزولی وتبدیلی کا بھی پتہ دیا جاتا ہے مگر بے ربط وغیر مسلسل۔ سلطنت کے حریف ودعوے داروں اور باپ بیٹوں کے مقابلہ کا ذکر بھی آجاتا ہے، جو الہ آباد میں اپنی ضرورتوں یا امراء کی سازشوں اور بغاوتوں کے سلسلہ میں وارد ہوئے تھے۔ الہ آباد کبھی جونپور اور اودھ میں شامل تھا۔ ڈھونڈنے والے کو ادھر بھی جانا اور مایوس لوٹنا پڑتا ہے۔ شہر کے حالات، اس کی عمرانیت، اس کی ترقی وعروج، رونق وتعمیرات کے ذکر سے ان سب کے اوراق یکسر کورے ملتے ہیں۔ مکاتب ومدارس کی بنا اور علوم وفنون کی اشاعت کے بارہ میں قطعاً سکوت وخاموشی ہے۔ نہ یہاں مجالس درس وموعظت نظر آتی ہیں نہ طالبان ہنر وادب کا ہجوم ہے۔ نہ صاحبان فضل وکمال کا اجتماع پایا جاتا ہے نہ ارباب ارادت وعرفان کا ازدحام۔ نہ استفادہ کی کوششیں ہیں نہ افادہ وافاضہ کی تدبیریں۔ یہ صورت ہماری فارسی تاریخوں کی ہے۔ اسی سبب سے کرنیل نیول نے یہ رائے زنی فرمائی تھی کہ مسلمانوں کی عملداری کے زمانہ میں کڑے یا الہ آباد کی سرزمین کسی مشہور مصنف کو پیدا نہ کرسکی[1]۔ میں بھی کہوں گا کہ یہ خیال صحیح ہے۔ بعض مشائخ وفقرا کو

---

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر سابق صفحہ ۱۷۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید صفحہ ۱۸۱۔

چھوڑ کر کسی نامور انشا پرداز، ممتاز فلسفی یا مورخ یا کسی اور شعبۂ علم و فن کے متبحر فرد کا نام الٰہ آبادی حضرات کی افراد میں نہیں ملتا ہے۔ بعض اہل الرائے یا اہل قلم کے نام جو بعد کو ملتے ہیں دولت برطانیہ کی بدولت ہیں۔

ہاں پریاگ بھی، جو ہندوستانی تقدیس و پاکیزگی اور ہندوؤں کی ہزارہا برس کی عظیم الشان تہذیب و تمدن کا سرچشمہ ہے (جیسے بتایا جاتا ہے کہ) ایک پریاگ مہاتم Prayag Mahatmya کے سوا کوئی ملکی، ادبی سرمایہ یا کوئی پرانی سند اپنی عظمت و جلالت کی نہیں رکھتا۔ البتہ بجائے خود یہ ایک بہت بڑی چیز اور بہت قدیم تالیف ہے۔ اور جو Matsya Purana "متسیہ پران" کے جزو جلیل ہونے کا خود دعویدار ہے[۱]۔

رہا یورپین سیاحوں سے جو کچھ میں نے لیا ہے، شاید اس پر خود انھیں حضرات کو اطمینان نہ ہوگا مجھ ایسے مشکوک مزاج کو کہاں تک اعتماد ہو سکتا تھا۔ تاہم ضرورت تھی اور میرا فرض، کہ میں نے ان سے فائدہ اٹھایا اور بقول شیخ شیراز "تمتع ز ہر گوشۂ یافتم" پر عمل کیا ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ ادب و انشا کے شائق اس دفتر پریشان میں اپنے ذوقِ لطیف کی چیزیں کم پائیں گے۔ اس کا بڑا سبب خود میری بے کمالی و بے استعدادی ہے۔ دوسرے تاریخ کے قلمرو سے ادب و انشا کا جولان گاہ "قدرے فاصلہ دارد" نہیں، بلکہ بون بعید[۲] رکھتا ہے۔ جو ایک مسلم علمی مسئلہ اور متعارف حقیقت ہے۔ تیسرے، میرے مایۂ نازش فاضل شاگرد کا ارشاد جو عملاً میرا استاد و آموزگار تھا۔ ڈیو ہرسٹ مرحوم نے میری حقیر تالیف "حیاتِ جلیل" پر رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالہ میں تبصرہ فرماتے ہوئے جہاں کتاب اور مؤلف کتاب: "اس کے خاندان حتیٰ کہ وطن کی بے حد و غایت تحسین و ستائش فرمائی تھی، وہاں میرے طرزِ انشا پر مجھے ان لفظوں میں متنبہ کیا تھا۔ صرف وہی حضرات جو اردو کی کامل و مکمل معلومات کے علاوہ عربی و فارسی دونوں پر قدرت رکھتے ہوں اس کتاب کو کسی آسانی و روانی کے ساتھ پڑھ سکیں گے۔ قلق ہے کہ ایسے اشخاص خود ہندوستان ہی میں کم ہوتے جاتے ہیں۔" آخر میں "وہ تھوڑے سے اہل علم جو سمجھ اور ہم آہنگی کے ساتھ اس کو پڑھنے کی قابلیت رکھتے ہوں اس سے مسرت و تعلیم دونوں حاصل کریں گے"[۳]۔

اب کتاب کا اختتام ہے اور لکھنے والے کی انجام پر نظر۔

اجل سُلا دے گی سب کو آخر کسی بہانے تھپک تھپک کر
نہ ہم رہیں گے نہ تم رہو گے نہ آہ یہ داستاں رہے گی

---

[۱] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، صفحہ ۱۰۱۔ [۲] دوری دراز۔ [۳] لندن، اکتوبر ۱۹۲۹ء۔

فہرست دوم

انڈیکس یا حرف وار

الف

پ

ٹ



ج

چ

ح

د

(س)

ش

(ش)

ع

ک

گ

ی

بقیۂ بقیہ

عبد اللطیف کاتب (الہ آبادی)

فہرست سوم

ضروری حاشیئے اور تاریخی اطلاعیں

کتاب ملنے کا پتہ :-

(۱) کتابستان۔ الہ آباد۔

(۲) سید ابن احمدؒ رضوی۔ رئیس قصبہ صمدن، ضلع فرخ آباد۔

(۳) سید اولاد احمدؒ صمدنی۔ دائرہ شاہ رفیع الزمانؒ، یحییٰ پور، الہ آباد۔

(۴) الہ آباد کے کتب فروش۔